بچوں کے احکام ومسائل

ولادت سے بلوغ تک

(قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں)

ادارۂ احیائے علم ودعوت۔ لکھنؤ

بچوں کے احکام ومسائل

ولادت سے بلوغ تک

(قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں)

از

فیصل احمد ندوی بھٹکلی

ادارۂ احیاے علم ودعوت۔ لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات (۱۸)

دوسرا ایڈیشن

جمادی الاخری ۱۴۳۲ھ - مئی ۲۰۱۱ء

نام کتاب: بچوں کے احکام ومسائل۔ ولادت سے بلوغ تک

مصنف: فیصل احمد ندوی بھٹکلی

صفحات: ۴۳۲

تعداد اشاعت: ۱۱۰۰

قیمت:

ناشر

ادارۂ احیاء علم ودعوت۔ لکھنؤ

تقسیم کار

مکتبۃ الشباب العلمیہ

ندوہ روڈ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ-۲۰

Mob.No: 09198621671,09696437283

فہرست مضامین

انتساب

میرے مشفق والدین کے نام جنھوں نے مجھے دینی تعلیم کی راہ پر لگایا اور میری تربیت پر پوری توجہ صرف کی۔

والدہ جو بالکل بچپن ہی میں جب میں نے نماز پڑھنا شروع ہی کیا تھا، اذان کے ساتھ ہی یہ کہہ کر مسجد بھیجتی کہ ابھی تک نہیں گئے، نماز تو ختم ہو چکی، اور مغرب کی نماز پڑھتے ہی درود شریف اور دعائیں پڑھانے کے لیے ہم بچوں کو لے کر بیٹھ جاتی۔

اور والد جن کے رعب سے نماز کی جماعت ترک کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوتی، اگر کبھی جماعت چھوٹ جاتی اور ان کی نظر پڑ جاتی تو بس شامت ہی آجاتی۔ پھر حفظ کے زمانے میں مسلسل اپنے ساتھ صبح و شام لے کر بیٹھنا اور بری صحبت سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنا اور میری ہر حرکت پر نظر رکھنا۔

اللہ صحت و عافیت کے ساتھ ان دونوں کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

رب ارحمهما كما ربياني صغيراً

مقدمہ

از حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، و علىٰ آله و صحبه و علىٰ من تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد:

عزیز گرامی قدر مولوی فیصل احمد بھٹکلی ندوی سلمه الله و وفقه لما يحبه و يرضاه جو اپنے وطن میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں عالمیت کی تعلیم حاصل کر کے دار العلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل کر کے اپنی علمی لیاقت وصلاحیت کی بنیاد پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے کام کے لیے منتخب کیے گیے، اپنی علمی زندگی میں علمی ترقی اور علمی افادیت کی طرف توجہ دینے میں برابر مشغول ہیں، اور اس میں خاطر خواہ ترقی کر رہے ہیں، بحث وتحقیق کے کام میں بھی اچھا حصہ لے رہے ہیں، اور اس طریقہ سے تحقیق وتصنیف کی لائن میں ان کی کئی چیزیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں، جن کو دیکھ کر ان کے علمی ذوق اور تحقیقی انداز کا اچھا اظہار ہوتا ہے، وہ خاموشی کے ساتھ علمی مشغولیت کو اختیار کیے ہوئے ہیں، اور یہ خاموشی ان کے علمی عمل کے منظرِ اشاعت پر آنے سے ٹوٹتی ہے، ان کی تحقیق وتصنیف کو دیکھ کر بڑی اچھی رائے قائم ہوتی ہے، اور اس کم عمری میں ان کا جو اچھا کام سامنے آیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ یہ اور بڑے کاموں کو انجام دینے کے راستے میں آگے بڑھیں گے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر ان کی کتاب ہے، جس میں انھوں نے بچوں کی پیدائش سے لے کر ان کے بلوغ اور پختہ عمری کی منزل تک پہنچنے کے مراحل میں جو اسلامی رہنمائی قرآن وحدیث کی روشنی میں ملتی ہے اس کو واضح اور مستند علمی انداز میں پیش کیا ہے، یہ موضوع ہے بھی بہت اہم، اس لیے کہ بچہ ظاہری طور پر دیکھنے میں تو بچہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں تو وہ انسان کامل ہے، جو اس کے جیسے کسی بچہ کے اندر سے بتدریج باہر آتا ہے، اور ہر انسان پیدائش کے بعد سے جن حالات اور جن رہنمائیوں سے گزرتا ہے انھی کے مطابق وہ ڈھلتا جاتا ہے، اور عمر کے سوجھ بوجھ اور ذمہ دارانہ مرحلے تک پہنچنے تک ان ہی حالات اور سرپرستیوں سے اس کی شخصیت بنتی ہے، وہ اگر اچھی طبیعت کا انسان بنتا ہے تو وہی بچپنے کے حالات اور رہنمائی کے اثر سے بنتا ہے، اور بری خصلت کا انسان بنتا ہے تو اس میں بھی اسی بچپنے کے حالات اور رہنمائیوں کا دخل ہوتا ہے، وہ بلند ہمت اور بڑا کارپرداز انسان بنتا ہے تو وہ بھی اپنے بچپنے کے نشوونما کے زمانے میں گزرے حالات وعوامل کے اثر سے اور اپنے بڑوں یا کسی اہم بڑے کی رہنمائی کے اثر سے بنتا ہے، وہ اگر کم ہمت لاچار انسان ہوتا ہے تو اسی زمانے میں ہوئی غلط رہنمائی کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے ہر انسان کے لیے بچپن اور ابتدائی عمر کا مرحلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی فکر اگر ماں باپ اور اس کے اولین سرپرست اور استاذ کرتے ہیں تو اس کا اچھا نتیجہ دیکھتے ہیں، اور اگر ان سے اس کام میں غفلت ہوتی ہے تو نتیجہ خراب سامنے آتا ہے۔ اس کو حدیث شریف میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا گیا ہے ﴿كل مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه﴾ (ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔

انسان کی تخلیق وتشکیل کی بنیاد اس کے رب العزت اللہ تعالیٰ نے بہت اچھے معیار کی رکھی ہے، اس بنیاد پر صحیح طور پر انسانی عمارت اٹھائی جائے تو بڑی اچھی انسانی عمارت بنتی ہے، لیکن بنیاد کتنی ہی اچھی ہو اس پر دیوار کج اٹھائی جائے تو وہ دیوار کمزور ہوگی، یا ٹیڑھی اور خراب ہوگی۔ موجودہ عہد میں جو تمدن مغرب کی طرف سے آیا ہے اور ایام جاہلیت میں تعمیر انسانی کا جو نظام رائج رہا ہے، اس سے انسان انسانی خصوصیات کے بلند معیار سے بہت دور ہو جاتا ہے، اس میں انسانی فرد کی جسمانی ضرورت اور طاقت کا لحاظ تو بہت کیا گیا ہے، لیکن انسان کی بلند اخلاقی خصوصیات کو لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے کہ جن کا تعلق انسان کے اندر کے احساس اور اعلیٰ انسانی خصلت سے ہے، اسی لیے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ موجودہ عہد میں انسان کو اس کے طرز عمل کے لحاظ سے درست رکھنے کے لیے طاقت اور حکومت کا سہارا لیا جاتا ہے تاکہ اس کے بگاڑ سے پوری سوسائٹی میں بھونچال اور زلزلہ نہ آجائے، حالاں کہ اگر بچپنے سے انسانی فرد کو اس کے خالق اور رب کے بتائے ہوئے طریقے پر تربیت دی جائے تو اس حکومتی طاقت وزبردستی کو استعمال کرنے کی بہت کم ضرورت پیش آئے گی۔ ہم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) سے اس کی اچھی اور اعلیٰ رہنمائی ملتی ہے، اس رہنمائی سے کام لیا جائے تو بچہ اپنے بچپنے میں بھی اچھا بچہ ثابت ہوگا، اور بڑا ہو کر اچھا انسان بنے گا، اس کی بڑی ضرورت ہے۔

یہ کتاب دراصل کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) کی اسی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کی تلقین پر مشتمل ہے، اس میں بچے کے پیدا ہونے سے اس کے بڑے ہونے تک جو مراحل پیش آتے ہیں، اس میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں رہنمائی کی گئی ہے۔ مصنف نے اسلام کے مختلف مسالک فکر کے معاملہ میں غیر جانب داری کا لحاظ کرتے ہوئے اسلامی

تعلیمات کی ہدایات بیان کی ہیں، اور جامع اور تفصیلی ضابطۂ عمل پیش کر دیا ہے، جس میں بچے کے مختلف مراحل اور احوال کے حوالے سے ہدایات واضح کی ہیں، یہ رسالہ اس حیثیت سے ہر خاندان کے سرپرستوں کے پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کا ایسا ذریعہ بن گیا ہے جس کی مدد سے بچوں کے ساتھ مفید تعمیری اور تربیتی رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے، یہ ایک اچھی پیشکش ہے جس کی اس دور میں بڑی افادیت ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مصنف کو جزائے خیر دے، آمین۔

۱۷/۳/۱۴۳۰ھ — محمد رابع حسنی ندوی

۱۵/۳/۲۰۰۹ء — دائرہ حضرت شاہ علم اللہ تکیہ کلاں، رائے بریلی

تقریظ

از: مولانا مفتی عتیق احمد بستوی مدظلہ
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دورِ حاضر میں انسانی سماج کے تین کمزور طبقات (بچوں، عورتوں اور بوڑھوں) کے حقوق کی حفاظت کا نعرہ بہت زور وشور کے ساتھ لگایا گیا، مغرب کے اہلِ فکر وسیاست اور اربابِ قانون کا دعویٰ ہے کہ ان تینوں کمزور طبقات کے حقوق کی حفاظت اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے مغربی فکر و فلسفے اور مغرب کے قانون، سیاسی اور سماجی اداروں نے جو اقدامات کیے ہیں ان کی مثال ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اہل مغرب کے اس طرح کے دعوے اسلامی تعلیمات، اسلامی قانون اور اسلامی تاریخ سے ناواقفیت یا دانستہ تجاہل کی بنا پر ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انسانی سماج کے کمزور طبقات خواہ بچے، عورتیں اور بوڑھے ہوں یا مریض، معذور اور مظلوم افراد ہوں، ان کے حقوق و مفادات کا جتنا معیاری تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کا جو مثالی نظام اسلامی تعلیمات اور اسلامی قانون میں ہے اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قانون میں موجود نہیں ہے، مغربی فلسفہ و قانون نے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے حقوق کی حفاظت کے نام پر ان کمزور طبقات کا جو بدترین استحصال کیا ہے اس کی داستان بڑی دردانگیز اور شرمناک ہے، اس کا جائزہ لینے کے لیے مفصل ریسرچ وتحقیق کی ضرورت ہے۔

ہم مسلمانوں کی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ہم نے آج کے اسلوب و انداز میں اسلام کی ان تعلیمات وقوانین کو مرتب اور اجاگر نہیں کیا جو انسانی سماج کے کمزور طبقات سے

متعلق ہیں اور اسلام دشمن اہلِ قلم یہ پروپیگنڈہ کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے کہ اسلام عورتوں اور بچوں کے حقوق کو پامال کرتا ہے، ان کے ساتھ عدل واحسان کا رویہ نہیں اپناتا۔

اللہ تعالی کا فضل وکرم ہے کہ ماضی قریب میں مسلمان مصنفین اور اہلِ قلم نے اسلام کی ان تعلیمات کو جو انسانی سماج کے کمزور طبقات (بچوں، عورتوں، بوڑھوں، مریضوں وغیرہ) کے حقوق ومفادات کے تحفظ سے تعلق رکھتی ہیں، عصرِ حاضر کے اسلوب میں پیش کرنے کی بعض کامیاب کوششیں کی ہیں۔

جناب مولانا فیصل احمد ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی زیرِ نظر کتاب ''بچوں کے احکام ومسائل- ولادت سے بلوغ تک'' اسی زریں سلسلے کی ایک کڑی ہے، انھوں نے بڑی وسعت اور محنت کے ساتھ بچوں کے احکام ومسائل کو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں بڑی خوبصورتی اور تصنیفی سلیقہ مندی کے ساتھ جمع کر دیا ہے، کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں حوالوں کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، مصنف نے کوشش کی ہے بچوں سے متعلق ایسے تمام احکام ومسائل کا احاطہ کرلیا جائے جن کی عملی زندگی میں عموماً ضرورت پیش آتی ہے۔ بچوں سے متعلق نئے مسائل پر خوب لکھا ہے اور جدید ترین فقہی کتابوں سے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔

میں پوری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کر سکا، لیکن اکثر مباحث پر نظر ڈالی تو کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ ہوا، اور مصنف کی علمی کاوشوں پر دل سے دعا نکلی، مصنف کم عمر ضرور ہیں، لیکن تصنیف وتالیف کے میدان میں کہنہ مشق ہو چکے ہیں، ان کی متعدد کتابیں اہل علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ سیرتِ نبوی پر رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ سے

ایک گراں قدر ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں، یہ کتاب اردو لٹریچر میں ایک وقیع اضافہ ہے اور اپنے موضوع پر اردو میں پہلی جامع کتاب ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائے اور مقبولیت سے نوازے اور مصنف کے راہوارِ قلم کو رواں دواں رکھے۔

۱۴۳۰/۳/۲۱ھ	عتیق احمد بستوی
۲۰۰۹/۳/۱۹ء	خادم تدریس دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيدنا محمد وآله وصحبه أجمعين ،ومن تبعهم بإحسان ودعابدعوتهم إلى يوم الدين۔ أما بعد

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، اس میں بچپن سے بڑھاپے تک اور پیدائش سے وفات تک، بلکہ پیدائش سے پہلے سے لے کر موت کے بعد تک کی تمام ہدایات پوری تفصیل اور توضیح کے ساتھ موجود ہیں، جنین (پیٹ کا بچہ) کے حقوق و احکام کیا ہیں؟ ولادت کے لیے آپریشن کا کیا حکم ہے؟ بچہ پیدا ہونے پر کیا کرنا چاہیے؟ پھر آگے بڑھتے ہوئے کیا کیا ذمے داریاں والدین پر عائد ہوتی ہیں؟ ساتویں دن بال منڈوانا، نام رکھنا، عقیقہ کرنا، ہر ایک کے مستقل احکام و ہدایات ہیں۔ ایک مسلمان کو جن کی پاسداری کرنی چاہیے، عقیقہ کیوں کیا جاتا ہے؟ ناموں کے کیا اثرات پڑتے ہیں؟ کیا کوئی سا بھی نام رکھا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں شریعت ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے؟ ختنے کی مصلحتیں کیا ہیں؟ شرعی مسائل کا اس سے کیا تعلق ہے؟ رضاعت یعنی دودھ پلانے کے کیا احکام ہیں؟ اور اس سے کیا کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں؟ نسب کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے ثبوت کی کیا صورتیں ہیں؟ اور کیا کیا مسائل اس سے متعلق ہوتے ہیں؟ ٹسٹ ٹیوب بے بی کے کیا احکام ہیں؟ ولد الزنا (حرامی اولاد) کے کیا مسائل ہیں؟ اور منھ بولی اولاد کے بارے میں شریعت نے کیا ہدایات دی ہیں؟ بچوں کے زیب و زینت اور ان کے لباس و پوشاک کے بارے میں شریعت کی کیا تعلیم ہے؟ بچوں کے لیے سونے چاندی اور ریشم وغیرہ کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ کیا بچے کی طہارت کے بھی کچھ احکام ہیں؟ پھر جب وہ بولنے لگے تو اس کی زبان سے

کیا الفاظ ادا کروانے چاہیے؟ پھر اسے کن کن باتوں کی تعلیم دینا ضروری ہے؟ بچے کو مسجد میں لے جانا کیسا ہے؟ نماز کا کب حکم دینا چاہیے؟ نماز نہ پڑھنے پر کب سختی کرنی چاہیے؟ کیا وہ امام بھی بن سکتا ہے؟، اسی طرح اس کے روزے، زکاۃ، اور حج کے کیا مسائل ہیں؟ دم کرنے، جھاڑنے اور تعویذ کے احکام کیا ہیں؟ بچوں کو جن وشیطان کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تعلیمات دی ہیں؟ کیا کھیل کود کے بھی کچھ احکام ہوتے ہیں؟ کیا اپنے بچے کو ہم جتنا چاہے مار سکتے ہیں؟ یا اس کو مارنے اور سزا دینے کے کچھ اصول وضوابط اور احکام ہیں؟ بچوں کی حضانت اور پرورش کے مسائل کیا ہیں؟ ان کے نان نفقے کے بارے میں کیا ہدایات ہیں؟ بچوں کے مال کے کیا احکام ہیں؟ ان کے نکاح وطلاق کے مسائل کیا ہیں؟ اگر بچہ مرجائے تو اس کی میت اور وراثت کے کیا احکام ہیں؟ پھر بلوغ کے بعد والدین پر کیا ذمے داری عائد ہوتی ہے؟ یہ اور اس طرح بچوں سے متعلق تمام مسائل واحکام کو اس کتاب میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آج سے تقریباً چار سال پہلے جب میرے گھر پہلی ولادت ہوئی تو میں لکھنؤ میں تھا، بچے سے دور اور بہت دور۔ فکر ہوئی کہ بچے سے متعلق ہر کام سنت کے مطابق ہونا چاہیے۔ یوں تو الحمدللہ گھر کے لوگ شرعی احکام ومسائل سے واقف ہیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ نہ جاننے کی وجہ سے کچھ سنتیں رہ جائیں، میں گھر میں ہوتا تو شاید سب کام بہتر طریقے سے انجام پاتے، اب اس کی تلافی کسی ایسی کتاب سے ہوسکتی ہے جس میں نومولود سے متعلق تمام احکام ومسائل کو بیان کیا گیا ہو، اب میں نے کتاب کی تلاش شروع کی تو کامیابی حاصل نہ ہوئی، ہاں البتہ علامہ ابن قیمؒ کی تحفة المودود بأحكام المولود ہاتھ لگی، اس میں ہمارے ابتدائی تصور کے مطابق اکثر باتیں موجود تھیں، لیکن کتاب عربی میں ہونے کی وجہ

سے گھر نہیں بھیجی جاسکتی تھی، نیز اس میں بہت سے علمی مباحث تھے جن کی عوام کو ضرورت نہیں اور موجودہ زمانے کے لحاظ سے بہت سی باتوں کے اضافے کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ نومولود کے مسائل اور احکام پر حدیثِ صحیح کی روشنی میں عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اردو میں ایک مختصر کتاب لکھنے کی ضرورت ہے، اور میں نے دل میں ٹھان لی کہ انشاء اللہ پہلی فرصت میں اس کے لیے وقت نکال کر یہ کام کر لوں گا، لیکن دوسرے کاموں کی وجہ سے یہ کام ٹلتا گیا، مگر فراموش نہ ہوا، بلکہ اس کا عزمِ قوی باقی ہی رہا۔ اللہ کی شان نرالی ہے، اس کے معاملات عجیب ہوتے ہیں، چند ماہ قبل میں نے دوسرا ایک خاصا لمبا علمی کام شروع کر لیا تھا کہ اچانک اس کتاب کی تحریک ہوئی اور اس کا تقاضا غالب آیا، بس اب کیا تھا اللہ کا فضلِ خاص شامل حال رہا، اور تقریباً چالیس دنوں میں اسی کے فضل وکرم سے دوسو صفحات میں کتاب تیار ہو گئی، یہ رجب وشعبان ۱۴۲۹ھ (جولائی واگست ۲۰۰۸ء) کی بات ہے۔ خیال تھا کہ کتاب رمضان کی چھٹیوں سے پہلے سامنے آجائے تو لوگوں کے لیے رمضان کا اچھا تحفہ ثابت ہوگی۔ کتاب پریس جانے ہی والی تھی، مگر اللہ کو منظور نہیں تھا، میرے دل میں آیا کہ جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، جلد بازی میں ٹھوکر لگتی ہے، شاید کچھ اور بہتری مقدر ہو، پھر رمضان اور اس کی مشغولیتیں، شوال اور اس کی مصروفیتیں، پھر ذوالقعدہ کے ابتدائی دنوں میں حج کا اچانک پروگرام، اور واپسی پر ضروری کاموں سے فارغ ہونا۔ بہر حال، میں اس کتاب پر پھر نظر نہیں ڈال سکا، پچھلے دنوں میں نے اس کو پھر ہاتھ میں لیا اور نظر ثانی کی، نظر ثانی میں وقیع اضافے ہوئے، اور کتاب دوگنی بلکہ اس سے بھی تجاوز کر گئی، اس میں بھی تقریباً اتنی ہی مدت صرف ہوئی جو پہلے مرحلے میں صرف ہوئی تھی۔ میں نے اس کتاب میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا ہے:

(۱) تمام مسائل واحکام براہ راست حدیث سے اخذ کیے جائیں ہیں، اور یہ ساری حدیثیں صحیح یا حسن درجے کی ہیں، احکام کے سلسلے میں میں نے کسی ضعیف حدیث سے استدلال نہیں کیا، مگر اختصار کے پیشِ نظر میں نے ان حدیثوں پر کلام نہیں کیا، البتہ کہیں اگر کسی وجہ سے ضعیف حدیث ذکر کی ہے تو اس کی طرف اشارہ کردیا ہے۔

(۲) کسی خاص فقہی مذہب کو سامنے رکھ کر کتاب مرتب نہیں کی گئی، بلکہ تمام ائمہ مجتہدین اور فقہاء کی آرا کو بیان کیا گیا ہے، اور تمام مسالک کو ہر مذہب کے معتبر فقہی مآخذ سے نقل کیا گیا ہے، اور کہیں کہیں حدیث کی روشنی میں کسی رائے کو ترجیح بھی دی گئی ہے۔

(۳) عصر حاضر کے تقاضوں کے پیشِ نظر احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح انٹرنیٹ کے ذریعے جدید سے جدید تحقیقات سے استفادہ کرکے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۵) عام ذہن کے پیشِ نظر علمی بحثوں کو متنِ کتاب میں جگہ نہیں دی گئی، تاکہ ان کے ذہنوں پر بار نہ ہو، ضرورت محسوس ہونے پر کہیں حاشیے میں ان کو بیان کیا گیا ہے۔

(۶) زبان قصداً بہت آسان اور عام فہم اختیار کی گئی ہے، تاکہ معمولی پڑھا لکھا بھی اس کو سمجھ کر اس سے استفادہ کرسکے، اگر فقہی اصطلاح کے پیشِ نظر مشکل الفاظ آئے ہیں تو ان کی وضاحت کردی گئی ہے۔

(۷) اختصار کے پیشِ نظر حدیث کے الفاظ خواہش کے باوجود ذکر نہیں کیے اور نہ فقہاء کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں، ورنہ کتاب کی ضخامت دوگنی ہوجاتی اور بجائے ایک جلد کے دو جلدوں میں تقسیم کرنا پڑتا۔

میں نے کتاب کو مختصر رکھنے کی بہت کوشش کی، شروع میں خیال تھا کہ صرف سو صفحات میں یہ کتاب لکھی جائے، تا کہ ہر شخص تک پہنچ سکے اور اس کو زیرِ بار ہونا نہ پڑے، مگر ناموں کے بیان میں کچھ مفید بحثیں آئیں، اور صفحات بڑھ گئے، تو اندازہ ہوا کہ کتاب سو صفحات سے زائد ہو جائے گی، پھر ڈیڑھ سو صفحات، اور بڑھتے بڑھتے دو سو صفحات کا ہدف سامنے رکھا، مگر بچوں سے متعلق نئے نئے اور ضروری مسائل سامنے آتے گئے کہ ان سے صرفِ نظر کتاب کی اہمیت کو کم کرنا تھا، اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ان مسائل کو شاملِ کتاب کیا جائے تا کہ کتاب ایک حد تک بچوں سے متعلق تمام مسائل و احکام کا احاطہ کر سکے، اس طرح انشاء اللہ اس کی افادیت بھی بڑھ جائے گی۔

میرا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کتاب اتنی ضخیم ہو جائے گی، میں تو بہت سے بہت سو صفحات میں پیدائش کے بعد بچوں سے متعلق پیش آنے والے مسائل لکھنے بیٹھا تھا، پھر مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں کہاں پہنچتا گیا۔ اب چار سو سے زائد صفحات میں یہ کتاب مکمل ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کتاب انشاء اللہ ہر مسلمان کے لیے یکساں طور پر مفید ہو گی، شادی کے موقع پر پیش کرنے کے لیے اس سے بہتر تحفہ مشکل سے مل پائے گا۔ یہ کتاب انشاء اللہ سنت سے قریب کرے گی۔ اللہ اس کو مفید سے مفید تر بنائے اور ہم کو سنت پر عمل کی برکت سے مالا مال فرمائے، ہر خیر کی توفیق دے اور ہر شر سے محفوظ رکھے۔ آمین

فیصل احمد بھٹکلی ندوی — ۶/۲/۱۴۳۰ھ

خادم تدریس دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ — ۲/۲/۲۰۰۹ء

کلماتِ تشکر

اول وآخر اسی اللہ کا شکر ہے محض جس کی توفیق سے یہ کتاب مکمل ہوئی، کس طرح اس کا داعیہ پیدا ہوا؟ کس طرح اچانک اس کی شروعات ہوئی اور پھر کس طرح اس کی نظر ثانی سے فراغت ہوئی۔ اس کو ہم اللہ کا فضلِ خاص ہی سمجھتے ہیں۔

پھر یہ میری سعادت کی بات ہے کہ مخدوم ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء اور صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے کتاب پر اپنی گوناگوں ملی مصروفیتوں کے باوجود قیمتی مقدمہ لکھ کر میری ہمت افزائی فرمائی، اور کتاب کی شان بڑھائی، اس پر میں شکریے کے الفاظ نہیں پاتا۔ اور مولانا عتیق احمد بستوی قاسمی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا جن کی فقہ کے میدان میں خاص پہچان ہے نہایت شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت فارغ کر کے کتاب پر نظر ڈالی اور تقریظ لکھ کر کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ کیا۔

اور نوجوانانِ سن شاین (sun shine) اسپورٹس سینٹر بھٹکل مقیمینِ دبی کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے بر وقت کتاب کی اشاعت میں خاصا مالی تعاون کر کے اپنی دینی وملّی محبت کا ثبوت فراہم کیا، اللہ ان کی مدد فرمائے، اور مزید دین کی خدمت کی انھیں توفیق دے۔

اور میں اپنے عزیز برادران کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں جن کا قدم قدم پر مجھے تعاون حاصل رہا، کتاب کے ابتدائی مراحل میں عزیزم مولوی محمد زیاد عجائب ندوی نے جس تندہی سے کمپوزنگ کا کام کیا، اور شروع سے لے کر اخیر تک عزیزی مولوی عبد العظیم معلم ندوی نے اس سلسلے میں میرا جو تعاون کیا، اور عزیزی مولوی محمد مستقیم محتشم ندوی نے قدم قدم پر میرا جو ساتھ دیا اور میرے لیے وہ دونوں جس طرح فارغ ہوئے، اس کا زبانی شکریہ ادا نہیں کر سکتا، اسی طرح اخیر میں بعض حوالوں کی مراجعت میں برادر عزیز مولوی سعید الرحمٰن پورنوی ندوی اور پھر برادر عزیز مولوی سید غفران (باندوی) ندوی نے جو میرا ہاتھ بٹایا اس پر وہ شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ ان سب کی مدد فرمائے اور ان سے بیش از بیش علمی خدمت لے۔

بابِ اول

ولادت سے پہلے کے احکام

فصلِ اول

اولاد کی فضیلت اور کثرتِ اولاد کی ترغیب

نکاح دوسرے بہت سے قوانین میں محض شہوت رانی کی ایک باعزت شکل ہے، لیکن اسلام نے اس سے بہت اوپر اٹھ کر اس کو اہمیت دی ہے اور ایک عظیم عبادت قرار دیا ہے، اسلام نے جن مقاصد کے تحت شادی کی ترغیب دی ہے ان میں ایک اعلی مقصد صالح اولاد کی طلب ہے، حصولِ اولاد کے جذبے کے بغیر شادی ایک ناقص شادی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کثرت سے اولاد پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے، بلکہ فرمان الٰہی ''فالآن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم (۱) کا بہت سے ائمۂ تفسیر مجاہد، عکرمہ اور حسن بصری وغیرہ نے یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اس سے مراد اولاد کی طلب ہے، اور خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا ایک مفہوم یہی نقل کیا گیا ہے (۲)۔

حدیثیں اس سلسلے میں کثرت سے وارد ہوئی ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نکاح کا حکم دیتے تھے، اور شادی کے بغیر زندگی گزارنے کو سختی سے روکتے تھے، اور فرماتے تھے: محبت والفت والی اور بچے پیدا کرنے والی عورت سے شادی کرو، میں تمھارے ذریعے قیامت کے دن کثرتِ تعداد میں دوسرے انبیاء سے مقابلہ کروں گا (۳)۔

(۱) البقرۃ: ۱۸۷۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''تو اب تم اپنی بیویوں سے ملو اور اللہ نے جو تمھارے لیے مقدر کیا ہے اس کے طالب بنو''۔

(۲) دیکھیے تفسیر طبری (۳/۴۷۸)۔

(۳) مسند احمد ۳/۱۵۸ و ۲۴۵، صحیح ابن حبان (۹/۳۳۸، رقم: ۴۰۲۸)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بچے پیدا کرنے والی ماؤوں (عورتوں) سے شادی کرو، میں تمھارے ذریعے قیامت کے دن فخر کروں گا(۱)

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میں نے ایک عورت سے شادی کا ارادہ کیا ہے جو بڑے خاندان کی ہے اور بہت خوبصورت ہے، لیکن اس سے بچے نہیں ہوتے، کیا اس سے شادی کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں، اس نے دوبارہ آکر یہی بات عرض کی، آپ نے پھر منع فرمایا، اس نے تیسری دفعہ حاضر ہو کر یہی بات دریافت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا دیکھو بچے پیدا کرنے والی عورت سے شادی کرو، تمھاری وجہ سے میں (دوسری امتوں سے) آگے بڑھوں گا(۲)۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ کیسے جانیں کہ کونسی عورت زیادہ بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ عموماً یہ صلاحیت موروثی ہوتی ہے، بعض خاندانوں میں بچے زیادہ پیدا ہوتے ہیں بعض میں کم، پس جس لڑکی کو پیغام بھیجنا ہو یا جس عورت سے شادی کا ارادہ ہو، اس کی ماں، خالہ، بہنوں اور اس طرح کی دیگر قریبی عورتوں کو دیکھا جائے گا کہ ان کے کتنے بچے ہیں، بہر حال اس خاندان کی لڑکی کو ترجیح دینی چاہیے جہاں بچے زیادہ پیدا ہوتے ہوں؛ لیکن افسوس کہ فیملی پلاننگ کے سراسر غیر فطری اور غیر اسلامی بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے بعد کی نسلوں کے لیے اس کا جاننا بھی مشکل ہو سکتا ہے۔

اور اس وجہ سے بھی زیادہ بچوں کی خواہش ہونی چاہیے کہ بچے جتنے زیادہ ہوں

---

(۱) مسند احمد ۲/۱۷۱-۱۷۲

(۲) ابوداود (۲۰۵۰) نسائی (۳۲۲۷)

گے اتنا ہی ہم خدا کے مقرب ہو سکتے ہیں، بچے والدین کے لیے استغفار کریں گے اور رفع درجات کی دعا کریں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بعض بندے ایسے ہوں گے جن کے درجے بڑھتے جائیں گے، وہ کہیں گے: پروردگار! یہ درجے ہمیں کیسے ملے؟ اللہ کہے گا: تمھاری اولاد نے تمھارے مرنے کے بعد تمھارے لیے استغفار کیا، اس کی وجہ سے تمھیں یہ درجہ ملا۔ (۱)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جب مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے (کہ ان کا ثواب اس کو ملتا رہتا ہے) صدقہ جاریہ (یعنی باقی رہنے والا صدقہ مثلاً کوئی مسجد یا مدرسہ بنا گیا یا کوئی چیز وقف کر گیا، کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں) یا وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جارہا ہو (یعنی کوئی اچھی چیز لوگوں کو سکھا گیا کہ لوگ اس کے مرنے کے بعد اس پر عمل کر کے فائدہ اٹھاتے ہوں، یا کوئی مفید کتاب لکھی تھی کہ اس کے بعد بھی اس سے فائدہ اٹھایا جارہا ہو) یا صالح اولاد جو اس کے حق میں دعا کرتی ہو۔ (۲)

اور اگر اس کی زندگی میں بچہ یا بچے مرجائیں تو اس میں بھی ثواب ہی ثواب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس مسلمان کے بھی تین نابالغ بچے مرجائیں تو اللہ اس شخص کو بچوں پر رحم کی وجہ سے جنت میں داخل کر دے گا (۳)۔

(۱) مسند احمد ۲/ ۵۰۹، مصنف ابن ابی شیبۃ ۷/ ۴۸۲، ۱۵/ ۳۵۴، سنن ابن ماجہ (۳۶۶۰)

(۲) مسلم (۱۶۳۱)۔

(۳) بخاری (۱۲۴۸)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت اپنا ایک بچہ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: اے اللہ کے نبی! اس کے لیے دعا کیجیے، میں نے تو تین بچوں کو دفن کرلیا ہے (یعنی میرے تین بچے مر چکے ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا سچ مچ تمھارے تین بچے مر چکے ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تب تو تم نے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا مضبوط انتظام کر رکھا ہے(۱)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے ارشاد فرمایا: کوئی بھی عورت ہو جس کے تین بچے مر گئے ہوں تو وہ اس کے لیے جہنم سے رکاوٹ بنیں گے، ایک عورت نے کہا: اگر دو بچے مر گئے ہوں تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر دو بچے مر گئے ہوں تب بھی یہی ہوگا(۲)۔

بلکہ ایک بچہ بھی مر گیا ہو تو وہ اس کے جنت میں داخل ہونے کا باعث ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص اپنے ایک بیٹے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اس سے پوچھا: کیا تم اس بچے سے محبت کرتے ہو؟ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ آپ سے محبت کرے جیسے میں اس سے محبت کرتا ہوں (یعنی مجھے اس سے بہت محبت ہے) پھر ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بچہ نظر نہیں آیا تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ فلاں کے بچے کا کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس کا تو انتقال ہوگیا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باپ سے فرمایا: کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ جنت کے جس دروازے پر بھی تم جاؤ وہاں اس کو تم

(۱) مسلم (۲۶۳۶)۔

(۲) بخاری (۱۲۴۹) ومسلم (۲۶۳۳)۔

اپنے انتظار میں پاؤ، یہ سن کر ایک شخص نے پوچھا: کیا یہ اس شخص کے ساتھ خصوصی معاملہ ہوگا یا ہم سب کے لیے یہ فضیلت ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تم سب کے لیے بھی یہی بات ہے(۱)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اولاد کے ذریعے چار طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں:

۱-نسل انسانی کو باقی رکھنے کی کوشش سے اللہ کی مرضی حاصل ہوتی ہے(اس لیے کہ اللہ نسلِ انسانی کو باقی رکھنا اور بڑھانا چاہتا ہے، تو یہ شخص اللہ کی منشا کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے)۔

۲-رسول اللہ ﷺ کی محبت حاصل ہوتی ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ اپنی امت کی کثرت پر قیامت کے دن دوسرے انبیاء کے مقابلے میں فخر کریں گے۔

۳-صالح اولاد کو چھوڑ کر مرجائے تو وہ اس کے حق میں دعا کرے گی، جس کا اس کو فائدہ حاصل ہوگا۔

۴-چھوٹا بچہ اگر اس سے پہلے مرجائے تو وہ اس کے حق میں سفارش کرے گا۔(۲)

بہر حال، اولاد زندگی میں بھی کام آتی ہے۔ ہم سے پہلے مرجائے تب بھی مفید ثابت ہوتی ہے، اور ہمارے بعد زندہ رہے تب بھی فائدہ پہنچاتی ہے، اس لیے عقل مندی کا تقاضا ہے کہ کثرت سے بچے پیدا کر کے ان کی صحیح تربیت کی کوشش کی جائے۔

لڑکیوں کی پیدائش پر ناگواری کی ممانعت اور ان کی پرورش کی فضیلت:

---

(۱) مسند احمد (۳/۴۳۶، ۵/۳۵)، مصنف ابن أبي شيبة (۷/۳۹۶)، المعجم الکبیر للطبرانی (۱۹/۲۶، رقم: ۵۴) وصحیح ابن حبان (۷/۲۰۹، رقم: ۲۹۴۷)، نیز دیکھیے سنن نسائی (۲۰۸۸، ۱۸۷۰)

(۲) دیکھیے احیاء علوم الدین (۲/۳۳)۔

زمانۂ جاہلیت میں لڑکی کی پیدائش پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا تھا، اور کہیں تو اس کو زندہ درگور کیا جاتا تھا، قرآنِ کریم جاہلیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے:

وإذا بشر احدهم بالانثى ظل وجهه مسودا وهو كظيم، يتوارى من القوم من سوء ما بشربه أيمسكه على هون أم يدسه في التراب ألا ساء ما يحكمون۔(۱)

لڑکا ہو یا لڑکی دونوں اللہ کی نعمت ہیں، لڑکی کی پیدائش پر ناراضگی یا اظہار ناپسندیدگی نعمتِ الٰہی کی ناشکری ہے، اللہ کا اختیار ہے لڑکا دے یا لڑکی دے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لله ملك السموات والأرض يخلق ما يشاء، يهب لمن يشاء إناثاً ويهب لمن يشاء الذكو۔أو يزوجهم ذكراناً وإناثاً ويجعل من يشاء عقيماً إنه عليم قدير﴿الشورى ۴۹۔۵۰﴾(۲)۔

پس ایک مومن کو اللہ کی مشیت پر راضی رہنا چاہیے اور کسی طرح کی کوئی شکایت یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، لڑکی کی پرورش پر جو فضیلت حدیث میں وارد ہوئی ہے اس کو یاد رکھنا چاہیے، اس سلسلے میں دسیوں روایتیں ہیں:

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بالغ ہونے تک دو لڑکیوں کی پرورش کرے تو قیامت کے دن وہ اور میں اس طرح ہوں گے، اور آپ ﷺ

(۱) (النحل:۵۸-۵۹) (ترجمہ) جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اور وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے، اس بری خبر کے بعد لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (ان کو منہ دکھانے کے لائق نہیں سمجھتا) سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس ذلت کے ساتھ اس کو لیے رہے یا مٹی میں دفن کردے۔

(۲) (ترجمہ) آسمانوں اور زمین کا اقتدار اللہ کے ہاتھ میں ہے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے، یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا کرتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا تا ہے، بے شک وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا اور ہر چیز پر قادر ہے۔

نے اپنی دو انگلیاں ملا کر دکھائیں یعنی وہ میرے اتنے قریب ہوگا (۱)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، وہ ان کے سلسلے میں اللہ سے ڈرے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔(۲) اس مفہوم کی متعدد روایتیں وارد ہوئی ہیں،: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کی تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان کی طرف سے پیش آنے والی مشقت اور تکلیف پر صبر کرے تو جنت میں داخل ہوگا، ایک شخص نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! اگر دو ہوں تو کیا ہوگا؟ فرمایا: اگر دو ہوں تب بھی۔ اس نے پھر پوچھا اور اگر ایک ہو؟ فرمایا ایک لڑکی ہو اور وہ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرے تو وہ بھی جنت میں داخل ہوگا (۳)۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا کہ جس کی تین بیٹیاں ہوں اور وہ صبر سے کام لے اور جو کچھ میسر ہو ان کو کھلائے پلائے اور پہنائے، تو وہ اس کے لیے جہنم سے رکاوٹ کا سبب بنیں گی (۴)۔

جب اس کے گھر میں بچی یا یکے بعد دیگرے بچیاں پیدا ہوں اور اس کو کچھ گھٹن یا پریشانی محسوس ہو تو وہ یاد کرے کہ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی چار چار بیٹیاں تھیں، اور کوئی بیٹا زندہ نہیں تھا، اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ

---

(۱) صحیح مسلم (۲۶۳۱)۔

(۲) دیکھیے مسند احمد ۳/۴۲، مصنف ابن ابی شیبۃ (۱۳/ ۹۷) ابو داود (۵۱۴۷) و (۵۱۴۸)، ترمذی (۱۹۱۲)۔

(۳) دیکھیے مسند احمد ۲/ ۳۳۵ مصنف ابن ابی شیبۃ ۱۳/ ۹۹) مستدرک حاکم ۴/ ۱۷۶ شعب الایمان للبیہقی (۱۱/ ۱۴۴-۱۴۵)۔

(۴) مسند احمد ۴/ ۱۵۴، الأدب المفرد للبخاری (رقم: ۷۶)۔

السلام کی بھی صرف بیٹیوں ہی کا ذکر قرآن نے کیا ہے، اس سے اس کو تسلی ہوگی۔

حضرت امام احمد کے بارے میں آتا ہے کہ جب ان کے یہاں کوئی بیٹی پیدا ہوتی تو کہتے کہ انبیاء تو بیٹیوں کے باپ تھے۔

وہ دوسروں کو بھی اسی طرح تسلی دیتے تھے، ان کے ایک شاگرد یعقوب بن بختان کہتے ہیں کہ میرے یہاں سات بیٹیاں ہوئیں، جب بھی کوئی بیٹی پیدا ہوتی میں امام احمد کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کو اس کی اطلاع دیتا، وہ مجھ سے فرماتے: اے ابو یوسف! انبیاء بیٹوں کے باپ تھے، ان کی اس بات سے میری فکر دور ہوتی، اور تسلی حاصل ہوتی (۱)۔

اور مستحب یہ ہے کہ جب کسی کے گھر ولادت کی خبر ملے تو پہلے یہ نہ پوچھے کہ لڑکا ہوا یا لڑکی، بلکہ یہ پوچھے بچہ ٹھیک ٹھاک ہوا ہے یا نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ جب ان کے خاندان میں کسی بچے کی پیدائش ہوتی تو وہ یہ نہ پوچھتی کہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ بلکہ پوچھتی کہ بچہ ٹھیک ٹھاک ہوا ہے؟ جب جواب ملتا کہ جی ہاں، تو فرماتیں: الحمد لله رب العالمين (۲)۔

بہر حال، بیٹی کی پیدائش پر خوش ہونا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ بیٹے سے بڑھ کر بیٹی باعث برکت ثابت ہو، اور ایسا بہت ہوتا ہے۔

اولاد کی پیدائش پر مبارک باد دینا اور صالح اولاد کی دعا دینا:

اولاد چوں کہ اللہ کی عظیم نعمت ہے، اور شادی کا ایک اہم مقصد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے صالح اولاد کی طلب ہے، اس لیے نئے شادی شدہ جوڑوں کو شادی پر مبارک باد دیتے

---

(۱) دیکھیے تحفۃ المودود، ص: ۳۵

(۲) الأدب المفرد (رقم: ۱۲۹۲)، جملے کا ترجمہ یہ ہے: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

ہوئے صالح اولاد کی دعا دینا چاہیے، لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف لڑکے کی دعا نہ دے، یہ تو زمانۂ جاہلیت کا طریقہ تھا، زمانۂ جاہلیت میں لوگ نکاح کی مبارک باد دیتے ہوئے کہتے تھے، " بالرفاء والبنين " (۱) یعنی تمھارے درمیان جوڑ اور اتفاق رہے اور لڑکے پیدا ہوں، جاہلیت کی طرح آج کل بھی بہت سے لوگ صرف لڑکے کی دعا دیتے ہیں۔ صحابہ کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی صرف لڑکے کی دعا دیتا تو غصہ ہوتے تھے کہ یہ اسلامی تعلیم کے منافی ہے، چناں چہ حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے شادی کی تو کچھ لوگوں نے زمانۂ جاہلیت کی طرح مبارک باد دیتے ہوئے دعا دی تو وہ غصہ ہوئے اور فرمایا: ایسا نہ کہو، بلکہ اس طرح دعا دو جس طرح رسول اللہ ﷺ دعا دیتے تھے، بارك الله فيكم وبارك لكم (۲) یعنی اللہ تمھارے اندر برکت دے اور تمھارے لیے برکت دے۔

رسول اللہ ﷺ مطلق برکت کی دعا دیتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی کو شادی کی مبارک باد دیتے تو فرماتے "بارك الله وبارك عليك وجمع بينكما فى خير" (۳) یعنی اللہ اس نکاح کو تمھارے حق میں باعث برکت کرے اور تمھارے اوپر برکتیں نازل کرے اور تم دونوں کے درمیان اتحاد واتفاق اور جوڑ پیدا کرے۔

اور برکت سے مراد مال واولاد میں برکت ہے۔

اولاد کی دعا دے کر خوش کرنا تو درحقیقت اللہ کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابرہیم علیہ السلام کو اسمٰعیل علیہ السلام واسحاق علیہ السلام کی اور پھر اسحاق علیہ السلام کی نسل

(۱) نسائی (۳۳۷۱) ابن ماجہ (۱۹۰۶)۔

(۲) دیکھیے حوالۂ بالا۔

(۳) ابوداؤد (۲۱۳۰) وترمذی (۱۰۹۱)۔

سے یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی، حضرت زکریا علیہ السلام کو یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی اور حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی۔

یہ سارے واقعات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ ان سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جب کسی کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کی بیوی امید سے ہے تو اس کے یہاں بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے اس خوشی کا اظہار کرے اور اس کو مبارک باد دے، اسی طرح عورتیں اس عورت کو مبارک باد دیں۔

اور بچہ پیدا ہونے کے بعد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی ضرور مبارک باد دے، اس سے اس کو خوشی ہوگی اور کسی مسلمان کو خوش کرنا بڑے ثواب کا کام ہے، اور اس موقع پر دنیا سے زیادہ دین کو پیش نظر رکھ کر دعا دینی چاہیے، بجائے اس کے کہ اس طرح کی دعائیں دے کہ بچہ بہت کمانے والا بنے، کامیاب تاجر بنے، اچھا ڈاکٹر بنے، دینی کامیابی کی دعا دیں، مثلاً بچہ نیک اور صالح ہو، تمھارا فرماں بردار بنے، حافظِ قرآن ہو، عالمِ دین بنے، داعی بنے، وغیرہ۔ ان دعاؤں کے ساتھ دنیا کی کامیابی کی بھی دعائیں دیں تو کوئی حرج نہیں بلکہ یہ بھی مطلوب ہے، البتہ صرف دنیا کو پیش نظر نہ رکھے۔ مشہور تابعی حضرت حسن بصریؒ کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی، ایک شخص نے آکر مبارک باد دیتے ہوئے کہا: مبارک ہو گھڑسوار، حسن بصریؒ نے اس کو ٹوکتے ہوئے کہا: تمھیں کیا معلوم یہ گھوڑے والا ہوگا یا گدھے والا! اس نے عرض کیا پھر ہم کس طرح کہیں؟ حضرت حسن بصری نے فرمایا: اس طرح کہو اللہ تمھارے لیے اس بچے میں برکت دے اور دینے والے کا تمھیں شکر ادا کرنے کی توفیق دے، یہ بچہ بڑا ہو اور تمھارا فرماں بردار رہے۔(۱)

(۱) أخرجه ابن المنذر في الأوسط، دیکھیے تحفة المودود (ص:۳۸) وأخرج ابن أبي الدنيا نحوه في العيال، رقم: ۲۰۱۔

فصل دوم

ضبطِ ولادت کا مسئلہ

ضبطِ ولادت پر ایک نظر:

ضبطِ ولادت(۱)(birth control) سراسر غیر اسلامی اور خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے، دوسری بہت سی مکاریوں کی طرح جو انسانیت کے حق میں سمِ قاتل ہیں، یہ بھی امریکہ کا طاقت ور فریب ہے کہ اس نے اس کو ایک پرکشش نام دیا یعنی خاندانی منصوبہ بندی(family planning)۔

انسانی وجود کو خاکستر کرنے والے یہ شعلے مغرب سے بلند ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری انسانی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، آبادی کے دھماکا خیز اضافے اور وسائلِ معاش کی قلت کو اصل خطرے کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ آواز خدا کے نظامِ ربوبیت کے

(۱) ضبطِ ولادت یا اس کے پرفریب اور پرکشش نام خاندانی منصوبہ بندی پر کچھ تفصیل اور وضاحت سے لکھنے کو جی چاہتا تھا، اور اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اس لیے کہ ہمارے ملک میں اب نئے نئے ناموں اور نت نئی تدبیروں سے اس کو عام کیا جا رہا ہے، مولانا مودودیؒ نے اس موضوع پر ''اسلام اور ضبطِ ولادت'' کے نام سے ایک نہایت مفید، معلومات افزا اور چشم کشا کتاب لکھی ہے، آج کے زمانے میں ہر فرد کو اور بالخصوص مغربی تہذیب کی ملمع سازیوں نے جن کی آنکھ پر پردہ ڈال رکھا ہے ان کو تو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، ۱۹۶۱ء میں اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے غالباً اس میں اضافہ نہیں ہوا۔ اب ضبطِ ولادت کو نئی تدبیروں سے رائج کیا جا رہا ہے، بہت سے نئے حقائق سامنے آئے ہیں، ان کو عام کرنا ملت کی ایک اہم خدمت ہے، اسی ضرورت کے تئیں میں نے اس موضوع پر معلومات جمع کی تھیں ، اور لکھنا شروع کیا تھا، لیکن کتاب کی ضخامت کے خوف نے قلم روک دیا، اب اللہ نے چاہا تو کسی اور موقع پر یہ چیزیں سامنے آئیں گی، اور اس سلسلے میں تفصیل سے شرعی احکام کی وضاحت کر دی جائے گی، اب اشاروں پر ہم نے اکتفا کیا ہے، تا کہ شرعی احکام کی حکمت اور غرض وغایت سمجھ میں آئے۔

خلاف بغاوت تھی ۔ وسائلِ معاش کی روز افزوں ترقی نے اس مفروضے کو سو فی صد غلط ثابت کیا، جس خدا نے روز اول ہی سے معیشت کے تمام وسائل زمین میں ودیعت کیے ہوں "وقدّر فیھاأقواتھا" (حم سجدہ:۱۰) یعنی اس نے زمین کے اندر خوراک کا سامان مہیا کردیا، اور جس کا یہ ارشاد ہو: "إنا کل شيئ خلقناہ بقدر" (سورہ قمر:۴۹) یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا، اور جس نے یہ فرمادیا ہو: "وإن من شيئ إلا عندنا خزائنہ وما ننزلہ إلا بقدر معلوم" (سورہ حجر:۲۱) کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جو بھی ہم اتارتے ہیں ایک مقرر مقدار میں اتارتے ہیں، اور جس نے یہ بھی کہہ دیا ہو: "وما کنا عن الخلق غافلین" (سورہ مؤمنون:۱۷) اور ہم مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔ اور جس نے صاف صاف یہ اعلان کردیا ہو: " وما من دابة في الأرض إلا علی اللہ رزقھا ویعلم مستقرھا ومستودعھا کل في کتاب مبین" (سورہ ہود:۶۰) یعنی زمین میں چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی روزی کا انتظام اللہ نے اپنے ذمے نہ لیا ہو، اور وہ جانتا ہے کون کہاں رہے گا، اور کہاں مرے گا، یہ سب کچھ ایک روشن کتاب میں موجود ہے۔ تو وہ خالق جو ایسا رحیم وکریم اور رب الأرباب ہو وہ کیا مخلوق کو معاشی تنگی میں ڈال کر مار ڈالے گا!!

۱۸۹۸ء میں برٹش ایسوسی ایشن کے صدر سر ولیم کروکس (sir william crookes) نے خطرے کا الارم بجایا تھا، اور تحدی (چیلنج) کے ساتھ کہا تھا کہ انگلستان اور باقی تمام مہذب اقوام گندم کی قلت اور قحط کے خطرے سے دوچار ہیں، اور دنیا کے وسائل اب تیس سال سے زیادہ ہماری ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن ۳۰ سال بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی افتاد نہ پڑی، بلکہ گندم کی پیداوار اتنی زیادہ تھی کہ

منڈیوں میں افراط کی وجہ سے کساد بازاری شروع ہوگئی، حتی کہ ارجنٹائنا اور امریکہ میں فاضل گندم کو نذرِ آتش تک کر دیا گیا۔(۱)

ضبطِ ولادت کی تحریک کے نتیجے میں باصلاحیت لوگوں کی کمی اور عام ذہنی اور عقلی معیار کی پستی سامنے آئی،، طلاق کی شرح میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، زنا کی کثرت کی وجہ سے مہلک اور خبیث امراض سامنے آئے اور سب سے زیادہ فکر انگیز اور تشویش ناک چیز جو سامنے آئی وہ شرحِ پیدائش میں خطرناک حد تک کمی تھی۔

جب یہ حقائق سامنے آئے اور ضبطِ ولادت کا اصل محرک مفروضہ کلی طور پر غلط ثابت ہوا تو مغرب میں اہل نظر کی آنکھیں کھلیں، ایک مشہور ماہر معاشیات کے الفاظ سنیے، لکھتا ہے: ''اگر ہم آبادی کی کمی کو قائم رکھنے کی حماقت کرتے ہیں تو ہم کو جان رکھنا چاہیے کہ تقلیلِ آبادی، جس سے ہم دوچار ہیں، بے روزگاری کے مسئلے کا حل نہیں ہے، اور نہ اس کی وجہ سے باقی ماندہ لوگوں کا معیارِ زندگی ہی بلند ہوتا ہے، اس کے معاشی اثرات لازماً ناخوش گوار ہوں گے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے آبادی میں بوڑھے لوگوں کا تناسب بڑھ جائے گا، اور پیدا کار (producers) ریٹائرڈ لوگوں کو برسرِ کار رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ اور اگر خود پیدا کاروں میں بھی ایک بڑا طبقہ بڑی عمر کے لوگوں پر مشتمل ہو تو نظام پیداوار میں وہ لچک باقی نہیں رہ سکتی، جو بدلتے ہوئے حالات اور نت نئے ٹکنیک کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ہمیں آبادی کی کمی روکنے کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو ممکن ہو''۔(۲)

یہ ایک معاشی حقیقت ہے کہ آبادی کی کثرت معاشی حیثیت سے بالعموم مفید ہی

---

(۱) ضبطِ ولادت، ص:۱۲۵۔

(۲) اسلام اور ضبط ولادت، ص:۶۴۔

ہوتی ہے، ہر وہ انسان جو دنیا میں آتا ہے وہ اپنے پاس صرف ایک پیٹ ہی نہیں رکھتا، دو ہاتھ، دو پاؤں، اور ایک دماغ بھی رکھتا ہے، پیٹ اگر احتیاجات کو پیش کرتا ہے تو یہ پانچوں مل کر انھیں پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور معاشی مفکرین کا ایک بڑا مؤثر گروہ اس رائے کا حامی ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں ابتدائی معاشی انقلاب کے لیے بڑھتی ہوئی آبادی بڑی مفید ہے کیوں کہ اس کے ذریعے سے وافر محنت(Labour) اور مؤثر طلب(Effective Demand) فراہم ہوتی ہے اور ایک ترقی یافتہ معیشت میں ترقی کو قائم رکھنے کے لیے (تا کہ کساد بازاری رونما نہ ہو) آبادی میں مسلسل اضافہ بے حد ضروری ہے۔ لارڈ کینز د(J.M.Keynes) پروفیسر ہینسین(A.L.Hensen) ڈاکٹر کولن کلارک(Colin Clark) پروفیسر جی ڈی ایچ کول(G.D.H.Cole) اور متعدد دوسرے مفکر یہی نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور معاشی تاریخ ان کے نظریات کی تائید کرتی ہے۔(۱)

اگر آپ تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو محسوس کرلیں گے کہ ضبطِ ولادت کی پالیسی کو اختیار کرنا دراصل اپنی شکست کا اعتراف کرنا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم انسان کی صلاحیتوں اور سائنس کی قوتوں سے مایوس ہو جائیں اور وسائل اور پیداوار کو بڑھانے کے بجائے انسانوں ہی کو کم کرنے لگیں۔ اگر کپڑا جسم پر راست نہیں آتا تو اس کا سائز بڑھانے کے بجائے انسانی جسم ہی کی تراش خراش شروع کردی جائے تا کہ لباس ٹھیک آجائے!(۲)

مغرب کے لیے اگلی صدی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے وجود کے برقرار رہنے کا مسئلہ ہے، اسے جوان آبادی میں تیزی سے کمی اور بوڑھی آبادی میں تیزی سے اضافے کا

(۳) اسلام اور ضبط ولادت، ص: ۲۰۹۔ از مضمون پروفیسر خورشید احمد صاحب بعنوان تحریک ضبط ولادت کا علمی جائزہ۔

(۴) پروفیسر خورشید احمد صاحب، از مضمون محولہ بالا۔ دیکھیے اسلام اور ضبط ولادت، ص: ۲۲۹۔

حقیقی خطرہ درپیش ہے جو جوہری بم کے خطرے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی نے بانجھ تہذیب اور بے اولاد نسلوں کو جنم دیا ہے۔ ایک ایسی نسل جو ایثار و قربانی کی روایت سے انکاری ہے اور ماں بننے کے دکھ درد اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے نتیجے میں آبادی کا زوال ہو رہا ہے، اور سن دو ہزار پچاس تک پورا مغرب ۳۰ فی صد بوڑھوں پر مشتمل ہوگا جس کے نتیجے میں مغرب کا اقتصادی، دفاعی، معاشی اور سیاسی نظام زمین بوس ہو جائے گا۔(۱)

اب حکومتوں نے آبادی بڑھانے کی تدبیریں شروع کیں، لیکن ان ملکوں میں جنسی آوارگی، لذت پسندی اور اعلی معیار زندگی کے باعث لوگ بچے پیدا کرنا ہی نہیں چاہتے، اس بنا پر کہ بچوں کی تربیت کے لیے ان کے پاس نہ وقت ہے نہ دولت۔

لذت پسندی ایثار و قربانی کی ضد ہے اور بچوں کی پرورش ایثار و قربانی چاہتی ہے، اس کے بغیر اولاد کے دکھ درد کو برداشت کرنا ممکن نہیں، مغرب لذت پسندی چھوڑ نہیں سکتا اس لیے اولاد پیدا کرنا نہیں چاہتا۔

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ معیار زندگی بلند کرنے کا لازمی نتیجہ شرح افزائش میں کمی ہے اور سادگی کا نتیجہ شرح افزائش میں اضافہ ہے، لہذا جہاں جہاں مغربی تہذیب کو غلبہ حاصل ہوگا وہاں آبادی تیزی سے کم ہوگی۔

فطرت کے خلاف بغاوت کے نتائج بھی کیسے مضحکہ خیز، حیرت انگیز اور ہوش ربا ہوتے ہیں! اٹلی میں مغربی تہذیب نے عجیب ستم ڈھایا ہے، کہ ماں باپ اولاد سے محروم ہیں، کیوں کہ دونوں کے پاس نہ وقت ہے نہ دولت، لہذا ماؤں کی ممتا نے عجیب و غریب طریقے اختیار کیے ہیں، روم کے گلی کوچوں میں عورتیں اپنی ممتا کی پیاس لاکھوں بلیوں کو

(۱) ماہنامہ ساحل کراچی جون ۲۰۰۵ء۔

دودھ پلا کر بجھاتی ہیں۔

ضبطِ ولادت کی تدبیریں بلا روک ٹوک استعمال کرنے کے باعث مغربی ممالک کی آبادی روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، اوراس کے بالمقابل مسلم دنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، (اگرچہ یہ وبا مسلمانوں میں بھی عام ہوگئی ہے، لیکن یورپ وامریکا سے بہت کم ہے) یورپی ممالک کی شرح آبادی اور مسلم دنیا کی شرح آبادی کے اعداد وشمار کا موازنہ کریں (۲) تو صاف طور پر یہ بات نظر آتی ہے۔ یہ اعداد وشمار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ مسلمانوں کی آبادی میں مغرب کی تشویش کا سبب کیا ہے!!

ارتھر میک کارمک (Arther mc Cormak) بڑے کھلے الفاظ میں اس بات کا اظہار کرتا ہے: ''ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کے لیے اس بات میں ایک فطری پسندیدگی ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک میں انسانوں کی تعداد کم ہوجائے اور یہ اس لیے ہے کہ وہ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد میں اپنے اعلیٰ معیارِ زندگی اور پھر خود اپنی سیاسی سلامتی کے لیے مستقل خطرہ دیکھتے ہیں''۔ (۳)

تو اب امریکہ اور یورپ اپنے سیاسی اور استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے ضبطِ ولادت کے طریقوں کو خوش نما تدبیروں سے مسلمانوں میں رائج کرنے کے لیے جٹے ہوئے ہیں، ۱۹۵۷ء ہی میں امریکی خارجی امور کے ایک نشریے میں صراحت سے یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ ''مصروشام مین ضبط ولادت کی تحریک اسرائیل کے صیہونی توسیع پسندانہ

---

(۱) گارجین نیوز سروس ۱۳/نومبر ۲۰۰۴ء بحوالہ ساحل، کراچی، جون ۲۰۰۵ء ص:۵۷۔

(۲) دیکھیے ساحل، جون ۲۰۰۵ء، ص:۶۱۔۶۲

(۳) دیکھیے اسلام اور ضبط ولادت، ص:۲۰۳۔ از مضمون پروفیسر خورشید احمد۔

مقصد کی خدمت کے لیے ہے(۱)

مصر کے سابق مفتی حسنین مخلوف نے ایک خفیہ پیغام کا حوالہ دیا ہے جو ایک بڑے پادری نے ڈاکٹروں کے نام جاری کیا تھا، اس میں ان کو تاکید کی گئی تھی کہ اپنے لوگوں میں ضبط ولادت کو قطعی طور پر روک دیں اور جو مسلمان یہ کرنا چاہے اس کی مدد کریں، تاکہ ان کی تعداد میں کمی آجائے اور دوسروں کی تعداد بڑھ جائے (۲)۔

ان حقائق کی موجودگی میں ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ ضبط ولادت اور فیملی پلاننگ کی اسلام میں کسی طرح اجازت نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ یہ اللہ کے نظام پر نکتہ چینی، اس کی ربوبیت کا انکار اور فطرت سے بغاوت ہے۔ جب ضبط ولادت کا پسِ منظر یہ ہے، اور اس کے استعمال کی یہ حقیقت ہے یعنی اس میں نقصان ہی نقصان، معاشرتی اور سماجی نقصان، اخلاقی نقصان، دینی وملی نقصان اور قومی نقصانات، یہاں تک کہ معاشی نقصان (۳) بھی ہے۔

---

(۱) أہداف الأسرۃ فی الاسلام/حسین محمد یوسف، ص:۹۱، بحوالہ أحکام الاجہاض فی الفقہ الاسلامی، ص:۲۱۷۔

(۲) قضیۃ تحدید النسل لأم کلثوم الخطیب، ص۱۸۴، بحوالہ احکام الاجہاض، ص۲۱۸۔ مشرق میں ضبط ولادت اور منع حمل کے طریقوں کو رائج کرنے کے لیے امریکہ اور یورپ کی کوئی کوشش کارگر ثابت نہیں ہوئی، تو اب نہایت پرکشش عنوان اور نہایت فنکارانہ انداز سے اس کو نافذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، یعنی پولیو ڈراپ کی شکل میں نسلوں کو توالد وتناسل کی قوت سے محروم کیا جارہا ہے، یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ اس میں مانع حمل دوائیں ملی ہوتی ہیں، کئی افریقی ممالک اور انڈونیشیا وغیرہ میں اس کا تجربہ ہوچکا ہے، اب غالباً ہمارا ملک ہندوستان سب سے زیادہ اس کا شکار ہورہا ہے، امریکہ کے زیرِ سایہ حکومت اس میں لگی ہوئی ہے اور علماء کو دھوکے میں رکھ کر اس کی حمایت میں فتوے حاصل کیے جارہے ہیں، لیکن ناقابل تردید شواہد کی موجودگی میں بچوں کو یہ دوائیں پلانا ان پر ظلم اور ان کے مستقبل کو تاریک کرنے کے مرادف ہے، جس کی کسی طرح اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۳) ان تمام نقصانات کی طرف ہم پیچھے اشارہ کرچکے ہیں، جن کو تفصیل مطلوب ہو وہ رجوع کریں، اسلام اور ضبط ولادت، ص:۹۴-۱۲۰۔

اور یہ سارے نقصانات مسلم ہیں، خود یورپ کے اہل نظر نے ان کا اعتراف کیا ہے، تو اب اسلام میں اس کی کوئی اجازت نہیں ہوسکتی کہ ضبط ولادت کی تحریک چلائی جائے، یا اس پر عمل کرنے کی ترغیب وتشویق دلائی جائے، اس لیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ صاف صاف فرماتا ہے ﴿ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة﴾ (بقرہ:۱۹۵) یعنی اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور ضبط ولادت کو اختیار کرنا متعدد ہلاکتوں کا شکار بنانا ہے۔

ضبطِ ولادت کے جواز کی صورت:

آج کے زمانے میں جن مقاصد سے ضبط ولادت کیا جاتا ہے، ان میں سے کسی مقصد کی خاطر ضبط ولادت کرنا اسلام مین جائز نہیں، لیکن کسی ناگزیر ضرورت کی بنیاد پر، خداترس عالم دین کی ہدایت کی روشنی میں، ماہر اور مخلص طبیب کے مشورے سے، خدا کے سامنے جواب دہی کے پورے احساس کے ساتھ، برتھ کنٹرول کیا جاسکتا ہے، جب تک کہ اس پر متوقع ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- عورت بہت کمزور ہو اور ولادت برداشت سے باہر ہو (عام طور پر عورت اس وقت یہی سمجھتی ہے، اس لیے اوپر کی شرائط نگاہ میں رہیں)

۲- جلدی جلدی بچے ہو رہے ہوں، اور والدین کو تربیتی نقطۂ نظر سے شدید الجھن پیش آرہی ہو، تو محدود مدت کے لیے ضبطِ ولادت کرسکتے ہیں۔

۳- اسی طرح جلدی جلدی اولاد ہونے کی وجہ سے ماں کی صحت پر نمایاں اثرات مرتب ہو رہے ہوں اس صورت میں بھی محدود وقت کے لیے برتھ کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح اوپر کی شرائط کو نظر میں رکھ کر کسی اور صورت میں بھی اس پر عمل کیا جاسکتا

ہے۔ واللہ اعلم

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا نے ضبطِ ولادت کی بابت جو فیصلے کیے ہیں ان کو درج کیا جائے ہماری پوری بحث کا اس میں خلاصہ بھی ہے اور ایک معتبر ادارے کے فیصلے ہونے کی وجہ سے تائید بھی۔(۱)

۱- کوئی بھی ایسا عمل جس کا مقصد نسل انسانی کے سلسلے کو منقطع یا محدود کرنا ہو اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف اور ناجائز ہے۔

۲- بطور فیشن خاندان کو مختصر رکھنے یا تجارت و ملازمت کی مشغولیتوں کے متاثر ہونے یا سماجی دلچسپیوں میں رکاوٹ پیدا ہونے کی وجہ سے اولاد کی ذمہ داری سے انکار و گریز کو شرع اسلامی کسی حال میں قبول نہیں کر سکتی۔

۳- جو خواتین بلند معیار زندگی کے حصول یا زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی خاطر نوکریاں کرنا چاہتی ہیں اور اپنے مقصد تخلیق اور اس مقدس فریضے کو بھول جاتی ہیں جو قدرت نے نسل انسانی کی ماں کی حیثیت سے ان پر عائد کیا، ان مقاصد کی خاطر خاندان کو محدود کرنے کا تصور قطعاً غیر اسلامی ہے۔

۴- جو بچہ موجود ہے اس کی پرورش، رضاعت، اور نشو نما میں اگر ماں کے جلد حاملہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں مناسب وقفہ قائم رکھنے کی خاطر عارضی مانع حمل تدابیر اختیار کرنا جائز ہے۔

۵- دائمی منع حمل کی تدابیر کا استعمال مردوں کے لیے کسی بھی حال میں درست نہیں، عورتوں کے لیے بھی منع حمل کی مستقل تدابیر ممنوع ہیں، سوائے ایک صورت کے۔ وہ استثنائی

(۱) پوری بحث لکھنے کے بعد اس پر نظر پڑی۔ اس کو نقل کرنے میں اگرچہ سابقہ بحث کی کچھ تکرار بھی ہے تاہم اس کا پورا نقل کرنا ہی مناسب معلوم ہوا، اس لیے کہ یہ مختصر جامع اور معتمد ہے۔

صورت یہ ہے کہ ماہر قابل اعتماد اطباء کی رائے میں اگلا بچہ پیدا ہونے کی صورت میں عورت کی جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہو جانے کا ظن غالب ہو، تو اس صورت میں عورت کا آپریشن کرا دینا تا کہ استقرارِ حمل نہ ہو سکے، جائز ہے۔

۶- عارضی منع حمل کی تدابیر اور ادویہ کا استعمال بھی عام حالات میں جائز نہیں۔

۷- چند استثنائی صورتوں میں عارضی منعِ حمل کی تدابیر و ادویہ کا استعمال مردوں اور عورتوں کے لیے درست ہے، مثلاً:

☆ عورت بہت کمزور ہے۔ ماہر اطباء کی رائے میں وہ حمل کی متحمل نہیں ہو سکتی اور حمل ہونے سے اسے شدید ضرر لاحق ہونے کا قوی اندیشہ ہو۔

☆ ماہر اطباء کی رائے میں عورت کو ولادت کی صورت میں ناقابل برداشت تکلیفوں اور ضرر میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو(۱)۔

مانعِ حمل دوائیں اور ان کے مضر اثرات:

استقاط حمل کے بکھیڑوں سے بچنے کے لیے طرح طرح کی مانعِ حمل تدبیریں اختیار کی گئیں، اور کثیر دولت صرف کر کے گولیاں تیار کی گئیں، لیکن اس کے باوجود ماہرین کا اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ذریعہ یقینی اور حقیقی نہیں، اور کوئی ایک ذریعہ بھی ایسا نہیں جو برے طبی اور اعصابی اثرات نہ چھوڑتا ہو، جب اتنی تدبیریں اختیار کر کے اور اتنا پیسہ خرچ کر کے بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا تو یہ انسان کی سخت نادانی ہے کہ وہ فطرت سے انحراف بلکہ بغاوت پر اصرار کرے! اتنا ہی نہیں بلکہ مانع حمل تدبیریں اختیار کرنے کے خطرناک نتائج نکلتے ہیں۔

---

(۱) اہم فقہی فیصلے ص:۱۶-۱۷، نیز ضبطِ ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ھیئۃ کبار العلماء (سعودی عرب) کی تجویز کے لیے دیکھیے فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والإفتاء (۱۹/۳۰۶-۳۰۸)۔

ڈاکٹر سیتاوتی اپنی کتاب فیملی پلاننگ (Family planning) میں اس حقیقت کو یوں بیان کرتی ہیں:

"بعض صورتوں میں ضبط ولادت کے نتائج خطرناک نکلتے ہیں، سکون قلب جاتا رہتا ہے، نفسیاتی ہیجان پیدا ہوجاتا ہے، اعصابی بے چینی رہنے لگتی ہے، نیند غائب ہوجاتی ہے، انسان مراق اور ہسٹریا کا شکار ہوجاتا ہے، دماغی توازن بگڑ جاتا ہے، عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں، اور مردوں کی قوت مردمی زائل ہوجاتی ہے"۔(۱)

لندن کے مشہور ڈاکٹر رینیل ڈیوکس کی رائے میں ضبط ولادت کی یہ گولیاں خطرناک نتائج کی حامل ہیں، ان سے دوران سر اور اعصابی تکالیف ہی نہیں، سرطان (یعنی کینسر) جیسے موذی مرض کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔(۲)

اب تو بہت سے ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سینے کے کینسر کا بنیادی سبب مانع حمل گولیوں کا استعمال ہے، وہی عورتیں اس مرض کی زیادہ تر شکار ہوتی ہیں، جو یہ گولیاں استعمال کرتی ہیں۔

(۱) اسلام اور ضبط ولادت، ص:۱۰۵۔ بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۱/ستمبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۴۔

(۲) صدق جدید لکھنؤ، ص:۳، مورخہ ۱۸/نومبر ۱۹۶۰ء۔

فصل سوم
حمل کے احکام ومسائل

اللہ کی مشیت یہ ہے کہ اس کے مقررہ وقت تک دنیا آباد رہے، جب اس نے آدم کو خلافت ارضی سونپی اسی وقت اس نے دنیا میں جینے کا طریقہ سکھایا اور ہر طرح کے وسائل کی تعلیم دی۔ وعلم آدم الأسماء كلها (بقرة: ۳۱) اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے، یعنی اس کائنات کے تمام آثار وخواص کا علم دیا، زندگی کے وسائل کیا ہیں؟ اور ان کا استعمال کس طرح کیا جائے؟ سب ان کو الہام کیا؛ تاکہ بنی نوع انسان ترقی کرے اور خلافتِ ارضی کا حق ادا کر کے رشکِ ملائکہ بن جائے، اس کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ انسان کا وجود باقی رہے، اس کی جان کی حفاظت ہو؛ اسی لیے اللہ نے بلا وجہ کسی جان کی ہلاکت کو بہت بڑا جرم، اور کسی جان کی حفاظت کو بہت بڑی نیکی اور پوری انسانیت کے ساتھ احسان کے مرادف قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے ﴿من قتل نفساً بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعاً ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً﴾ (مائدۃ: ۳۲) جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے اور زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اس کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض اور مجرم لوگوں میں قرار دیا ہے جو ناحق کسی کا خون بہائے (۱)۔

---

(۱) صحیح البخاری (۶۸۸۲)۔

تو جس طرح پیدا ہونے کے بعد انسانی جان کو ہلاک کرنا انسانیت کے حق میں ظلم عظیم ہے، اسی طرح پیدا ہونے سے پہلے بچے کو ماں کے پیٹ میں مار ڈالنا بھی اس جرم سے کسی طرح کم نہیں ہے، مگر اس میں ذرا تفصیل ہے جس کو ہم مختصر بیان کرتے ہیں:

عزل کا حکم:

ایک انسانی جان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ اہمیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل (۱) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ذلك الوأد الخفي (۲) یعنی یہ تو خفیہ طریقے سے بچے کی جان لینا ہے (۳)۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ عزل کو شدید ناپسند کرتے تھے (۴)۔

جہاں تک مسئلے کا تعلق ہے وہ یہ کہ بغیر اجازت آزاد بیوی سے عزل کرنا جمہور کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں بچے کی پیدائش میں رکاوٹ بننے کے ساتھ ساتھ بیوی

(۱) عزل یہ ہے کہ مباشرت (بیوی سے صحبت) کے وقت انزل کے قریب پہنچے تو بیوی سے الگ ہو جائے، تاکہ مادہ منویہ عورت کے اندر پہنچ کر حمل ٹھہرنے کا باعث نہ ہو، اس کو انگریزی میں (coitus interruptus) کہتے ہیں۔

(۲) صحیح مسلم (۱۴۴۲)

زمانہ جاہلیت میں بعض عربی قبائل میں رواج تھا کہ وہ اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، یہ نہایت سنگین جرم تھا، اس کے بارے میں قرآن نے سخت وارننگ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن زندہ دفن کی ہوئی اس بچی سے پوچھا جائے گا کہ تجھ کو کس جرم میں قتل کیا گیا؟ (سورۂ تکویر: ۸۔۹) رسول اللہ ﷺ کا اشارہ اسی روایت کی طرف تھا جیسا کہ آیت کے آخر میں آیا ہے، مطلب یہ تھا کہ عزل کا تعلق بھی اسی طرح بچے کو مار ڈالنے سے ہے، وہاں پیدا ہونے کے بعد تھا اور یہاں پیدا ہونے سے پہلے۔

(۴) جن روایتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عزل کرتے تھے، اور اس سے ممانعت نہیں کی جاتی تھی، اس میں کہیں یہ بات نہیں کہ وہ اپنی بیویوں سے عزل کرتے تھے، بلکہ روایتوں کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی باندیوں کے ساتھ عزل کرنا چاہتے تھے، اور اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ اولاد ہوگی تو باندی سے جو خدمت لی جاتی ہے اس میں کمی آئے گی

کے ساتھ بھی زیادتی ہے، اس لیے کہ اس سے اس کی خواہش پوری نہیں ہوگی۔ جس کے نتیجے میں دوسرے مفاسد معاشرے میں پیدا ہوسکتے ہیں۔

متاخرین شافعیہ نے بیوی کی اجازت کے بغیر بھی عزل کی اجازت دی ہے، جب کہ اس کا دوسرا قول جمہور کی طرح ہی ہے(۱) اور یہی قول مقاصد شریعت کے مطابق ہے، اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے(۲)۔

نیز اس سے میاں بیوی کے تعلقات خراب ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ کے نیشنل برتھ ریٹ کمیشن نے ضبطِ ولادت کے مسئلے پر طبی نقطۂ نظر سے جو رپوٹ شائع کی تھی اس کے مطابق:

جو لوگ عزل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کی بیویوں کی نظام عصبی میں سخت برہمی پیدا ہوتی ہے، اس سے ان میں بدمزاجی اور چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ہے، جب اس کے جذبات کی تسکین نہیں ہوتی تو شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں(۳)۔

اسقاطِ حمل کا حکم:

حمل کے تین مراحل ہوتے ہیں:

پہلا مرحلہ ابتدائی چالیس دن کا ہوتا ہے، جس میں حمل نطفہ (منی) کی شکل میں ہوتا ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری ۱۱/ ۶۴۸

(۲) دیکھیے مسند احمد ۱/ ۳۱، وابن ماجہ (۱۹۲۸) وفیه ابن لهیعة، وفیه کلام معروف۔ وقال البوصیری: وله شاهد من حدیث ابن عمر ومن حدیث ابن عباس رواهما البیهقی منفرداً بهما عن أصحاب الکتب الستة (زوائد ابن ماجہ) نیز دیکھیے ابوداؤد (۴۲۲۲) اور نسائی (۵۰۸۸)

(۳) دیکھیے اسلام اور ضبط ولادت، ص: ۹۷۔

دوسرا مرحلہ: اکتالیسویں دن سے ایک سوبیس دن تک کا ہے، جب وہ آہستہ آہستہ انسانی شکل اختیار کرتے کرتے بچے کی ابتدائی صورت میں تیار ہو جاتا ہے۔

تیسرا مرحلہ: ۱۲۰ دن یعنی چار مہینے کے بعد کا ہے جب اس میں جان پڑتی ہے۔(۱)

---

(۱) یہ مرحلے فقہاء نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث کی بنیاد پر مقرر کیے ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حدثنا رسول الله ﷺ وهو الصادق المصدوق: إن أحدكم يجمع خلقه في بطن أمه أربعين يوماً، ثم يكون في ذلك علقة مثل ذلك، ثم يكون في ذلك مضغة مثل ذلك، ثم يرسل الملك، فينفخ فيه الروح، و يؤمر بأربع كلماتٍ: بكتب رزقه وأجله وعمله و شقي أو سعيد......(رواه البخاري (٣٢٠٨: ٣٣٣٢: ٦٥٩٤) ومسلم (٢٦٤٣) واللفظ له۔

ہم سے رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا اور آپ سچے ہیں اور آپ سے سچ کہا گیا ہے۔ (یعنی اللہ نے آپ ﷺ سے سچ کہا اور آپ ﷺ نے اسی کے مطابق سچ بیان کیا) کہ تم میں سے ہر ایک کا مادہ تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں جمع کیا جاتا ہے چالیس دن، پھر اس میں (چالیس دن میں) علقہ (جمع ہوا خون) کی صورت میں اسی طرح (یعنی اسی جمع کرنے کی طرح) پھر اس میں مضغہ (یعنی گوشت کا لوتھڑا) کی صورت میں اسی طرح، پھر فرشتہ بھیجا جاتا ہے، وہ اس میں روح ڈالتا ہے، اور اس کو اس کی روزی، زندگی اور عمل کے بارے میں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور یہ لکھے کہ وہ نیک بخت ہوگا یا بد بخت۔

حدیث کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ مادہ تخلیق چالیس دن تک نطفہ کی شکل میں ہوتا ہے، پھر چالیس دن علقہ کی صورت میں ہوتا ہے، پھر چالیس دن مضغہ کی صورت میں رہتا ہے، وہ مثل ذلک سے چالیس دن مراد لیتے ہیں۔ جب کہ طب جدید کی روشنی میں اس پر اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ طبی حقیقت کے طور پر یہ بات سامنے آچکی ہے کہ نطفے کا مرحلہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر دو ہفتے علقہ رہتا ہے یعنی حمل کے آغاز سے اکیس دن تک، پھر مضغہ کی شکل میں ہوتا ہے چھٹے ہفتے کے ختم تک، پھر ساتویں ہفتے میں ابتدائی انسانی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ اور حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو اس کے خلاف ہو، بلکہ دوسری حدیث میں صاف ایسے الفاظ ہیں جو طب جدید کے پوری طرح مطابق ہیں اس میں ہے کہ جب نطفہ پر بیالیس راتیں گزر جاتی ہیں یعنی چھٹا ہفتہ ختم ہو کر ساتواں شروع ہوتا ہے تو اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے وہ اس کی صورت گری کرتا ہے، کان، آنکھ، کھال، گوشت اور ہڈیاں بناتا ہے۔ (مسلم، رقم: ۲۶۴۵)۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

تینوں مراحل کے مسائل واحکام مختلف ہیں: لیکن سب سے قطع نظر اصل تو یہ ہے کہ حمل کا اسقاط جائز نہیں ہے، لیکن مختلف مراحل کے لحاظ سے اس میں تفصیل ہے جس کو ہم نہایت اختصار کے ساتھ ذیل میں بیان کرتے ہیں:

(گذشتہ سے پیوستہ)

تو حضرت ابن مسعود کی روایت میں فی ذلک کا اشارہ أربعین فی ذلك العدد المذكور من الأيام کی طرف ہے، اور مثل ذلک سے اشارہ فعل کے مصدر کی طرف ہے، یعنی مثل ما اجتمع خلقكم في أربعين، ثم يكون في ذلك (أي في نفس الأربعين يوماً) مضغة (مجتمعة مكتملة الخلق المقدر لها) مثل ذلك أي مثل ما اجتمع في الأربعين يوماً۔ اس سے حدیث کا مفہوم اچھی طرح متعین ہوجاتا ہے اور کوئی اشکال نہیں رہتا (تفصیل کے لیے دیکھیے علم الأجنة فی ضوء القرآن والسنة، ص:۱۴۶-۱۵۱)

دوسرا اشکال روح پڑنے سے متعلق ہے کہ وہ کب پڑتی ہے؟ تمام قدیم علماء ومحدثین واطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ ایک سوبیس دن بعد پڑتی ہے، لیکن جدید تحقیق انسانی تخلیق کے ادوار کی جو تفصیل سامنے آتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے ساتویں ہفتے سے انسانی صورت کی ابتدا ہوتی ہے، اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسی وقت سے روح پڑتی ہے چناں چہ بعض معاصر فقہاء بھی اس کے قائل ہوئے ہیں ان کے نزدیک اسقاطِ حمل سے متعلق وہ تمام احکام چالیس دن کے بعد ہوں گے جو تمام فقہاء کے نزدیک ایک سوبیس دن کے بعد ہوتے ہیں، چناں چہ مشہور عالم وفقیہ ڈاکٹر عمر سلیمان الأشقر کی یہی رائے ہے، (دیکھیے دراسات فقہیہ فی قضایا طبیة معاصرة (۱/۳۴۳)۔

مگر علامہ ابن قیم نے جو بات لکھی ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، وہ بڑے عالم دین ہونے کے ساتھ ماہر ڈاکٹر بھی تھے، وہ لکھتے ہیں: روح کا جنین سے تعلق ایک سوبیس دن کے بعد ہوتا ہے اس سے پہلے جو حرکتیں معلوم ہوتی ہیں وہ اس کی ذاتی اور اختیاری حرکتیں نہیں ہیں، بلکہ شاید وہ حرکتیں جھلی اور رطوبت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ (التبیان فی أقسام القرآن، ص:۳۳۹، فصل:۱۰۱۔

اور ہوسکتا ہے کہ وہ حرکت نطفے کی حرکت کا امتداد ہو، اسی لیے اگر جنین چار مہینے پہلے ساقط ہوجاتا ہے تو اس کی زندگی کا امکان نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس میں اپنی جان نہیں ہوتی۔ لیکن اگر چار مہینے کے بعد ساقط ہو تو عقلاً اس کی زندگی کا امکان باقی رہتا ہے، اگرچہ عموماً وہ زندہ نہیں رہتا۔ واللہ أعلم

یہ تفصیل یہاں ہم نے اس لیے بیان کی تاکہ واضح ہوجائے کہ اسقاطِ حمل کے مراحل کے جو احکام مختلف ہوتے ہیں اس میں تیسرے مرحلے کا ایک سوبیس دن کے بعد شروع ہونا ہی قوی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم

بعض علماء کے نزدیک پہلے مرحلے میں بھی اسقاطِ حمل حرام ہے (۱) اور کچھ علماء کے نزدیک اس مرحلے میں اسقاط حمل مکروہ ہے، حرام نہیں (۲)۔ جب کہ تیسرا قول مطلق جواز کا ہے (۳)۔

دوسرے مرحلے میں فقہاء کا بھی ایسا ہی اختلاف ہے، لیکن راجح یہی ہے کہ اس مرحلے میں اسقاط جائز نہیں، مگر یہ کہ ناگزیر حالات پیش آئیں۔

دار الافتاء سعودی عرب (۴) سے جو فتویٰ صادر ہوا ہے وہ مقاصدِ شریعت کے عین مطابق ہے اور تمام مذاہب کے متعدد قدیم فقہاء کی رائے کے موافق ہے، اس کے متن کا حاصلِ ترجمہ ذیل میں ہے:

۱- اصل تو یہ ہے کہ کسی بھی مرحلے میں اسقاطِ حمل شرعاً جائز نہیں ہے۔

۲- پہلے مرحلے میں جو چالیس دن کا ہوتا ہے، حمل کا اسقاط متوقع ضرر سے بچنے کے لیے یا شرعی مصلحت سے جائز ہے، اور ہر صورت میں طبی اور شرعی ماہرین کی تصدیق وتائید ہونا ضروری ہوگی۔ بچوں کی تربیت کی پریشانی، ان کو کھلانے، پلانے اور تعلیم نہ دلا سکنے کے خوف یا ان کے مستقبل کے خوف کی وجہ سے یا جتنی اولاد ہے اتنی کافی سمجھ کر اسقاطِ حمل کرایا جا رہا ہو تو اس مرحلے میں بھی جائز نہیں ہے۔

---

(۱) مالکیہ کا مسلک یہی ہے، دیکھیے الذخیرۃ للقرافی (۴/۴۱۹) اور حاشیۃ الدسوقی (۲/۲۶۶-۲۶۷) بعض حنفی اور متعدد شافعی، حنبلی علماء کا بھی یہی قول ہے۔

(۲) حنفی شافعی دونوں مسلکوں کے متعدد علماء کا یہ ایک قول ہے اور چند مالکی علماء کا بھی یہی قول ہے۔

(۳) حنفیہ اور شافعیہ دونوں کا راجح قول یہی ہے، اور حنبلی مسلک بھی یہی ہے۔ تمام مذاہب کی تفصیل کے لیے دیکھیے، حاشیۃ ابن عابدین (۴/۳۳۶) الفتاوی الہندیۃ (۵/۳۵۶) نہایۃ المحتاج للرملی (۸/۴۰۱-۴۰۲) کشاف القناع للبہوتی (۱/۲۲۰)۔

(۴) اس کا پورا نام اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والإفتاء فی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ ہے۔

۳۔ دوسرے اور تیسرے چالیس دن میں اسقاطِ حمل جائز نہیں ہے جب تک کہ قابل اعتماد ڈاکٹروں کی کمیٹی اس کی تصدیق نہ کرے کہ حمل کا باقی رہنا ماں کی زندگی کے لیے خطرہ ہے، یعنی اگر حمل پیٹ میں ہے تو ماں کی جان جاسکتی ہے، اگر صورت حال یہاں تک پہنچ جائے تو ان خطرات سے بچنے کے تمام وسائل کو استعمال کرنے کے بعد اسقاطِ حمل جائز ہے(۱)۔

اور تیسرے مرحلے یعنی چار مہینے کے بعد جب جنین میں جان پڑ جاتی ہے اسقاطِ حمل جائز نہیں، قدیم فقہاء نے تقریباً متفقہ طور پر یہ بات بیان کی ہے، اور ماں کی بیماری وغیرہ کسی عذر کا استثنا نہیں کیا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ ایک جان کو بچانے کے لیے دوسری جان کو ختم کرنا جائز نہیں ہے، تو چار مہینے کے بعد کا حمل اگر چہ ماں کی بیماری کی وجہ سے اس کی زندگی کوئی یقینی نہیں، لیکن ماں کو بچانے کے لیے اس کا اسقاط کرانا زیادتی ہے جو جائز نہیں ہے(۲)۔

لیکن معاصر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔ جب ماں کی زندگی بچانے کے لیے یہی ایک حل رہ گیا ہو(۳)۔

تو اگر بچے کے اندر کوئی خلقی بیماری پیدا ہو جائے، خواہ وہ ظاہری اعضا کا عیب ہو یا اندرونی بیماری، جس سے شفا کی امید نہ ہو، اگر چار مہینے سے پہلے اس کا پتا چل جائے تو اس کا اسقاط جائز ہے، اس لیے کہ پیدا ہونے کے بعد یہ خود بھی مشقت میں پڑے گا اور اس کی وجہ سے ماں کا جینا بھی دوبھر ہو جائے گا(۴)۔

(۱) فتاوي اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء (۲۱/ ۴۳۵-۴۳۶)۔

(۲) دیکھیے احکام الاجہاض فی الفقہ الاسلامی، ص: ۱۵۵-۱۵۹۔

(۳) الموسوعة الفقهية الكويتية (۲/ ۵۷)، دلائل کی تفصیل و توضیح کے لیے دیکھیے لأحکام الإجہاض، ص: ۱۶۰-۱۶۷

(۴) دیکھیے أحکام الإجہاض، ص: ۱۷۴-۱۷۶۔

لیکن اگر چار مہینوں کے بعد ان عیوب اور بیماریوں کا پتا چل جائے تو اس کا اسقاط اور جان کو ضائع کرنا بالکل جائز نہیں، یہ قدیم وجدید فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے، ہاں صرف ایک صورت میں اس کی اجازت ہے جب معتبر ڈاکٹروں کی کمیٹی رپوٹ دے کہ اس بچے کا ماں کے پیٹ میں رہنا ماں کی زندگی کے لیے خطرہ ہوسکتا ہے، اس کی دلیل بالکل واضح ہے کہ جب بچے کی صحت کی حالت میں بھی ماں کی زندگی کے لیے خطرہ ہوتو عام معاصر فقہاء کے نزدیک اس کا اسقاط جائز ہے، تو پھر ایسے حمل کا اسقاط جو پیدا ہونے کے بعد اپنی پریشانی اور تکلیف کے ساتھ دوسروں کے لیے بھی الجھن اور مشقت کا باعث ہوسکتا ہو، اس کا اسقاط کرنا بدرجۂ اولی جائز ہونا چاہیے۔

اسی طرح اس صورت میں بھی جان پڑنے کے بعد اسقاط جائز ہے جب بچے کے اندر کسی ایسی بیماری کا پتا چل جائے جس کے ساتھ وہ زندہ نہیں رہ سکتا، مثلاً جنین بغیر سر کے ہو، یا اس کا دماغ نہ ہو، یا دل نہ ہو، یا گردے نہ ہوں وغیرہ، لیکن اس وقت اسقاط کے لیے شرط ہے کہ معتبر ڈاکٹروں کی کمیٹی مرض کی تشخیص کرے۔ لیکن ایسی موروثی بیماریوں کا پتا چل جائے جن کے ساتھ وہ زندہ رہ سکتا ہو، اگرچہ ماں کی نفسیات پر اس کا اثر پڑتا ہو، یا اس کی صحت متاثر ہوتی ہو اس صورت میں اسقاط جائز نہیں۔

(مسئلہ) اگر ماں کسی ایڈس جیسی کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو اور اس کا اثر بچہ میں منتقل ہوسکتا ہو تو اس صورت میں حمل کے اسقاط کا کیا حکم ہے؟

اگر حمل کے چار مہینے کے بعد یہ صورت حال پیش آجائے تو متفقہ طور پر اس کا اسقاط جائز نہیں ہے، اور اگر چار مہینے سے پہلے ہے تو اس سلسلے میں علماء کے دو قول ہیں: چند

(۱) دیکھیے دراسات فقہیہ فی قضایا طبیہ معاصرۃ، (۱/۳۴۶)۔

فقہاء کا کہنا ہے کہ اس صورت میں اسقاط جائز ہے، لیکن زیادہ تر فقہاء کے خیال میں جائز نہیں۔

ایک تیسری رائے اس سلسلے میں بعض علماء نے ظاہر کی ہے اور وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگر ابتدائی چالیس دن کے اندر اس مرض کے اثرات کا پتا چل جائے تو اسقاط جائز ہے، اور اس کے بعد جنین کی حالت بدل جاتی ہے اور انسانی شکل اختیار کرتا ہے اس لیے صرف مرض کے احتمال سے اس جنین کی زندگی کا حق نہیں مارا جائے گا۔ اور مدت جتنی آگے بڑھے گی اتنی ہی حرمت شدید ہوگی (۱)۔

ایک اور مسئلہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو تو اس صورت میں حنفی (۲) اور شافعی (۳)۔ مذہب یہ ہے کہ اس مردہ عورت کا پیٹ چاک کر کے فوراً بچہ کو نکالا جائے، اہل ظاہر کا بھی یہی مذہب ہے (۴)۔

بعض بڑے مالکی فقہاء نے بھی یہی رائے دی ہے (۵) نیز فقہ حنبلی میں بھی ایک قول اس طرح کا ملتا ہے (۶)۔ جس کو عصر حاضر کے علمائے حنابلہ میں سے شیخ عبدالرحمٰن السعدی اور شیخ صالح عثیمینؒ نے اختیار کیا ہے (۷)۔

---

(۱) دیکھیے احکام الاجہاض، ص:۱۹۱، اور تفصیل کے لیے اس سے پہلے کے صفحات ملاحظہ ہوں۔

(۲) تحفۃ الفقہاء (۳/۳۴۵) الفتاوی الہندیۃ (۱/۱۵۷)۔

(۳) المہذب مع شرح المہذب (المجموع) ۵/۱۹۲۔

(۴) المحلی لابن حزم (۵/۱۶۶)۔ (۵) الذخیرۃ (۲/۴۷۹)۔ (۶) الانصاف (۲/۵۵۶)۔

(۷) دیکھیے احکام الاجہاض، ص:۱۹۵۔ لیکن مالکی اور حنبلی مذہب یہ ہے کہ پیٹ چاک نہیں کیا جائے گا بلکہ اللہ کی مشیت پر چھوڑ دیا جائے گا، دیکھیے فقہ مالکی کے لیے الذخیرۃ محولۂ بالا، اور حنبلی مذہب کے لیے دیکھیے المغنی (۳/۴۹۷)، کشاف القناع للبہوتی (۲/۱۴۶) والانصاف للمرداوی (۲/۵۵۶)، بعض حنفی فقہاء نے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے، دیکھیے الفتاوی البزازیۃ بہامش الفتاوی الہندیۃ (۶/۳۷۹)۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں مر جائے اگر خود سے نکلے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، ورنہ دواؤں کے ذریعے کوشش کی جائے گی، اس سے بھی نہ نکلے تو آپریشن کر کے نکالا جائے گا۔ اس لیے کہ مردہ بچے کے پیٹ میں رہنے سے ماں متعدد اور مہلک امراض کی شکار ہو سکتی ہے، جس سے اس کو بچانا ممکن حد تک ضروری ہے۔

اگر زنا بالجبر کی وجہ سے حمل ٹھہرا ہو تو پہلے اور دوسرے مرحلے میں اس کا اسقاط جائز ہے، اس لیے کہ بصورت دیگر ماں کی بدنامی کا خطرہ ہے نیز بچے کے نسب کے مسائل بھی پیش آتے ہیں۔

لیکن اگر زنا دونوں کی رضامندی سے ہو تو پہلے مرحلے میں بھی اسقاط جائز نہیں، اگر اس حالت میں جواز کا فتویٰ دیا جائے گا تو زنا کے لیے چور دروازہ کھل جائے گا۔(۱)۔

اسقاطِ حمل کی دیت (خون بہا):

جب اسقاطِ حمل کا یہ مفصل حکم معلوم ہوا تو یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اسقاطِ حمل کے صحیح نہ ہونے کی صورت میں اسقاط کرنے والے پر دیت (خون بہا) واجب ہوگی، یعنی وہ مالی سزا کا مستحق ہوگا، اسقاط کا سبب ڈاکٹر ہو تو ڈاکٹر، کوئی دوسرا ہو تو وہ، باپ ہو تو باپ اور ماں ہو تو خود ماں پر بھی دیت واجب ہوگی۔

ڈاکٹر پر دیت اس صورت میں ہوگی جب اس نے دوا تجویز کرنے میں غلطی کی ہو یا ایسا علاج بتائے جو حمل پر اثر انداز ہوتا ہو یا حمل معلوم کیے بغیر ایسی دوا تجویز کرے جو اسقاطِ حمل کا باعث ہوتی ہو، یا ولادت کے وقت کوئی ایسی غلطی کرے جس سے بچہ مر جائے، یا فن سے واقفیت کے بغیر ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرے، یا کوئی علاج تجویز کرے جس کا اثر

(۱) دیکھیے احکام الأ جھاض، ص: ۱۲۶۔

جنین کی موت کی صورت میں ظاہر ہو، یا اسقاطِ حمل کی ناگزیر ضرورت کے بغیر حمل ساقط کروائے، بہر حال کوئی بھی سبب ہو جس سے ڈاکٹر کی زیادتی معلوم ہوتی ہو اس پر ذمے داری آئے گی اور وہ سزا کا مستحق ہوگا۔(۱)۔

اگر وہ ڈاکٹری اصول کے مطابق احتیاط کے ساتھ علاج کرے مگر اس کا اثر جنین پر پڑے تو اس صورت میں ضامن نہ ہونے پر اجماع ہے(۲)۔اسی طرح جمہور فقہاء کے نزدیک مریض یا اس کا ولی کسی خاص علاج کی اجازت دے تو ڈاکٹر کی ذمے داری ختم ہو جائے گی اور وہ ضامن نہیں ہوگا۔(۳)۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی بھی شخص کوئی ایسا عمل کرے جس سے حمل ساقط ہو جائے یا پیٹ میں مر جائے خواہ کوئی چیز ایسی کھلائے، پلائے، یا عورت کے پیٹ پر مارے، یا اس کو ڈرائے، دھمکائے جس کا اثر حمل پر پڑے وغیرہ، تو اس پر دیت واجب ہے خواہ یہ عورت کا شوہر ہو یا کوئی اور شخص۔

اسی طرح ماں کی طرف سے اگر حمل کے اسقاط کا سبب پایا جائے خواہ قصداً کرے، مثلاً ناجائز حمل ٹھہرنے کی وجہ سے اسقاط کرائے،(۴) یا شوہر سے ناراض ہو کر اس کو نقصان پہنچانے کے لیے حمل ساقط کرائے، اس صورت میں خواہ ڈاکٹر سے ساقط کروائے یا خود عمداً کوئی دوا یا غذا ایسی استعمال کرے جس کا نتیجہ حمل کا اسقاط ہو، ان

---

(۱) ڈاکٹر کے ضامن ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے الطب النبوی لابن القیم (ص:۱۴۴-۱۵۳)۔

(۲) دیکھیے الاجماع لابن المنذر (رقم:۶۹۶)۔

(۳) دیکھیے بدائع الصنائع، ونہایۃ المحتاج للرملی (۸/۳۰)، والمغنی لابن قدامہ ۸/۱۱۷، والانصاف للمرداوی (۶/۷۵) علامہ ابن قیم (زاد المعاد ۴/۱۴۱) وغیرہ نے یہ بات اختیار کی ہے کہ اگر ڈاکٹر ماہر ہے اور اس نے کوئی زیادتی نہیں کی تو وہ ضامن نہیں ہوگا، مریض یا اس کے ولی کی اجازت اور عدم اجازت کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۴) اس صورت میں اسقاطِ حمل کے جواز اور عدم جواز کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

صورتوں میں ماں پر ذمے داری عائد ہوگی اور اس پر متفقہ طور پر دیت واجب ہوگی، (۱)۔
اگر اسقاط کا قصد نہ ہو مگر کوئی ایسا عمل کرے جس کے نتیجے میں حمل ساقط ہو جائے، مثلاً زیادہ اچھل کود کرے جس سے عموماً حمل ساقط ہوتا ہے، تب بھی دیت واجب ہوگی۔ (۲)۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جس کا عموماً حمل پر اثر نہیں پڑتا، لیکن اس کے کام سے اثر پڑ جائے۔ مثلاً اپنی صحت کے لیے کسی دوا کا استعمال کرے مگر اس کا الٹا اثر پڑے اور حمل ساقط ہو جائے، تو اس کی طرف سے چوں کہ کوئی زیادتی اور کوئی ارادہ نہیں اس لیے اکثر فقہاء کے نزدیک اس صورت میں اس پر دیت نہیں ہے۔ اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ عورت بالکل بری ہے، جب کہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں وہ ضامن ہوگی۔ ان کے نزدیک عورت کسی بھی طرح حمل کے اسقاط یا موت کا سبب بنے تو اس پر دیت واجب ہوگی (۳)۔

اور ماں کے ضامن ہونے کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ اس کام کے لیے مجبور نہ ہو مثلاً کوئی دوا استعمال کرے جس کا استعمال علاج کے لیے اس کو ضروری تھا، ایسی صورت میں وہ ضامن نہیں ہوگی، شریعت کا ایک اصول ہے الضرورة تبیح المحظورات (یعنی مجبوری ممنوع کام کو بھی جائز کرتی ہے) اس کے پیش نظر یہ متفقہ بات معلوم ہوتی ہے(۴)۔

اور بعض فقہاء نے صراحت کی ہے کہ روزہ رکھنا مجبوری نہیں خواہ روزہ فرض ہی

---

(۱) المغنی لابن قدامہ (۱۲/۸۱)، نیز الحاوی للماوردی (۱۲/ ۴۰۵) ومجموعۃ فتاوی ابن تیمیہ ۱۷/ ۲۴۰ (۳۴/ ۱۶۱)۔

(۲) الحاوی للماوردی (۱۲/ ۴۰۵)۔

(۳) تکملۃ البحر الرائق للطوری ۹/ ۱۰۵۔

(۴) دیکھیے احکام الاجہاض، ص: ۳۶۱

کیوں نہ ہو اس لیے کہ اس کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، پس اگر ماں کے روزے کا حمل پر اثر پڑے اور وہ ساقط ہو جائے تو وہ ضامن ہوگی (۱)۔

اور اسقاطِ حمل کی دیت ایک غرۃ ہے یعنی ایک غلام یا باندی حمل کے وارث کو دینا (۲)۔ اور یہ دیت جانی کے عصبہ پر واجب ہوگی (۳) یعنی اسقاطِ حمل کا جو سبب ہوا ہے اس کے باپ کی طرف سے ہونے والے وارث رشتہ داروں کے ذمے اس کی ادائیگی ضروری ہوگی۔ غرہ کی قیمت کتنی ہوگی یعنی اس کا بدل کیا ہوگا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پچاس دینار اس کی قیمت متعین کی (۴)۔ اور اصل دیت (سو اونٹ) کی قیمت ایک ہزار دینار کے برابر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے پچاس دینار اصل دیت کا بیسواں حصہ ہوا، دوسرے لفظوں میں پانچ اونٹ، چناں چہ امام شافعی نے صراحت کی ہے کہ اس کی قیمت پانچ اونٹ ہوں گے (۵)۔ اور درہم کے حساب سے اصل دیت بارہ ہزار درہم ہے، تو اس کا بیسواں حصہ چھ ہزار درہم ہوئے۔ ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد کا یہی مسلک ہے۔ اور احناف کا مسلک یہ ہے کہ پانچ سو درہم اس کا بدل ہوگا اس لیے کہ ان کے نزدیک اصل

---

(۱) دیکھیے الحاوی للماوردی (۱۲/۴۰۵)۔

(۲) اس لیے کہ یہ سب سے قیمتی چیز تھی جس کا انسان مالک ہوتا تھا، اس لیے اس کو گویا اس کا بدل قرار دیا گیا (مغنی المحتاج للشربيني (۴/۱۰۳) اور بعضوں نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ جان کے بدلے جان کے طور پر غلام یا باندی کو دیت قرار دیا گیا ہے (دیکھیے الذخیرہ للقرافی (۱۲/۴۰۵)۔

(۳) صحیح بخاری (۵۷۵۸، ۶۷۴۰) ومسلم ۱۶۸۱، اور اس مسئلے پر اجماع ہے (الاجماع لابن المنذر (رقم: ۷۰۶) والتمهيد لابن عبدالبر (۶/۴۸۲) والاستذکار له (۹/۱۷۷)۔

(۴) مصنف ابن أبي شيبه (۱۴/۱۴۷)

(۵) الام ۶/۴۴۔ اور آج کل ہمارے ملک کی کرنسی کے لحاظ سے تقریباً دولاکھ روپے۔ اس لیے کہ ایک اونٹ چالیس ہزار کے آس پاس ملتا ہے، اور مکہ میں ڈھائی تین ہزار ریال کے درمیان اس کی قیمت ہوتی ہے، جو تقریباً اسی کے برابر ہوتا ہے

دیت دس ہزار درہم ہے۔(۱)۔

(مسئلہ) جس پر دیت واجب ہے وہ جنین کا وارث نہیں ہوگا، اس لیے کہ قتل اور سبب قتل وراثت سے محرومی کا سبب ہے اور یہ متفقہ مسئلہ ہے۔

(مسئلہ) اگر حاملہ عورت کسی گاڑی پر سوار ہے اور ڈرائیور کی لاپروائی سے ایکسڈنٹ ہوجائے یا گرجائے، یا گاڑی غیر معمولی حرکت کرے جس کے نتیجے میں پیٹ کا بچہ مرجائے تو ڈرائیور پر دیت واجب ہوگی، خواہ یہ بچے کا باپ ہو یا کوئی اور۔ لیکن اگر عورت گاڑی پر سوار ہو، اور معمولی حرکت ہوجائے جو عام طور پر سواری میں ہوتی ہے، مگر اس کا اثر حمل پر پڑے تو دیت واجب نہیں ہوگی، اسی طرح اگر اس کی کسی غلطی کے بغیر ایکسڈنٹ ہوجائے اور بچہ مرجائے تو دیت واجب نہیں ہوگی۔ واللہ أعلم

(مسئلہ) دیت کے ساتھ کفارہ بھی ادا کرنا اکثر علماء کے نزدیک ضروری ہے، اور وہ کفارہ ایک غلام یا باندی کو آزاد کرنا ہے، اور اگر یہ نہ ہوسکے تو مسلسل دو مہینوں کے روزے رکھنا اور اگر نہ ہوسکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ ائمۂ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی اور امام احمد) کا یہی مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک کفارہ واجب نہیں ہے۔(۲)۔

(مسئلہ) اگر جنین کے چھ مہینے پورے ہوچکے ہوں، پھر وہ زندہ ہو پھر اسی ضرب کے اثر سے مرجائے، خواہ وہ ساقط ہوتے وقت اس پر متفقہ طور پر پوری دیت (یعنی لڑکا ہے تو سو اونٹ اور لڑکی ہے تو پچاس اونٹ) واجب ہوگی۔ اور چھ مہینے سے کم ہے تو ایک غرّہ جیسا کہ گزرا(۳)۔

(۱) دیکھیے احکام الاجہاض (ص:۴۶۷)۔
(۲) المغنی ۱۲/۷۹-۸۰) نیز دیکھیے مجموعۃ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۷/۲۴۰ (۳۴/۱۶۱)۔
(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے المغنی ۱۲/۴-۷۶۔

(مسئلہ) اگر چھ مہینے سے پہلے جنین کا سقوط ہو جائے اور اس وقت اس میں زندگی کا اثر پایا جائے۔ اس صورت میں بھی پوری دیت واجب ہوگی، امام شافعی نے اس کی صراحت کی ہے۔(۱)۔

(۱) دیکھیے الحاوی للماوردی (۴۰۲/۱۲)

فصل چہارم

ولادت کے وقت کے احکام

بچے کی ولادت کا مرحلہ ایک نازک مرحلہ ہوتا ہے، درد زہ والی عورت گویا موت و حیات کی کشمکش میں ہوتی ہے، ایسے وقت میں اس عورت کو، اس کے متعلقین کو اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہونا چاہیے، اس موقع کے لیے کوئی خاص حکم یا خاص عمل کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں (۱)۔

لیکن کسی صالح شخص سے کوئی تعویذ لے کر عورت کے بازو پر باندھے یا کسی برتن میں لکھ کر اس کو پلائے تو کوئی حرج نہیں۔(۲)۔

---

(۱) البتہ امام ابن السنی نے عمل الیوم واللیلۃ میں دو روایتیں نقل کی ہیں: پہلی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت کو بچہ ہونے میں تکلیف ہو تو مرد ایک برتن لے اور اس میں یہ آیت لکھے {کأنهم یوم یرون ما یوعدون} (احقاف:۳۵) پوری آیت، اور آیت {کأنهم یوم یرونها، لم یلبثوا إلا عشیة أو ضحاها} (النازعات:۴۶) اور آیت {لقد کان فی قصصهم عبرة لأولی الألباب} (یوسف:۱۱۱) پوری آیت، اور اس کو دھو کر عورت کو اس میں سے پلائے، اور کچھ اس کے پیٹ اور زیر ناف پر چھڑکے (عمل الیوم واللیلۃ، رقم: ۶۱۹) مگر یہ حدیث شدید الضعف ہے۔

دوسری روایت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ جب ان کے بچہ ہو رہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ تم فاطمہ کے پاس جاؤ، اور اس کے پاس آیۃ الکرسی اور آیت {إن ربکم اللہ} (الأعراف:۵۴) پوری پڑھو اور معوذتین یعنی {قل أعوذ برب الفلق} اور {قل أعوذ برب الناس} پڑھ کر اس پر دم کرو (عمل الیوم واللیلۃ، رقم: ۶۲۰) یہ حدیث موضوع ہے، اس لیے ان دونوں حدیثوں سے دلیل نہیں لے سکتے۔

(۲) (تعویذ کے بارے میں مفصل احکام آگے آرہے ہیں) (۱) علامہ ابن تیمیہ نے امام احمد کے حوالے سے حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب کسی عورت کے لیے ولادت دشوار ہو جائے تو کسی صاف برتن میں لکھے:==

اسی طرح کرب ومصیبت کے وقت پڑھنے کی بہت سی دعائیں صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتی ہیں ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ان میں سے چند دعائیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱-لا إله إلا الله العظيم الحليم ، لا إله إلا لله رب العرش العظيم ، لا إله إلا لله رب السموات ورب الأرض ورب العرش الكريم(۱)۔

(کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، جو بڑی عظمت والا اور بڑا بردبار ہے، کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، جو آسمانوں اور زمین کا مالک اور بزرگ وبرتر عرش کا مالک ہے)۔

۲-يا حي يا قيوم برحمتك أستغيث (۲)۔

(اے زندہ رہنے والی اور کائنات کی ہر چیز کو قائم رکھنے والی ذات! تیرے رحمت کے واسطے سے میں مدد مانگتا ہوں)۔

==بسم الله لا إله إلا الله الحليم الكريم ، سبحان الله رب العرش العظيم ، الحمد لله رب العالمين ، كأنهم يوم يرونها لم يلبثوا إلا عشية أو ضحاها ،اور پوری آیت كأنهم يوم يرون ......(احقاف:۳۵)اور عورت کو پلائے،اور اس کے زیر ناف اس کو چھڑکے۔امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ وہ کسی صاف برتن میں یہ لکھ کردیتے تھے۔اسی طرح علامہ ابن تیمیہ نے حضرت ابن عباس کی دوسری روایت نقل کی ہے کہ ایسے موقع پر لکھے:بسم الله لا إله إلا الله العلي العظيم، لا إله إلا الله الحليم الكريم سبحان الله وتعالىٰ رب العرش العظيم، والحمد لله رب العالمين۔اور مذکورہ دونوں آیتیں۔راوی کہتے ہیں اس کو کسی کاغذ میں لکھ کر عورت کے بازو پر باندھے، نیز راوی کہتے ہیں کہ ہم نے تجربہ کیا تو اس سے حیرت انگیز کوئی نسخہ نہیں نکلا۔جب بچہ ہوجائے تو فوراً کھولے پھر اس کو کپڑے میں باندھے یا جلادے۔(فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۰/۳۶،۳۷ (۱۹/۶۴-۶۵)

(۱)حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرب ومصیبت کے وقت یہ دعا کرتے تھے، اور ایک روایت میں ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو یہ دعا فرماتے تھے(بخاری ۶۳۴۵، ۶۳۴۶، ومسلم ۲۷۳۰)۔

(۲)ترمذی(۳۵۲۴)ابن السنی(۳۳۷)مستدرک حاکم(۱/۵۰۹)۔

۳-اللهم رحمتك أرجو، فلا تكلني إلى نفسي طرفة عين، وأصلح لي شأني كله(۱)۔

(اے اللہ! تیری رحمت کا میں امیدوار ہوں، پس تو مجھے پلک جھپکنے کے برابر میرے نفس کے حوالے نہ کر، اور میرا اتمام کام بنا، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں)۔

۴- لا إله إلا أنت سبحانك إني كنت من الظالمين(۲)۔

(تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، تیری ذات پاک ہے، میں ہی ظالم ہوں)۔

۵-اللهم لا سهل إلا ما جعلته سهلا، وأنت تجعل الحزن إذا شئت سهلاً(۳)۔

(اے اللہ کوئی چیز آسان نہیں، مگر وہی جس کو تو آسان کردے، اور تو جب چاہے سخت زمین کو بھی نرم کردے)۔

یہ اور اس طرح کی دیگر دعاؤں (۴)۔ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دردزہ والی عورت بھی اللہ کی طرف متوجہ ہو اور گھر کے لوگ بھی دعاؤں میں مشغول رہیں اور اللہ سے لو لگائیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ولادت کا مرحلہ آسان نہ ہو، انشاء اللہ عافیت کے ساتھ یہ مرحلہ انجام پائے گا۔

---

(۱) مسند احمد (۱/۴۲) ابوداوٴد (۵۰۹۰) ابن السنی (۳۴۲)۔

(۲) احمد (۱/۱۷۰) ترمذی (۳۵۰۷) حاکم (۱/۵۰۵)۔

(۳) ابن السنی (۳۵۱) صحیح ابن حبان (رقم: ۹۷۴) حدیث میں مطلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے، لیکن دعا کا مضمون دیکھ کر امام نووی نے الأذکار میں اس کے لیے عنوان قائم کیا ہے، باب ما يقول إذا استصعب عليه أمر (جب کوئی معاملہ دشوار ہوجائے تو کیا کہے)

(۴) مزید دعاؤں کے لیے دیکھیے امام نووی کی الأذکار میں ابواب الأذكار التي تقال في أوقات الشدة وعلى العاهات، باب دعاء الكرب والدعاء عند الأمور المهمة۔

ولادت کے لیے آپریشن کا مسئلہ:

انسان اللہ کے نزدیک ایک محترم ومکرم ہستی ہے، شرعی مصلحتوں کے بغیر اس کے کسی عضو کو کاٹنا یا چیرنا جائز نہیں، انسان کی ایسی عظمت واحترام کے پیش نظر فقہاء نے تو یہاں تک اختلاف کیا ہے کہ جب حاملہ عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کے پیٹ میں زندہ بچہ ہو تو اس کے پیٹ کو چیر کر بچے کو نکالا جائے گا، یا اللہ کی میشیت پر چھوڑ دیا جائے گا(۱)۔

اس سے ہم آپریشن کر کے بچے نکالنے کے جواز کی نزاکت کو سمجھ سکتے ہیں، آج ولادت کے لیے آپریشن کو جس کثرت سے رواج دیا گیا ہے وہ مشرقی ممالک کے ساتھ مغرب کی سازشوں کا ایک حصہ ہے، جب مانع حمل دوائیں اور تدبیریں پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہوئیں تو انھوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ آپریشن کے ذریعے پیٹ کاٹ کر بچے نکالو، تاکہ عورت کمزور ہو جائے اور تین سے زیادہ بچے پیدا کرنے طاقت ہی نہ رہے۔(۲)۔

اور خود غرض ڈاکٹروں نے اس کو تقویت پہنچائی، بے ضرورت اچھی خاصی عورت کا پیٹ چاک کرنا ایک معمولی کام ہو گیا، بڑی تعداد میں ڈاکٹر استعماری مقاصد کی خدمت کے ساتھ ساتھ صرف اپنے جیب کے لیے اس جرمِ عظیم کا ارتکاب کرتے ہیں اس لیے کہ آپریشن کی فیس زیادہ ملتی ہے۔(۳)

---

(۱) مسئلہ پیچھے گزر چکا ہے۔

(۲) ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں جس سے ہم اس کا تناسب متعین کر سکیں، لیکن دیہاتوں کو مستثنیٰ کر کے شہروں کے حالات کا جائزہ لیں تو محتاط اندازے کے مطابق پچاس فیصد سے زائد بچے آج آپریشن کے ذریعے پیدا ہو رہے ہیں۔

(۳) لکھنؤ کے ایک ہسپتال کی بات ہے، جس کے کانوں میں یہ آواز پڑی خود اس سے ہم نے سنا کہ ہسپتال میں عورت دردزہ میں تھی، نرس نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے کہا، ڈاکٹر صاحب جلدی آیئے، ورنہ نارمل ڈلیوری ہو جائے گی، ڈاکٹروں کی خود غرضی اور بے رحمی کا اس سے اندازہ کر سکتے ہیں!!

کچھ کم ہمت عورتیں ولادت کے وقت کی تکلیف سے گھبرا کر خود آپریشن کا تقاضا کرتی ہیں، تاکہ جلدی مشکل سے نجات پا جائیں، ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک وقتی تکلیف ہے، جس سے ہر ماں گزر جاتی ہے، پھر ہمیشہ کی راحت ہے، اور آپریشن سے وقتی طور پر تو تکلیف سے بچ جاتی ہے، لیکن ہمیشہ کی تکلیف ساتھ ہو جاتی ہے، بالخصوص جب عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو اس تکلیف کے واپس آنے کا خدشہ باقی رہتا ہے تو عقل اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ وقتی تکلیف کو برداشت کر کے ہمیشہ کی راحت کا انتظام کیا جائے، نہ یہ کہ وقتی تکلیف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ کی تکلیف کو دعوت دی جائے۔

اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے جس کو ذہن میں بٹھا لینا چاہیے کہ اولادِ آدم سے لے کر اب تک انسان برابر فطری طریقے پر پیدا ہوتے رہے ہیں اور کسی جاندار کا بچہ پیٹ کاٹ کر نہیں نکالا جاتا، سب فطری طریقے پر بآسانی پیدا ہوتے ہیں، تو یہ انسان فطری طریقے پر بچہ پیدا کرنے سے کیوں گھبراتا ہے، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں کیوں اس کو گھبرایا اور خوف زدہ کیا جاتا ہے، اور غیر فطری طریقے پر چلنے کو وہ کیوں کامیابی سمجھتا ہے! یہ تو انسان کا اپنے خلقی عمل سے عاجزی اور دست برداری کا اعلان ہے، جو ایک بہت بڑی ذلت کی بات ہے!!

بہر حال، عورت کو صبر اور اس کے متعلقین کو ہمت سے کام لینا چاہیے اور یقین کرنا چاہیے کہ موت کا وقت متعین ہے، ایک لمحہ پہلے موت آسکتی ہے نہ پیچھے ہو سکتی ہے، خواہ ہم جو بھی تدبیر کریں، اور پھر یاد کر لینا چاہیے کہ جس عورت کا زچگی میں انتقال ہوتا ہے اس خوش نصیب کو شہادت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔(۱)

(۱) دیکھیے موطأ، کتاب الجنائز، رقم: ۳۶، ص: ۱۸۵، وابوداود (۳۱۱۱) ونسائی (۱۸۴۶) وابن ماجہ (۲۸۰۳)

جہاں تک مسئلے کا تعلق ہے تو اصول فقہ کی روشنی میں:

۱۔ جو عورتیں پہلے سے گھبرا کر آپریشن کراتی ہیں، وہ جائز نہیں۔

۲۔ جو عورتیں دردزہ کی شدت سے بے تاب ہو کر ناگزیر ضرورت کے بغیر آپریشن کی تجویز رکھتی ہیں وہ بھی جائز نہیں، اس لیے کہ آپریشن کا نقصان اس سے کہیں زیادہ ہے، اور جان بوجھ کر اپنا نقصان کرنا شریعت میں جائز نہیں ﴿ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة﴾ (بقرہ:۱۹۵) یعنی اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

۳- جو ڈاکٹر، عورت یا اس کے اہلِ خانہ کی تجویز پر آپریشن کرتے ہیں جب کہ ان کے نزدیک اس کی ضرورت نہ ہو، وہ جائز نہیں۔ وہ اس سے ایک حرام کام کے مرتکب ہوتے ہیں

۴- جو ڈاکٹر خاجی دباؤ یا اپنے جیب کے لیے آپریشن کرتے ہیں، وہ جائز نہیں، اس سے ان کی جو کمائی ہوگی وہ ناجائز ہے۔

۵- البتہ آپریشن کی کبھی ضرورت پیش آسکتی ہے جب بچہ کسی وجہ سے نہ نکل رہا ہو اور عورت کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے، اس وقت ماہر اور مخلص ڈاکٹروں کے خیال میں زندگی بچانے کا واحد حل آپریشن ہی ہو، اس صورت میں آپریشن کرانا جائز ہے۔ اور ایسی صورت میں جہاں تک ہو سکے لیڈی ڈاکٹر سے آپریشن کرانا چاہیے۔(۱)۔ واللہ أعلم

(۱) یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی ضرورت کبھی کبھی ہی پیش آسکتی ہے۔ انسانی تاریخ کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ہزار میں دو تین۔

دوسرا باب

ولادت کے بعد کے احکام

فصل اول

بچے کے کان میں اذان دینا

بچہ پیدا ہوتے ہی اس کو نہلانے دھلانے کے بعد سب سے پہلا کام یہ مستحب ہے کہ اس کے کان میں اذان دی جائے، حضرت ابورافع کہتے ہیں کہ جب حسن بن علی پیدا ہوئے تو میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے ان کے کان میں اذان دی جس طرح نماز کی اذان دیتے ہیں(۱)۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دائیں کان میں اذان دی اور بائیں کان میں اقامت کہی۔(۲) حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں مروی ہے کہ جب

(۱) مسند احمد ۶/ ۹، ۳۹۱، ۳۹۲، ابوداود (۵۱۰۵) ترمذی (۱۵۱۶) مستدرک حاکم ۳/ ۱۷۹۔

(۲) دیکھیے مسند ابی یعلی (۶/ ۳۲، رقم: ۶۷۴۷)، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی (۶۲۳) وشعب الایمان ۱۱/ ۱۰۶ رقم ۸۲۵۴، ۸۲۵۵۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے کان میں اذان دینا مستحب ہے، اگر چہ ابورافع کی وہ حدیث جو اوپر مذکور ہوئی ہے، اور جو اس مسئلے میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے اس میں ضعف ہے، اس کی سند میں ایک راوی عاصم بن عبیداللہ ہیں جن کو اکثر محدثین نے حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے، جب کہ امام ترمذی اور حاکم نے اس کے باوجود اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے لیکن بعد کے محدثین نے اس پر اعتراض کیا ہے، البتہ اس کی تائید بعض دوسری روایات سے ہوتی ہے، دو روایتیں تو وہی ہیں جن میں اقامت کا بھی ذکر ہے اور جن کا ہم نے اوپر حوالہ بھی دیا ہے مگر یہ دونوں روایتیں ضعیف، بلکہ بعض علماء نے ان کو موضوع قرار دیا ہے، ایک روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنھما سے مروی ہے، مگر اس کو بھی موضوع قرار دیا گیا ہے، ان روایتوں سے تو پہلی روایت کو تقویت نہیں مل سکتی، البتہ ایک طویل روایت ام الفضل (والدہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما) سے مروی ہے جس کو طبرانی نے المعجم الاوسط (۶/ ۱۴۳ رقم ۹۲۵۰) میں نقل کیا ہے جس کے سب راوی ثقہ ہیں اگر چہ متن منکر ہے، لیکن اس سے ابورافع کی روایت کی فی الجملہ تائید ہوتی ہے، اس سے زیادہ بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ تفصیل بھی ہم ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے، لیکن چوں کہ آج کل بعض علماء نے ابورافع کی روایت کے ضعیف ہونے کی بنا پر بچے کے کان میں اذان کی مشروعیت سے انکار کیا ہے، اور بعض سلفی علماء ==

ان کے یہاں کسی بچے کی ولادت ہوتی تو وہ اس کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اٹھاتے، اس کے دائیں کان میں اذان دیتے اور بائیں کان میں اقامت کہتے (۱)۔ حسن بصری سے بھی اس کا استحباب نقل کیا گیا ہے (۲) امام نووی (۳) اور علامہ ابن قیم (۴) بھی اس کو مستحب قرار دیتے ہیں۔

علماء نے اس میں بڑی حکمتیں لکھی ہیں:

(۱) اس میں بڑی اہم ملی و دینی مصلحت ہے، اس لیے کہ اذان اسلام کے شعائر (مذہبی رسوم وعلامتیں) میں سے ہے اور اس میں دین محمدی کا اعلان ہے، تو بچہ پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں پکار کر کہا جائے کہ تم مسلمان ہو، دینِ محمدی کے تابع ہو۔

(۲) یہ کہ سب سے پہلے اللہ کی بڑائی اور کبریائی اور توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے اقرار کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑیں، وہ الفاظ جن سے کوئی آدمی اسلام میں داخل ہوتا ہے، جس طرح دنیا سے جاتے وقت کلمۂ توحید کی تلقین کی جاتی ہے، ایسے ہی دنیا میں آتے ہی کلمہ کے الفاظ اس کے کانوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

(۳) دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی پیدائش کے وقت شیطان کی کوشش رہتی ہے کہ اس پر اپنے اثرات ڈالے اور چوں کہ اذان سے شیطان بھاگ جاتا

== بڑے شدومد سے اس کا انکار کرتے ہیں، لیکن اللہ نے ایک سلفی عالم (علی بن احمد الکندی) ہی کو توفیق دی انھوں نے اس سلسلے کی تمام روایتوں کو جمع کر کے اذان کا استحباب ثابت کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے شبکۃ سحاب السلفیۃ www.sahab.net(salafi network) میں الاذان فی أذن المولود) پھر یہ کہ سلف سے لے کر خلف تک امت کا اس پر عمل رہا ہے، امام ترمذی نے حدیث کی تصحیح کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے والعمل علیہ یعنی اسی حدیث کی وجہ سے امت کا اس پر عمل ہے۔

(۱) مصنف عبدالرزاق ۴/۲۵۹ (۳۳۵)۔ (۲) دیکھیے نیل الاوطار (۳/۴/۶۷)

(۳) المجموع (۸/۲۵۸)۔

(۴) تحفۃ المودود، (ص:۳۹)

ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، اس وقت اذان دینے سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگا۔

(۴) چوں کہ بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے اس لیے پیدا ہوتے ہی توحید ورسالت کی شہادت کے الفاظ اس کے کان میں ڈال کر گویا اس کو یاد دہانی کرائی جاتی ہے، اگر چہ بچہ اس کو محسوس نہیں کرتا، لیکن اس کے اندرون میں اس کے اثر پڑنے کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا(۱)۔

(۱) دیکھیے تحفۃ المودود، (ص:۴۰) و حجۃ اللہ البالغۃ (۳۸۵/۲)۔ ان سب حکمتوں کی بنا پر بھی امت کا اس پر عمل رہا ہے۔

فصل دوم

بچے کی تحنیک یعنی اس کے تالو میں میٹھی چیز لگانا

سنت ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو کوئی صالح آدمی کھجور چبا کر بچے کے تالو میں اس طرح لگائے کہ اس کے پیٹ میں اس میں سے کچھ پہنچ جائے ،اس عمل کو عربی میں ''تحنیک'' کہتے ہیں، اگر کھجور نہ ملے تو شہد، شکر یا کوئی بھی میٹھی چیز اس کے تالو میں لگائے۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہجرت کے موقع پر میں عبداللہ بن زبیر میرے پیٹ میں تھا، ولادت کا وقت قریب تھا، قبا میں پہنچی تو بچہ پیدا ہوا، میں بچے کو لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بچے کو آپ کی گود میں دیا، آپ ﷺ نے ایک کھجور منگوائی اور اس کو چبا کر بچے کے منہ میں رکھا، تو پہلی چیز جو اس کے پیٹ میں داخل ہوئی وہ رسول اللہ ﷺ کا لعابِ دہن تھا(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن ابی طلحہ انصاری (جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ماں جائے بھائی تھے، دونوں کی ماں ام سلیم رضی اللہ عنہا تھیں) لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے ایک عجوہ کھجور منگوائی اور اس کو اچھی طرح چبا کر بچے کے منہ میں رکھا، بچہ زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے اس کو چاٹنے لگا، حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھو انصار کھجور کتنا پسند کرتے ہیں، پھر آپ نے بچے کا نام عبداللہ رکھا۔(۲)

---

(۱) دیکھیے بخاری (۵۴۶۹) ومسلم (۲۱۴۶)۔

(۲) بخاری (۵۴۷۰) ومسلم (۲۱۴۴)۔

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، میں اس کو لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور چبا کر اس کے تالو میں لگائی اور اس کے لیے برکت کی دعا دی۔ (۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بچوں کو لایا جاتا، آپ ﷺ ان کے لیے برکت کی دعا کرتے اور کھجور چبا کر ان کے تالو میں لگاتے (۲)

ان جیسی روایتوں سے استدلال کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ بچے کو پیدائش کے بعد کسی صالح اور متقی شخص کے پاس لے جایا جائے، تاکہ وہ اس کی تحنیک کرے اور اس کے حق میں خیر و برکت کی دعا کرے۔ امام نووی لکھتے ہیں، بہتر ہے کہ تحنیک کرنے والا کوئی نیک صالح آدمی ہو۔ اگر مرد نہ ہو تو کوئی نیک عورت یہ کام انجام دے (۳)۔

تحنیک سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ بچے کے مزاج میں اور اخلاق میں مٹھاس پیدا ہو، تحنیک کرنے اور کروانے والے کو اس کی نیت کرنی چاہیے، اس سے امید ہے کہ انشاء اللہ اس کا یہی اثر مرتب ہوگا۔ واللہ اعلم۔

تحنیک کے طبی فوائد اور حکمتیں:

اس شگون سے بڑھ کر تحنیک میں متعدد طبی فوائد اور حکمتیں ہیں، جن کا بیسویں صدی میں انکشاف ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے خون میں شکر کی مقدار کم ہوتی

---

(۳) بخاری (۵۴۶۷) و مسلم (۲۱۴۵)۔

(۴) مسلم (۲۱۴۷)۔

(۱) المجموع ۸/ ۲۵۸

ہے،اور بچے کا وزن جتنا کم ہوگا،شکر کی مقدار اتنی ہی کم ہوگی،تو جن بچوں کا وزن ڈھائی کلو سے کم ہوتا ہے ان کے خون میں تو شکر بہت ہی کم مقدار میں ہوتی ہے،یعنی اکثر ایسے بچوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ہر سو ملی لیٹر خون میں بیس ملی گرام شکر ہوتی ہے،اور جو بچے ناقص حالت میں پیدا ہوتے ہیں ان کے خون میں بیس گرام سے کم شکر کی مقدار ہوتی ہے۔اور جن بچوں کا وزن ڈھائی کلو سے زیادہ ہوتا ہے ان کے سو ملی لیٹر خون میں عموماً تیس ملی گرام شکر ہوتی ہے،اگر تیس ملی گرام سے کم پائی جائے تو اس کو بہت کم سمجھا جاتا ہے،اور یہ خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے،جس سے کئی عوارض اور بیماریاں پیدا ہوسکتی ہیں:

۱۔بچہ دودھ پینے سے انکار کرسکتا ہے۔

۲۔پٹھوں میں ڈھیلا پن اور کمزوری ہوسکتی ہے۔

۳۔سانس لینے میں دشواری ہوسکتی ہے،اور جسم میں نیلا پن ہوسکتا ہے۔

۴۔سانس کا دورہ پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

اور بسا اوقات اس سے بہت خطرناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں:

۱۔جس طرح بڑھنا چاہیے بچہ اس طرح بڑھتا نہیں ہے۔

۲۔عقل پختہ نہیں ہوتی۔

۳۔دماغ میں کمزوری لاحق ہوتی ہے۔

۴۔سماعت یا بصارت یا دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

اگر بروقت ان کا علاج نہ کیا جائے تو بچہ بسا اوقات مرجاتا ہے۔اور اس کا علاج بہت آسان ہے،وہ یہ کہ پانی میں گھول کر گلوکوز کی شکر دی جائے۔اگر بچہ منہ کے راستے سے اس کو نہ لے سکے تو شہ رگ کے ذریعے جسم میں یہ شکر پہنچائی جائے۔اب دیکھیے رسول اللہ

ﷺ بچوں کی تحنیک کرتے تھے، پھر آپ ﷺ جس طرح تحنیک کرتے تھے وہ طریقہ بھی قابل غور ہے، آپ ﷺ کھجور لے کر اس کو چباتے، پھر وہ چبایا ہوا ٹکڑا جس میں آپ ﷺ کے لعاب کی آمیزش ہوتی تھی، بچے کے تالو میں لگاتے، جو بچے کے پیٹ میں پہنچ جاتا۔اور یہ بات جدید تحقیق سے ثابت ہے کہ کھجور میں گلوکوز شکر وافر مقدار میں موجود ہوتی ہے۔بالخصوص لعاب اگر اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس میں مزید تاثیر پیدا ہوتی ہے اس لیے کہ لعاب میں انزیم anzyme (ایک کیمیائی خمیر) کی خاصی مقدار پائی جاتی ہے ، جو شکر کے اس خمیرے کو یک جان کر دیتی ہے، اور لعاب سے شکر کو گھلنے میں مدد ملتی ہے، اس طرح بچہ اس سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

چوں کہ اکثر، بلکہ تمام بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد گلوکوز شکر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے چبا کر باریک کی ہوئی کھجور اس کو کھلانا اس کو ان تمام مذکورہ خطرناک بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے جو شکر کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک مستقل معجزہ ہے، چودہ سو سال پہلے کوئی اس کی حقیقت کو نہیں جانتا تھا، نہ کوئی شکر کی کمی کی وجہ سے جو خطرناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، ان سے واقف تھا، اب جدید طب نے اس کو تسلیم کر لیا ہے، بالخصوص بچہ جب پیدائش کے وقت بہت کمزور ہو، یا اس میں کوئی کمی پائی جائے، اس وقت تو اس کو شکر دینا ضروری ہی ہو جاتا ہے، اس لیے اسپتالوں میں اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ پیدائش کے ساتھ بچوں کو گلوکوز دی جاتی ہے، اور جدید تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ تحنیک سے بچے کے منہ کے پٹھے بھی مضبوط ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنی زبان، تالو اور جبڑوں کو حرکت دیتا ہے، اس سے دودھ اچھی طرح لینے کی مشق ہوتی ہے، خون میں اس سے حرکت پیدا ہوتی ہے، اور تحنیک کے دوران میں بچے کے حلق کے اوپری حصے پر جو دباؤ پڑتا ہے، اس سے منہ صحیح طبعی

شکل پر آ جاتا ہے، اور جب بچہ بولنے لگتا ہے تو حروف کے مخارج صحیح نکلتے ہیں۔ اطباء حیران ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کیسے ان حقیقتوں کو پالیا تھا۔ یقیناً آپ ﷺ اللہ کے رسول تھے، اور آپ کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے علم آتا تھا(۱)۔

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے al-manal.com / maktoob.com majdah۔

تیسرا باب

عقیقے کا بیان

عقیقے کا حکم: جمہور صحابہ وتابعین اور ائمۂ فقہ: امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کے نزدیک عقیقہ سنتِ موکدہ ہے(۱) احناف کے یہاں اس سلسلے میں دو قول پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ جائز ہے۔ دوسرا قول تطوع اور استحباب کا ہے(۲)۔ جب کہ امام لیثؒ امام داؤد ظاہریؒ اور ابن حزم نے اس کو واجب قرار دیا ہے(۳)۔ اس سلسلے میں بہت سی حدیثیں ہیں:

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر بچے کے ساتھ عقیقہ ہے، پس تم اس کی طرف سے ذبح کرو(۴)۔

دوسری روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا: جس کے بچہ پیدا ہو اور وہ اس کی طرف سے ذبح کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ وہ جانور کی قربانی کرے(۵)

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں کل غلام رهينة بعقيقته (۶) یعنی اس کی طرف سے ساتویں دن ذبح کیا جائے اور سر منڈایا جائے اور نام رکھا جائے۔ یعنی ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض رہن (گرو) ہے۔

یہ حدیث عقیقے کے سلسلے میں بہت تاکیدی ہے، اس کے مفہوم میں اختلاف ہے

---

(۱) بدایۃ المجتہد ۲/۸۹۳، والمجموع ۸/ ۴۲۹، نیز تحفۃ المودود (ص ۴۴، ۴۵ص ۵۷) اور سید سابق لکھتے ہیں کہ باپ تنگدست بھی ہو تو عقیقہ سنت مؤکدہ ہے (فقہ السنۃ ۴/۱۸۱)۔

(۲) ردالمحتار ۹/۴۸۵۔

(۳) المحلی ۷/۵۲۳۔

(۴) بخاری (۵۴۷۲)۔

(۵) ابوداؤد (۲۸۴۲) نسائی (۴۲۱۷) مسند احمد (۲/۱۸۲۔۱۸۳)۔

(۶) احمد ۵/ ۱۷، وابوداؤد (۲۸۳۸)، ترمذی (۱۵۲۲)، نسائی (۴۲۲۵)، ابن ماجہ (۳۱۶۵)۔ روایت میں آگے یہ الفاظ ہیں۔:" تذبح عنه يوم سابعه ويحلق ويسمى"

اس کے ایک معنی یہ بیان کیے گئے ہیں بچے کی اچھی پرورش اس کے عقیقے سے بندھی ہوتی ہے، یعنی عقیقہ ہوگا تو اچھی پرورش ہوگی، یعنی عقیقہ بچے کے دین کی سلامتی کا ضامن ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ بچہ رہن رکھی ہوئی چیز کی طرح ہے، تو جس طرح قرض ادا کرکے رہن چھڑائے بغیر اس چیز سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح بچہ گویا رہن میں رکھا ہوا ہے، عقیقے سے مُنعم کے احسان کا قرض ایک طرح ادا ہو جائے گا(۱)

اور ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس بچے کا عقیقہ نہیں ہوا اور وہ بچپن میں مر جائے تو والدین کے حق میں سفارش نہیں کرے گا، امام احمد نے بھی اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، خطابی وغیرہ نے اس مفہوم کو سب سے بہتر قرار دیا ہے۔(۲)

اس مفہوم کی توضیح اس طرح ہے کہ جیسے قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں رہن روک دیا جاتا ہے، واپس نہیں کیا جاتا، اسی طرح عقیقہ نہ کرنے کی صورت میں بچے کو والدین کی سفارش سے روک دیا جائے گا۔

لیکن علامہ ابن قیمؒ نے اس پر سخت اعتراض کیا ہے، اور انھوں نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ عقیقہ شیطان سے حفاظت کا سبب ہے، اس کے بندھن کو توڑ دیتا ہے اور اس کے اثرات کو کم کرتا ہے اس لیے کہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بچے کی پیدائش کے وقت اس پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، اور اکثر لوگوں پر اثر ڈالنے میں کامیاب بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کی آیتیں اس پر شاہد ہیں، تو اللہ نے اس کے اثرات سے بچے کے محفوظ رہنے کے لیے والدین کو یہ تدبیر بتائی کہ اس کی طرف سے جانور ذبح کرو(۳)۔

---

(۱) دیکھیے شرح الطیبی ۸/ ۱۳۸-۱۳۸۔

(۲) معالم السنن للخطابی (۴/ ۲۵۹) نیز دیکھیے سبل السلام شرح بلوغ المرام ۷/ ۳۵۱-۳۵۲۔

(۳) دیکھیے تحفۃ المودود ص ۷۰-۷۲۔ یہ ایک اچھی علمی بحث ہے، اہل علم کو اس سے رجوع کرنا چاہیے۔

اس تاکیدی حکم کی وجہ سے امام احمدؒ فرماتے تھے کہ اگر کسی کے پاس تنگ دستی کی وجہ سے عقیقہ کرنے کی طاقت نہ ہو، وہ اگر قرض لے کر عقیقہ کرے تو مجھے امید ہے کہ اللہ اس کو اس کا بدل عطا فرمائے گا، اس لیے کہ اس نے ایک سنت کو زندہ کیا ہے(۱)۔

اس کا مفہوم جو بھی ہو، بہر حال اس تاکیدی حکم کی وجہ سے جہاں تک ہو سکے عقیقے کا اہتمام کرنا چاہیے اور اس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اس کا بہت اہتمام فرماتے تھے، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کا عقیقہ کرنے کے بارے میں بہت سی روایتیں ہیں۔ بعض روایتوں کا ہم آگے تذکرہ کریں گے۔

مشہور محدث یحیی بن سعید الأنصاری (جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے) فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو (صحابہ وتابعین) کو دیکھا وہ عقیقے کا بہت اہتمام کرتے تھے، اس کو چھوڑتے نہیں تھے، خواہ بچے کا عقیقہ ہو یا بچی کا۔

اسی طرح مشہور محدث وفقیہ ابن المنذر لکھتے ہیں کہ شروع سے اب تک حجاز میں اس پر عمل ہوتا آرہا ہے، علماء اس کا اہتمام کرتے ہیں۔(۲)

امام مالکؒ فرماتے ہیں: ہمارے یہاں (مدینے میں) سب اس کی اہمیت کو جانتے ہیں اور اس پر عمل ہوتا آرہا ہے۔(۳)

عقیقے کی حکمتیں اور فوائد:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقیقے کے احکام ومسائل بیان کرنے سے پہلے اس کی حکمتوں اور فوائد پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے، اس سے عقیقے کی ترغیب ہوگی اور اس کی اہمیت

(۱) تحفۃ المودود ص ۵۹۔

(۲) الاشراف علی مذاہب العلماء لابن المنذر (۳/۴۱۷)

(۳) موطا، کتاب العقیقہ، ص ۳۵۵

واشگاف ہوگی، اصل تو یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ایک تاکیدی سنت ہے، اس لیے کوئی حکمت ظاہر نہ بھی ہو تو اس پر عمل کرنا چاہیے، چہ جائے کہ اس میں بہت سی حکمتیں بھی ہوں! علماء نے اس کی متعدد حکمتیں بیان کی ہیں، جن میں سے چند ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱-عقیقہ ایک قربانی ہے جو بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کی طرف سے ادا کی جاتی ہے، جس سے اس کو بہت فائدہ پہنچتا ہے، جس طرح دعا سے، اور حج کرانے سے اس کو فائدہ پہنچتا ہے۔

۲-گویا یہ ایک فدیہ ہے جو بچے کی جان کے بدلے میں ادا کیا جاتا ہے یعنی اس کے بدلے بچے کی جان چھڑائی جاتی ہے، جیسے اسماعیل علیہ السلام کو مینڈھے کے بدلے چھڑایا گیا تھا، اسی کی نقل میں جاہلیت میں بھی لوگ عقیقہ کرتے تھے، یہ ایک اچھا شگون تھا، اور نیک عمل تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اصلاح کرتے ہوئے اس کو باقی رکھا، جاہلیت میں لوگ بچے کے سر پر عقیقے کے جانور کا خون ملتے تھے، یہ ایک گندی چیز تھی، رسول اللہ ﷺ نے اس کو ختم کیا۔(۱)

۳-عقیقے سے شیطان کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی تدبیر کی جاتی ہے۔(۲)۔

۴-عقیقہ بچے کے نسب اور خاندان کے اظہار اور پرچار کا ایک ذریعہ ہے، اس سے آسانی سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ فلاں کا بچہ ہے، اور اس کی کسی بھی معاشرے میں سخت ضرورت ہوتی ہے، تاکہ کبھی اس کے بارے میں کوئی ناپسندیدہ بات نہ کہی جاسکے۔

۵-عقیقے سے سخاوت کی صفت پیدا ہوتی ہے، اور بخل کی بیماری کا علاج ہوتا ہے۔

۶-عیسائیوں میں جب کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو زرد پانی سے اس کو رنگا

---

(۱) دیکھیے تحفۃ المولود، ص ۶۸-۶۹۔

(۲) اس کی تفصیل عقیقے کے حکم کے تحت گزر چکی ہے۔

کرتے تھے اور اس بات کو نصرانی یعنی عیسائی ہونے کی علامت سمجھا جاتا، پس مناسب معلوم ہوا اور بہتر سمجھا گیا کہ ان کے اس فعل کے مقابلے میں کوئی ایسا فعل پایا جائے جس سے اس بچے کا ملتِ ابراہیمی یعنی اسلام کا تابع ہونا معلوم ہو۔(۱)۔

۷-عقیقہ اللہ کی نعمت کا شکریہ اور اس پر اظہارِ خوشی کا ایک طریقہ ہے، بچہ اللہ کی عظیم نعمت ہے اور والدین کو بچہ سے محبت ہوتی ہے اس لیے اس پر مُنعم کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

۸-عقیقے کا گوشت کھلا کر رشتہ دار، پڑوسیوں ، دوست و احباب اور فقراء و مساکین کے دلوں کو خوش کیا جاتا ہے، اور اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے، اور اسلام میں آپسی الفت ومحبت اور اجتماعی زندگی کی جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔(۲)

یہ اور اس طرح کی اور بھی مصلحتیں اور حکمتیں عقیقے میں پنہاں ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بچے اور بچی کے عقیقے کا فرق:

لڑکی کی طرف سے ایک اور لڑکے کی طرف سے دو بکرے یا بکریاں ذبح کی جائیں، جمہور فقہاء کے نزدیک یہ فرق ملحوظ رکھا جائے گا۔

اس سلسلے میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ لڑکی کی طرف سے ایک اور لڑکے کی طرف سے دو بکرے یا بکریاں ذبح کریں۔(۳)

حضرت ام کرز رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقیقے کے

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ (۲/۳۸۳-۳۸۴)

(۱) دیکھیے الفقہ المنہجی ۳/۵۷۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبۃ ۱۲/۳۲۵ ومسند احمد ۶/۳۱، و۱۵۸و۱۶۵،اور ترمذی (۱۵۱۳) وابن ماجہ (۳۱۶۳)۔

بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا: لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا (۱)

ام کرز رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت کے بعض طرق میں "شاتان مکافئتان" کے الفاظ آئے ہیں جس کے لفظی معنی ہیں: دو بکرے برابر، اس کے تین مطلب بیان کیے گئے ہیں: (الف) عمر میں دونوں تقریباً برابر ہوں زیادہ فرق نہ ہو (ب) دونوں کو ذبح کرنے کے درمیان زیادہ وقفہ نہ ہو، ایک کے بعد دوسرا ذبح کرے (ج) دونوں بکرے ایسے ہوں جن کی قربانی جائز ہو (۲)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین کے عقیقے میں دو دو مینڈھے ذبح کیے (۳) متعدد صحابہ اور تابعین سے بھی یہ بات مروی ہے کہ لڑکے کے عقیقے میں دو اور لڑکی کے عقیقے میں ایک بکرا ذبح کیا جائے۔ (۴)

جمہور کے نزدیک سنت یہی ہے، لیکن اگر لڑکے کی طرف سے بھی ایک ہی بکرا یا بکری ذبح کی جائے تب بھی عقیقے کی اصل سنت ادا ہو جائے گی۔ (۵)

ابو داود کی روایت میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے عقیقے کے سلسلے میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان کی طرف سے ایک ایک مینڈھا ذبح کیا، اور وہ روایت بھی صحیح ہے۔ (۶) مگر محدثین نے متعدد وجوہ سے پہلی روایت کو ترجیح دی

(۱) ابوداود (۲۸۳۴۔۲۸۳۶) ترمذی (۱۵۱۶) نسائی (۴۲۲۱) ابن ماجہ (۳۱۶۲) احمد (۳۸۱/۶ و ۴۲۲) مصنف ابن ابی شیبہ (۳۶۲/۱۲) مصنف عبدالرزاق ۲۵۲/۴ (۳۲۷)۔

(۲) دیکھیے فتح الباری ۴۰۶/۱۲۔۴۰۷، حدیث نمبر ۵۴۷۲

(۳) نسائی (۱۶۶/۷، نمبر ۴۲۱۹)

(۴) دیکھیے مصنف ابن ابی شیبۃ (۳۲۴/۱۲۔۳۲۵)

(۵) دیکھیے المجموع (۴۴۹/۸)

(۶) دیکھیے ابوداود (۲۸۴۱)

ہے(۱)۔

لیکن ایک ایک والی روایت کی وجہ سے بعض فقہاء اس کے قائل ہوئے ہیں، جن میں امام مالک، امام زہری اور امام ابوجعفر محمد الباقر بھی ہیں، اور حضرت ابن عمر اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا عمل بھی یہی نقل کیا جاتا ہے(۲)۔

اس لیے لڑکے کی پیدائش کے وقت اگر دو بکرے ذبح کرنے کی طاقت نہ ہو تو ایک ہی ذبح کرے اور سنت سے محروم نہ رہے۔

عقیقے کا وقت:

سنت یہ ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کرے، اس کی دلیل وہ صحیح روایت ہے جو پیچھے عقیقے کے بیان کے آغاز میں گزر چکی ہے۔

ساتواں دن یعنی پیدائش کا دن شامل کر کے ساتواں دن (۳) یعنی اگر جمعہ کے دن پیدائش ہوئی ہو تو عقیقہ جمعرات کے دن ہوگا، اگر جمعہ کی رات میں پیدائش ہوئی ہے تب بھی جمعرات کے دن ہی عقیقہ ہوگا، اس لیے کہ یہی دن ساتواں دن ہوتا ہے۔

اور ساتویں روز کی تخصیص اس لیے ہے کہ یہ عین مصلحت کے مطابق ہے۔ ولادت اور عقیقے کے درمیان کچھ فاصلہ ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ پورا گھر زچہ بچہ کی خبر گیری میں مصروف رہتا ہے، تو یہ بالکل مناسب نہیں تھا کہ ایسے وقت میں عقیقے کا حکم دے کر ان کا کام اور بڑھایا جائے۔ نیز بہت سے لوگوں کو اسی وقت بکرے ملنا مشکل ہوتا ہے،

(۲) دیکھیے تحفۃ المودود (ص: ٦٧) اور سبل السلام (۷/ ۳۴۹)۔

(۳) دیکھیے مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب العقیقۃ، باب من قال: یسوی بین الغلام والجاریۃ (۱۲/ ۳۲۵) نیز دیکھیے التمہید لابن عبدالبر (۴/ ۳۱۴)

(۴) دیکھیے المجموع (۸/ ۲۵۰)

تلاش کرنا پڑتا ہے، جس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے، اس لیے پہلے دن اگر عقیقے کا حکم دیا جاتا تو دشواری ہوتی، سات روز کا فاصلہ اچھا خاصا ہوتا ہے، اور اس کو زیادہ بھی نہیں سمجھا جاتا، اس لیے ساتویں دن عقیقہ مقرر کیا گیا(۱)۔

اگر ساتویں دن نہ کر سکے تو چودھویں دن اور چودھویں دن بھی نہ کر سکے تو اکیسویں دن کرنا مستحب ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات مروی ہے۔(۲) واللہ أعلم

اس کے بعد کیا ترتیب ہوگی، اس سلسلے میں صحابہ و تابعین سے کوئی بات مروی نہیں، اس لیے بعض فقہاء نے کہا ہے کہ سابقہ ہفتہ والی ترتیب پر قیاس کرتے ہوئے اٹھائیسویں دن اور پینتیسویں دن اور اسی طرح آگے تک۔ اور بعض دوسرے فقہاء کا کہنا ہے کہ تین ہفتوں کے بعد استحبابی وقت ختم ہو جاتا ہے، اب جب چاہے کرے(۳)

یہ تو ہوا سنت اور مستحب وقت؛ لیکن عقیقے کا وقت تو پیدائش کے بعد سے بلوغ تک رہتا ہے، یعنی پیدائش کے بعد سے بلوغ تک کسی بھی وقت عقیقے کی نیت سے ذبح کرے تو عقیقہ کی سنت ادا ہو جائے گی جیسا کہ تمام فقہاء نے صراحت کی ہے۔

لیکن اگر بلوغ تک اس کا عقیقہ نہ ہوا ہو تو والد کے ذمے سے یہ حکم تاکیدی ساقط ہو جاتا ہے، لیکن کوئی باپ چاہے تو کر سکتا ہے، اسی طرح وہ خود بھی اپنی طرف سے عقیقہ

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ (۲/۳۸۴)۔

(۲) مستدرک حاکم (۴/۲۳۸-۲۳۹) اس سلسلے میں ایک مرفوع حدیث بھی بیہقی نے نقل کی ہے (السنن الکبری للبیہقی (۹/۳۰۳) لیکن اس کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم مکی ہیں، جو اگرچہ فقیہ تھے مگر محدثین نے حدیث میں ان کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن فی الجملہ اس بات کو حضرت عائشہ کی روایت سے قوت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) دیکھیے المجموع ۸/۲۵۰، والمغنی ۱۳/۳۹۶۔

کر کے سنت کا ثواب حاصل کر سکتا ہے، اس لیے اس کو چاہیے کہ اپنا عقیقہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا نبوت کے بعد اپنا عقیقہ کرنا بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے(۱)۔

عموماً فقہاء نے بھی اس کو مستحب لکھا ہے(۲)۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: اگر تمھارا عقیقہ نہیں ہوا تو تم خود اپنا عقیقہ کرو، اگرچہ تمھاری عمر زیادہ ہی کیوں نہ ہو(۳)۔

مشہور تابعی محمد بن سیرین فرماتے ہیں: اگر مجھے معلوم ہو کہ میرا عقیقہ نہیں ہوا تو میں خود اپنا عقیقہ کروں(۴)۔

عقیقے کا جانور:

کیا عقیقے میں بکرا یا بکری ذبح کرنا ہی ضروری ہے؟ یا دوسرا جانور جس کی قربانی جائز ہے، عقیقے میں ذبح کیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں ''شاۃ'' کا لفظ آیا ہے، جس کا ترجمہ اگرچہ اردو والے عموماً بکری سے کرتے ہیں، لیکن اہل لغت نے صراحت کی ہے کہ اس کا اطلاق بکرا،

---

(۱) مصنف عبدالرزاق ۲۵۴/۴ (۳۲۸) بیہقی نے بھی سنن الکبری (۳۰۰/۹) میں اس حدیث کو عبدالرزاق کے طریق سے نقل کیا ہے اور منکر کہا ہے، امام نووی بھی اس حدیث کو باطل قرار دیتے ہیں (المجموع ۲۵۰/۸) وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن محرر ہیں جن کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ لیکن طبرانی نے المعجم الاوسط (۲۸۳/۱ رقم ۹۹۴) میں دوسری سند سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور وہ سند صحیح ہے۔ قال الهيثمي في مجمع الزوائد (۹۵۹/۴) رواه البزار والطبراني في الأوسط، ورجال الطبراني رجال الصحيح خلا الهيثم بن جميل وهو ثقة۔ نیز دیکھیے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ ۵۰۳/۶۔۵۰۵ (۲۷۲۶)۔

(۲) دیکھیے المجموع ۲۵۰/۸ و تحفۃ المودود، ص: ۸۱۔

(۳) دیکھیے المحلی لابن حزم ۳۲۲/۸ (۳۲۲) نیز دیکھیے الاشراف علی مذاہب العلماء لابن المنذر (۴۲۶/۳)۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبۃ ۳۱۹/۱۲۔

بکری، مینڈھا، مینڈھی (دنبہ، دنبی) سب پر ہوتا ہے، اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے عقیقے والی بعض روایتوں میں "کبش" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مینڈھے کے ہوتے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی بھی جانور کو ذبح کرے، عقیقہ مسنون طریقے پر ادا ہو جائے گا، لیکن اگر مینڈھا ملے تو مینڈھا ذبح کرنا افضل ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی طرف سے مینڈھے ذبح کیے تھے، اور ایک قولی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مینڈھا بکرے سے افضل ہے، اور نر مادہ سے افضل ہے۔(۱)

اگر بکرے اور مینڈھے کے علاوہ دوسرا جانور اونٹ یا گائے ذبح کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، کچھ فقہاء کا کہنا ہے کہ بکرا یا مینڈھا ہی صحیح ہے، اس لیے کہ حدیث میں یہی دو لفظ آئے ہیں، دوسرے جانور سے عقیقہ ادا نہیں ہوگا، لیکن اکثر فقہاء کے نزدیک دوسرے جانور سے بھی عقیقہ ادا ہو جائے گا، بعض صحابہ کا بھی یہ عمل نقل کیا جاتا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے بچوں کا عقیقہ اونٹ سے کرتے تھے(۲) اسی طرح حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کا عقیقہ اونٹ ذبح کر کے کیا، اور اہل بصرہ کی دعوت کی۔(۳)

لیکن بہر حال، بکرا بکری یا مینڈھا مینڈھی کرنا ہی افضل ہے۔ حضرت عائشہ رضی

---

(۳) دیکھیے مصنف عبدالرزاق ۴/۲۵۲(۳۲۷)، مسند احمد (۶/۴۲۲) ، السنن الکبریٰ للبیہقی (۹/۳۰۱) مصنف عبدالرزاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات راوی عطاء بن ابی رباح کی ہے، اور یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ بیہقی نے عبدالرزاق ہی کے واسطے سے روایت نقل کی ہے۔ اس میں صراحت ہے کہ عطاء نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ نیز دیکھیے العیال لابن أبی الدنیا، رقم ۶۷۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۱۲/۳۳۰۔ اور ابن المنذر نے نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے لڑکوں کا عقیقہ اونٹ سے کرتے تھے اور لڑکی کا بکری سے۔ (الاشراف علی مذاھب العلماء (۴/۴۱۵ و ۴۱۶)۔

(۳) دیکھیے العیال (رقم ۶۷)

اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ عقیقے میں کوئی اگر اونٹ ذبح کرے تو آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے فرمایا: سنت افضل ہے۔(۱)

تو جن فقہاء نے اونٹ اور گائے سے عقیقے کے جواز کا فتوی دیا ہے ان کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ وہ اس کو قربانی پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح قربانی اونٹ اور گائے سے جائز ہے، اسی طرح عقیقہ بھی جائز ہے۔

ان کی دوسری دلیل غالبًا یہ ہے کہ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں، "مع الغلام عقيقة فأهريقوا عنه دماً" (روایت پیچھے امام بخاری کے حوالے سے گزر چکی ہے) یعنی ہر بچے کے ساتھ عقیقہ ہے، تو تم اس کی طرف سے جانور ذبح کرو، اس میں مطلق جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے وہ تمام جانور ذبح کیے جاسکتے ہیں جن کی قربانی صحیح ہے۔

مذکورہ صحابہ کے عمل سے بھی اس مذہب کی تائید ہوتی ہے۔

بعض شافعی فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ جس طرح قربانی میں افضل جانوروں کی ترتیب ہے یعنی پہلے اونٹ پھر گائے پھر مینڈھا پھر بکرا، عقیقے میں بھی یہی ترتیب ہے، امام نوویؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے(۲)

لیکن یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ حدیث نبوی کی روشنی میں عقیقے میں مینڈھا اور بکرا ہی افضل ہے۔

اور اس میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں کہ قربانی کے جانور میں جو شرائط ہیں، عقیقے کے جانوروں کا بھی اسی طرح ہونا ضروری ہے (۳) یعنی بکرا ہو تو دو سال پورے ہو چکے

(۱) العیال لابن أبی الدنیا، رقم ۵۵، نیز دیکھیے مستدرک حاکم ۴/ ۲۳۸)

(۲) دیکھیے المجموع ۸/ ۴۲۹۔ (۳) بدایۃ المجتہد ۲/ ۸۹۷

ہوں (اور ایک قول کے مطابق ایک سال) اور مینڈھا ہوتو ایک سال پورا ہو چکا ہو (یا ایک قول کے مطابق چھ مہینے)۔ اور ان عیوب سے بھی پاک ہو جن کی وجہ سے قربانی صحیح نہیں ہوتی: یعنی بیمار نہ ہو، کانا اور لنگڑا نہ ہو، ہڈی ٹوٹی ہوئی نہ ہو وغیرہ۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عقیقے میں اونٹ یا گاے ذبح کرے تو اس میں کیا سات بچوں کا عقیقہ ایک ساتھ ہو سکتا ہے یا ایک جانور ایک کی طرف سے ذبح ہوگا؟

اس سلسلے میں فقہاء کے دونوں اقوال ہیں:

امام نوویؒ لکھتے ہیں: اگر گاے یا اونٹ سات بچوں کی طرف سے ذبح کرے یا اس میں ایک سے زیادہ لوگ شریک ہوں تو جائز ہے، خواہ سب کا ارادہ عقیقے کا ہو یا بعض کا عقیقہ ہو اور دوسرے جو شریک ہیں انھوں نے صرف گوشت کے لیے شرکت کی ہو، عقیقے کا بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ قربانی کا ہے(۱)۔

لیکن امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ عقیقہ چوں کہ دراصل بچہ کی جان کا فدیہ ہوتا ہے اس لیے پورا جانور ذبح کرنے کو کہا گیا ہے، اور قربانی میں اشتراک حدیث سے ثابت ہے اور عقیقے میں یہ بات ثابت نہیں ، اس لیے ایک بچے کی طرف سے ایک پورا جانور ہونا چاہیے(۲)۔

اوپر جن صحابہ کا عقیقے میں اونٹ ذبح کرنے کا ذکر کیا گیا ہے ان سے بھی ایک بچے کی طرف سے ایک اونٹ ذبح کرنا ہی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اگر بڑا جانور ذبح کرنا ہو، اس صورت میں ایک بچے کی طرف سے پورا جانور ذبح کرنا ہی مستحب معلوم ہوتا ہے۔

واللہ اعلم

---

(۱) المجموع ۸/۴۲۹

(۲) تحفۃ المودود، ص: ۷۷

عقیقے کے متفرق مسائل:

۱-اگر جڑواں بچے ہوں تو دونوں بچوں کی طرف سے الگ الگ عقیقہ ہوگا۔

۲-عقیقے کی ذمے داری اصلاً باپ پر ہے، باپ کے نہ ہونے کی صورت میں وہ شخص ذمے دار ہے جس کے ذمے بچے کا نفقہ ہے۔اگر نانا، چچا، ماموں، بھائی یا کوئی رشتہ دار بلکہ کوئی اجنبی شخص بھی بچے کی طرف سے عقیقہ کرے تو ادا ہو جائے گا۔(۱)

۳-اگر بچہ یتیم ہے تو امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کے مال سے اس کا عقیقہ کیا جائے گا۔اس کو نقل کر کے علامہ ابن المنذر رلکھتے ہیں کہ اس کا احتمال ہے کہ اس کا عقیقہ نہ کیا جائے، جیسے اس کی طرف سے قربانی نہیں کی جاتی (۲)۔

۴-اگر ساتویں دن سے پہلے بچہ مر جائے تو عقیقے کا حکم ساقط ہو جائے گا، ساتویں دن یا اس کے بعد مر جائے تو سنت باقی رہے گی۔

۵-ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہے: بسم الله اللهم لك وإليك، هذه عقيقة فـــلان (۳)۔یعنی اے اللہ تیرے نام سے ذبح کر رہا ہوں اور تیرے لیے یہ عقیقہ کر رہا ہوں، یہ فلاں کا عقیقہ ہے۔

زبان سے کہنا سنت ہے، لیکن اگر کوئی زبان سے الفاظ ادا نہ کرے اور عقیقے کی دل میں نیت کرے تب بھی کافی ہے۔

---

(۱)ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: تذبح عنه يوم سابعه (جس کی تخریج پیچھے گزر چکی ہے، دیکھیے ص:۸۳) یعنی ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے گا، اس سے مذکورہ مسئلے پر استدلال کیا گیا ہے، دیکھیے نیل الاوطار (۴/۲۲۸) نیز سبل السلام ۷/۳۵۳۔

(۲)الاشراف علی مذاہب العلماء ۳/۴۲۰)۔

(۳)مصنف عبدالرزاق ۴/۲۵۴(۳۲۹) ومسند ابی یعلی (۴/۱۱۳-۱۱۴، حدیث نمبر ۴۵۰۴) والسنن الکبری للبیہقی (۹/۳۰۴)۔

٦-دن کے اول وقت میں ذبح کرنا مستحب ہے۔(١)۔

٧-عقیقے کا گوشت کھانا، کھلانا، رکھنا، صدقہ کرنا، ہدیہ بھیجنا سب جائز ہے، مگر بیچنا جائز نہیں، ان احکام میں عقیقے اور قربانی میں کوئی فرق نہیں، اسی طرح کھال اور دوسری چیزوں کا بیچنا بھی جائز نہیں۔(٢)۔

٨-مستحب ہے کہ عقیقے کے جانور کی کوئی ہڈی بیچ سے نہ توڑی جائے (٣) بلکہ ہڈیاں جوڑوں سے الگ کی جائیں، اس سے بچے کے اعضاء سلامت رہنے کا شگون لیا جاتا ہے(٤)

٩-یہ بھی مستحب ہے کہ جانور کا پاؤں دایہ کو دیا جائے، جس کے ہاتھ بچہ پیدا ہوتا ہے یا جو بچے کی ولادت میں مدد دیتی ہے۔(٥)

---

(١)المجموع ٨/٢٥١۔

(٢)بدایۃ المجتہد ٢/ ٨٩٧ نیز دیکھیے المجموع ٨/٢٥١۔

(٣)ابن ابی شیبہ نے مصنف (١٢/ ٣٢٨) میں اور ابوداود نے کتاب المراسیل (رقم ٣٤٣) میں امام باقر سے یہ حدیث مرسلاً روایت کی ہے، اور بیہقی نے ابوداود کے واسطے سے اس کو روایت کیا ہے(السنن الکبری ٩/٣٠٢) اور اس کی سند صحیح ہے۔حضرت عائشہ اور مشہور تابعی عطاء بن ابی رباح سے بھی یہ بات مروی ہے، اور عطاء کہتے ہیں وہ (صحابہ وتابعین) مستحب سمجھتے تھے کہ عقیقے کے جانور کی کوئی ہڈی نہ توڑی جائے۔(المصنف لابن ابی شیبۃ ١٢/ ٣٢٩) یہ شافعیہ و حنابلہ کا متفقہ مذہب ہے۔امام نووی لکھتے ہیں کہ توڑنا خلاف اولیٰ ہے، توڑنے کی کوئی قابل لحاظ نہی نہیں ہے(المجموع ٨/٤٢٩)۔

(٤)اور بھی حکمتیں اس کی بیان کی گئی ہیں (دیکھیے تحفۃ المودود، ص:٧٥)

(٥)اوپر مذکور روایت میں بھی یہ بات ہے، نیز حاکم نے مستدرک (٤/١٧٩) میں اور بیہقی نے حاکم کے واسطے سے السنن الکبری (٩/٣٠٤) میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمۃ کو حکم دیا کہ حسین کے بال کا وزن دیکھو، اور اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کرو، اور دایہ کو جانور کا پاؤں دے دو۔اور دایا کو کچا پاؤں دینا ہی مستحب ہے۔اور اس کی حکمت یہ نیک شگون ہے کہ بچے کو زندگی ملے اور وہ اپنے پاؤں چل سکے۔(اعانۃ الطالبین ٢/ ٥٢٥)۔

آج کل عموماً ہسپتالوں میں ولادت ہوتی ہے، تو جس لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھ پر بچے کی ولادت ہوئی ہو وہ مسلمان ہے تو اس کو پاؤں بھیج دیا جائے، اگر اس کی ناگواری کا خدشہ ہو تو اس کو سنت بتادی جائے اور اس کے ساتھ کچھ گوشت بھی اس کو ہدیے میں بھیجا جائے تو شاید ناگواری نہیں ہوگی۔

۱۰- عقیقے کا گوشت ہدیے میں بھیجنا ہو یا صدقہ کرنا ہو، بہر صورت، پکا کر دینا مستحب ہے۔(۱)۔ اس کی حکمت ظاہر ہے کہ اس سے مسکینوں اور پڑوسیوں کو پکانے کی زحمت نہیں ہوگی، اور ان کو پکی پکائی چیز ملے گی، جس سے انھیں زیادہ مسرت حاصل ہوگی، اس طرح ان پر زیادہ احسان ہوگا اور نعمتِ الٰہی کا شکر زیادہ ادا ہو جائے گا۔(۲)

گوشت جس طرح چاہیں پکا سکتے ہیں، مگر بہت سے فقہاء نے بچے کے اخلاق کی شیرینی کا شگون لیتے ہوئے مٹھائی کے ساتھ پکانے کو مستحب قرار دیا ہے(۳)

۱۱- گوشت کہیں بھیجے بغیر دعوت کر کے گھر بلا کر بھی کھلانا جائز ہے، یا کچھ بھیجے اور کچھ گھر بلا کر کھلائے، یہ بھی بلا کراہت جائز ہے۔

۱۲- اگر قربانی اور عقیقے کا دن ایک ہی پڑے یا ساتویں دن عقیقہ نہیں ہوا اور قربانی کے دن بچے کی طرف سے قربانی کرے تو عقیقہ ادا ہو جائے گا(۴) جس طرح کوئی دو رکعت نماز پڑھے اور اس میں تحیۃ المسجد کی بھی نیت کرے اور نماز سے پہلے والی سنت کی بھی، تو دونوں کا ثواب مل جائے گا۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات مروی ہے (دیکھیے مصنف ابن ابی شیبۃ ۱۲/ ۳۲۸) اور تمام فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

(۲) تحفۃ المودود، ص: ۷۲-۷۳۔

(۳) المجموع ۸/ ۴۲۹۔

(۴) ایک سے زائد تابعین سے یہ بات مروی ہے، دیکھیے مصنف ابن ابی شیبۃ ۱۲/ ۳۲۹۔

۱۴۳- اگر کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور وہ ساتویں دن عقیقہ کرنا چاہے، مگر دو بکرے کی اس کے پاس طاقت نہ ہو، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد جب دو بکرے خرید سکیں گے اس وقت عقیقہ کرلیں گے، اس کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ تاخیر نہ کرے بلکہ ساتویں دن ایک ہی بکرا ذبح کرے اس سے عقیقہ ہو جائے گا، اس لیے کہ لڑکے کی طرف سے ایک بکرا کرنا بھی حدیث سے ثابت ہے، اور بعض صحابہ اور ائمہ کا یہ مسلک ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ پھر بعد میں ایک اور بکرا عقیقے کی نیت سے ذبح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

چوتھا باب

حلق یعنی سر مونڈنا

ساتویں دن بچے کا سر منڈوانا بھی سنت ہے، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، اور بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کرنا بھی سنت ہے۔

بال منڈوانے کے سلسلے میں متعدد روایتیں وارد ہوئی ہیں، ایک روایت پیچھے گزر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ساتویں دن بچے کا عقیقہ کیا جائے، سر منڈوایا جائے، اور نام رکھا جائے۔ (۱)۔

اور ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بکرا ذبح کر کے حسن کا عقیقہ کیا، اور فاطمہ سے فرمایا کہ اس کا سر منڈواؤ، اور بال کے ہم وزن چاندی صدقہ کرو، انھوں نے وزن کیا تو اس کا وزن ایک درہم یا اس سے بھی کچھ کم تھا (۲)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین کا ان کی پیدائش کے ساتویں دن سر منڈوانے کا حکم دیا، چناں چہ سر منڈوایا گیا، اور بالوں کے ہم وزن چاندی آپ ﷺ نے صدقہ کی۔ (۳)

اور بھی روایتیں اس سلسلے میں وراد ہوئی ہیں (۴) اس سلسلے میں لڑکا اور لڑکی برابر ہیں، جس طرح لڑکے کے بال منڈوانا سنت ہے، اسی طرح لڑکی کے بال منڈوانا بھی سنت ہے (۵)۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے تمام بچوں: حسن، حسین، زینب، ام کلثوم کے

---

(۱) دیکھیے ص: ۸۳۔

(۲) ترمذی (۱۵۱۹)

(۳) المعجم الکبیر للطبرانی (۳/۲۹-۳۰، رقم ۲۵۷۵) والمعجم الاوسط (۱/۵۰ رقم ۱۲۷) والبز ارفی مندہ، رقم (۲۱۷۴)، قال الهيثمي في مجمع الزوائد (۶۰/۴) رواه الطبراني في الكبير والاوسط، و البزار و في اسناد الكبير ابن لهيعة (و كذا في الاوسط و البزار أيضا، فيصل) وإسناده حسن و بقية رجاله رجال الصحيح .

(۴) مثلاً دیکھیے مصنف عبدالرزاق ۴/ ۲۵۶-۲۵۷ (۳۳۲-۳۳۳)

(۵) المجموع ۸/ ۲۵۱

بال منڈوائے تھے اور اس کے ہم وزن چاندی صدقہ دیا تھا(۱)۔

سر منڈوانے کی تاکید اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ متعدد روایتوں میں اس کو گندگی دور کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے(۲)۔

سر مونڈنے کے فوائد:

مزید یہ کہ سر مونڈنے سے کمزور بال ختم ہو کر اس کی جگہ مضبوط بال اگ آتے ہیں، بچے کا سر ہلکا ہو جاتا ہے، سر کے مسامات کھل جاتے ہیں، جس کی وجہ سے آسانی سے مضر اثرات خارج ہو جاتے ہیں، اور تازہ ہوا لگتی ہے جس سے اس کی بصارت، سماعت اور سونگھنے کی قوت بڑھ جاتی ہے(۳)۔

حلق کے متفرق مسائل:

زمانۂ جاہلیت میں لوگ بچے کے سر پر عقیقے کے جانور کا خون ملتے تھے، کرتے یہ تھے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بچے کا عقیقہ کرتے تو روئی کا ٹکڑا عقیقے کے جانور کے خون میں رنگتے، پھر جب بچے کا سر مونڈتے تو خون میں رنگی ہوئی اس روئی کو بچے کے سر پر رکھتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خون کی جگہ زعفران رکھو۔(۴)

اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جاہلیت میں جب ہم میں سے کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ بکرا ذبح کرتا، اور اس کا خون بچے کے سر پر ملتا، اسلام کے

(۱) موطا امام مالک کتاب العقیقۃ (ص:۲۵۴)، وکتاب المراسیل لأبي داود (رقم ۳۴۴) والسنن الکبری للبیہقی (۹/۵۱۱) یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے مگر دوسری روایتوں میں مطلقاً بچے کا سر منڈوانے کا حکم دیا گیا ہے، ان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۲) مثلاً دیکھیے، ابوداود (۲۸۳۸) وترمذی (۱۵۲۲) وغیرہ۔

(۳) دیکھیے تحفۃ المودود، ص:۶۹-۷۰۔

(۴) مسند ابی یعلی ۴/۱۱۴ (۴۵۰۴)، مسند البزار (کشف الاستار ۲/۷۵، رقم ۱۲۳۹) وصحیح ابن حبان (۱۲/۳۰۸) والسنن الکبری للبیہقی (۹/۳۰۳)۔

آنے کے بعد ہم ایسا کرنے لگے کہ بکرا ذبح کرتے اور بچے کا سر مونڈتے اور اس کے سر پر زعفران ملتے (۱)۔

خون بالکل گندی اور نجس چیز ہے، اور لوگ اس کے عادی تھے، رسول اللہ ﷺ نے بدل کے طور پر زعفران جیسی چیز تجویز فرمائی، جس کا رنگ بھی اچھا ہوتا ہے، اور خوشبو بھی عمدہ ہوتی ہے، اس لیے کوئی ایسی خوشبودار چیز بچے کے سر پر ملے تو کوئی حرج نہیں، بلکہ اکثر فقہاء نے اس کو مستحب لکھا ہے (۲)۔

(مسئلہ) بال ادھر ادھر پاوں کے پاس نہ ڈالے جائیں بلکہ زمین میں دفن کیے جائیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کا ساتویں دن عقیقہ کرنے کے بعد سر منڈوایا اور بال کے ہم وزن چاندی مسکینوں کو دی، اور بال زمین میں دفن کرنے کا حکم دیا (۳)۔

(مسئلہ) ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچی کا سر پہلی دفعہ کے بعد منڈوانا کیسا ہے؟ اس سلسلے میں کوئی حدیث یا صحابہ وتابعین کا کوئی عمل منقول نہیں، نہ قدیم فقہاء کی کوئی صراحت نظر سے گزری، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً تو عورت کے سر پر ہمیشہ بال ہونے چاہیے، یہ عورت کی زینت ہے اس لحاظ سے بچی کا سر بھی دوبارہ نہیں منڈوانا چاہیے، لیکن بال منڈوانے سے پورے اور مضبوط بال آتے ہیں، جو مطلوب ہے، اس لیے بالکل بچپنے میں بچی کے سر کے بال دو چار دفعہ اور بال کم ہونے کی صورت میں اس سے زیادہ

---

(۱) ابوداود (۲۸۴۳) مستدرک حاکم (۲۳۸/۴) وسنن البیہقی ۳۰۲/۹-۳۰۳۔ حضرت عائشہ کی روایت میں خلوق کا لفظ ہے، یہ ایک خوشبو ہوتی ہے جس کا بیشتر حصہ زعفران ہوتا ہے۔

(۲) دیکھیے المجموع ۳۵۱/۸۔

(۳) دیکھیے تحفۃ المودود، ص: ۹۴و۹۵۔

منڈ وائے جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا، واللہ اعلم۔

(مسئلہ) سر کب منڈوانا چاہیے، عقیقے سے پہلے یا عقیقے کے بعد؟ حدیث میں تو ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کیا جائے اور سر منڈوایا جائے، یعنی یہ دونوں کام ساتویں دن ہوں، اس لحاظ سے عقیقہ پہلے ہو یا حلق (سر منڈوانا) سنت بہر حال ادا ہو جائے گی، لیکن حدیث میں پہلے عقیقہ کا ذکر ہے پھر حلق کا، اس لیے اکثر فقہاء کے نزدیک پہلے عقیقہ کرنا مستحب ہے پھر حلق، اور ترمذی کی ایک روایت بھی جو پہلے گزر چکی ہے، اس کی تائید کرتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا عقیقہ کیا اور پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بچے کا سر منڈ واؤ۔

(مسئلہ) قزع (یعنی سر کا کچھ حصہ منڈوانا اور کچھ حصہ بغیر منڈوائے چھوڑ دینا) ممنوع ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے(۱)۔ قزع کی خواہ کوئی شکل ہو، بیچ سے منڈوا کر بقیہ سر چھوڑ دے یا پورا سر منڈوا کر بیچ میں چھوڑ دے جیسا کہ ہندو کرتے ہیں، یا پیچھے کا حصہ چوٹی کے طور پر چھوڑ دے اور پورا سر مونڈ دے، یا ادھر ادھر سے کچھ کچھ مونڈ دے، بہر صورت یہ ممنوع ہے۔ یہ سر کے ساتھ ظلم ہے، فطرت انسانی کے خلاف ہے، اور اللہ کی خلقت کے ساتھ مذاق ہے۔ عمر کے کسی مرحلے میں ہو، یہ ممنوع ہے، اور اس کی بعض صورتیں ہندوؤں کے مشابہ ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اس کی حرمت اور بڑھ جائے گی۔ اسی طرح بال اس طرح کٹوانا کہ سر کے کچھ بال اتنے چھوٹے ہوں کہ منڈانے کی طرح معلوم ہوں اور پورے سر کے بال بڑے ہوں، جیسا کہ آج کل فیشن کے طور پر بعض شکلیں اس طرح کی رائج ہوگئی ہیں، یہ بھی ممنوعہ صورت سے قریب ہے، لہذا بال کٹوانے کی ان تمام شکلوں سے ایک مسلمان کو پرہیز کرنا چاہیے۔

---

(۱) بخاری (۵۹۲۰، ۵۹۲۱) ومسلم (۲۱۲۰)

بچے کے بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کرنا:

جب بچے کے بال منڈوائے جائیں تو ان کے ہم وزن چاندی صدقہ کرنا بھی سنت ہے، جیسا کہ حلق کے آغاز میں ذکر کی ہوئی حضرت علی اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی روایتوں میں اس کا تذکرہ ہے۔ نیز حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ اس کے سر کے بال منڈواؤ، اور اس کے ہم وزن چاندی اللہ کے راستے میں صدقہ کرو، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پیدائش پر بھی انھوں نے یہی کیا۔(۱)

اور بھی روایتوں سے یہ ثابت ہے۔ یہ مستقل سنت ہے، اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

چاندی صدقہ کرنے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بچے کا ماں کے پیٹ کا مرحلہ پورا کر کے دنیا میں قدم رکھنا ایک نعمت ہے جس کا شکرادا کرنا ضروری ہے۔ اور بہتر طریقے سے شکر اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اس کے بدلے کچھ دیا جائے، تو جب یہ بال پیٹ کی زندگی کا بقیہ نشان تھے تو اس کو دور کرنا نئے بچے کی مستقل زندگی شروع ہونے کی نشانی ہے، اس لیے بہتر سمجھا گیا کہ ان کے بدلے میں شکریے کے طور پر چاندی صدقہ کی جائے۔

اگر چاندی کے بجاے اس کے برابر روپے صدقہ کریں تو یہ سنت ادا ہو جائے گی، بلکہ یہی بہتر معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس وقت سکے چاندی (یا سونے) کے ہوتے تھے، اب اس کا بدل روپے ہیں، اور روپے دینا ہی مقصود ہے، چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بات گزر چکی ہے کہ بالوں کا وزن کیا گیا تو ایک درہم کے برابر نکلا یا اس سے بھی کچھ کم۔

---

(۱) احمد ۶/ ۳۹۰-۳۹۱، وابن أبی شیبہ (۳۱۹/۲۳) والطبرانی فی الکبیر رقم ۹۱۷، وابن أبی الدنیا فی العیال رقم ۵۲، والبیہقی فی السنن الکبری (۳۰۴/۹)۔

(۲) حجۃ اللہ البالغہ (۳۸۵/۲)۔

پانچواں باب

بچوں کے نام رکھنے کا بیان

فصل اول

نام کب رکھا جائے

اس سلسلے میں دوطرح کی روایتیں ہیں: بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پہلے دن نام رکھتے تھے، اور دوسری روایتوں سے ساتویں دن نام رکھنا مستحب معلوم ہوتا ہے(۱)۔

پہلے قسم کی روایتیں یہ ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت گزر چکی ہے کہ ان کے بھائی عبداللہ کے پیدا ہونے پر وہ اس کو حضور ﷺ کے پاس لے گئے حضور ﷺ نے بچے کی تحنیک کی اور عبداللہ نام رکھا(۲)۔

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: کہ میرے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی، میں اس کو حضور ﷺ کے پاس لے گیا، آپ ﷺ نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور چبا کر اس کے منھ میں رکھی(۳)۔

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ابواسید کو بچہ ہوا تو وہ اس کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس روایت میں آگے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ابواسید سے پوچھا کہ بچے کا نام کیا (رکھا) ہے؟ انھوں نے بتادیا، حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ اس کا نام منذر ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس وقت منذر

(۱) اور ایک تیسری روایت حضرت انس سے یہ مروی ہے کہ تیسرے دن نام رکھا جائے (تحفۃ المودود ص ۹۳)۔

(۲) دیکھیے ص: ۷۷۔

(۳) بخاری (۵۴۶۷) مسلم (۲۱۴۵)۔

اس کا نام رکھا(۱) اور خود حضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا، رات مجھے ایک بچہ پیدا ہوا، میں نے اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے نام پر اس کا نام ابراہیم رکھا۔(۲)۔

اور عقیقے کے بارے میں حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ ساتویں دن بچے کا عقیقہ کیا جائے، سر منڈوایا جائے اور نام رکھا جائے (۳) اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ساتویں دن بچے کے نام رکھنے، سر منڈوانے اور عقیقہ کرنے کا حکم دیا(۴)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین کا ساتویں دن عقیقہ کیا اور ان کے نام رکھا اور ان کے بال منڈوانے کا حکم دیا(۵)۔

اسی طرح متعدد صحابہ وتابعین سے ساتویں دن بچے کا عقیقہ کرنے، سر منڈوانے اور عقیقہ کرنے کی روایتیں مروی ہیں(۶)۔

لیکن سند کے لحاظ سے پہلے دن نام رکھنے والی روایتیں زیادہ قوی ہیں۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ یہ روایتیں پہلی روایتوں (جوانھوں نے ساتھویں دن نام رکھنے کے بارے میں ذکر کی ہیں) کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہیں(۷)۔

دونوں طرح کی روایتوں کے درمیان تطبیق کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ

---

(۱) بخاری(۶۱۹۱) ومسلم(۲۱۴۹)۔ (۲) مسلم(۲۳۱۵)۔

(۳) دیکھیے ص:۱۰۴۔ (۴) ترمذی(۲۸۳۲)۔

(۵) مستدرک حاکم (۴/۲۳۷) وصحیح ابن حبان (الاحسان ۱۲/۱۲۷) یہ حدیث صحیح ہے حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، نیز حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کو صحیح قرار دیا ہے(۱۲/۴۰۱)۔

(۶) دیکھیے مصنف عبدالرزاق ۴/۲۵۶-۲۵۷ (۳۳۲-۳۳۳) ومصنف ابن ابی شیبۃ (۱۲/۳۲۶-۳۲۷)۔

(۷) انھوں نے السنن الکبریٰ میں یہ باب قائم کیا ہے باب تسمیۃ المولود حین یولد، وماجاء فیہ أصح مما مضیٰ (۹/۳۰۵)۔

پہلے دن والی تمام روایتوں کا تعلق حضور ﷺ کے عمل سے ہے اور ساتویں دن والی اکثر روایتیں آپ ﷺ کے قول سے تعلق رکھتی ہیں، اور محدثین کے اصول کے مطابق قولی وفعلی روایتوں کے درمیان تعارض ہو جائے تو قولی روایتوں کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لحاظ سے ساتویں دن نام رکھنا افضل ہوگا۔

مگر امام بخاریؒ نے جو تطبیق دی ہے وہ نہایت لطیف ہے اور ان کی فقاہت کی دلیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس بچے کا عقیقہ کرنا نہ ہو اس کا نام پہلے ہی دن رکھا جائے اور جس بچے کے عقیقے کا ارادہ ہو تو ساتویں دن عقیقے کے ساتھ اس کا نام رکھا جائے (۱)

اور یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نام رکھے پھر عقیقہ کرے (۲)۔

(مسئلہ) اگر بچہ نام رکھنے سے پہلے مر جائے تب بھی اس کا نام رکھنا مستحب ہے (۳)۔

---

(۱) امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب العقیقہ کے شروع میں یہ باب باندھا ہے "باب تسمية المولود غداة يولد لمن لم يعق عنه" حافظ ابن حجر امام بخاری کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جس کے عقیقے کا ارادہ نہ ہو اس کا نام رکھنے میں ساتویں دن کا انتظار نہ کیا جائے (بلکہ پہلے دن رکھا جائے) جیسا کہ ابوموسیٰ کے صاحبزادے ابراہیم، ابوطلحہ کے صاحبزادے عبداللہ، اور خود حضور ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم اور عبداللہ بن زبیر کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے، ان میں سے کسی کے بارے میں منقول نہیں ہے کہ ان کا عقیقہ ہوا ہے (رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم کے عقیقے کے سلسلے میں جو ایک روایت گزر چکی ہے، اس کی سند کا پتہ نہیں (فیصل)) اور جس کا عقیقہ کرنے کا ارادہ ہو اس کا نام ساتویں دن رکھا جائے جیسا کہ دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے، یہ ایک لطیف تطبیق ہے جو امام بخاری کے علاوہ کہیں نظر نہیں آئی وهو جمع لطيف لم أره لغير البخاري (فتح الباری ۱۲/۳۹۹)

(۲) اس لیے کہ اس سے عقیقے کی تعیین میں آسانی ہوگی، بالخصوص جڑواں بچوں یا ایک دن پیدا ہونے والے بچوں کے ایک ساتھ عقیقے کی صورت میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے، اگرچہ ابن المنذر نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ پہلے عقیقہ کرے پھر نام رکھے (الاشراف علی مذاهب العلماء لابن المنذر (۴/۴۱۹))۔

(۳) المجموع ۸/۴۵۳، الاذکار ص ۵۱۶۔

(مسئلہ) اگر ناتمام بچہ (گربھ) پیدا ہو جائے اس وقت بھی نام رکھنا مستحب ہے متعدد تابعین سے یہ بات مروی ہے(۱)۔

اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچہ اتنا ناتمام ہو اور اس کے پورے اعضا نہ بنے ہوں اور نر یا مادہ ہونے کا پتا نہ چلے، اس وقت کیا نام رکھا جائے، امام نووی فرماتے ہیں کہ کوئی ایسا نام رکھا جائے جو مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے مناسب ہو(۲)۔

پھر انھوں نے مثال کے طور پر چند نام نقل کیے ہیں، جو عربوں میں مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے رکھے جاتے تھے، ہمارے برصغیر کے ماحول کے لحاظ سے مثلاً نسیم، شمیم، صبا، تحسین، تسلیم، اختر، دلشاد، افنان، شاہین وغیرہ نام رکھے جاسکتے ہیں۔

(۱) المجموع ۸/۲۶۲، اس مسئلے میں امام مالک کا اختلاف ہے وہ کہتے ہیں جب تک بچہ پیدا ہو کر آواز نہ نکلے نام نہیں رکھا جائے گا۔

(۲) الأذکار ص ۵۱۶۔

فصل دوم

نام کی اہمیت اور اچھے نام کی ترغیب

نام کا مسئلہ بہت اہمیت کا حامل ہے، یہ آدمی کی پہچان، اس کے دین و مذہب کا نشان، اس کی شخصیت کا پاسبان اور اس کے والد کے جذبات کا ترجمان ہوتا ہے، اسی لیے شریعت نے باپ ہی کو نام رکھنے کا حق دیا ہے، تاکہ کوئی اس کے بچے کا ایسا نام نہ رکھے جس سے اس کے باپ کی بے عزتی ہو، یا اس کو شرمندگی کا احساس ہو، اور پھر ہر شخص کو دنیا کے اسی نام سے باپ کے نام کے ساتھ آخرت میں پکارا جائے گا جہاں خلائق کے سامنے عزت یا خدانخواستہ بے عزتی ہوگی، لہذا ہر باپ کو چاہیے کہ وہ سنجیدگی سے نام کے مسئلے کی اہمیت کو سمجھے، اسلام نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیمات سے اس کے بارے میں ساری تفصیلات بیان کردی ہیں اور اپنے عمل و کردار سے اس کی ساری مشکلات حل کردی ہیں۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم قیامت کے دن اپنے نام اور اپنے باپ کے نام سے پکارے جاؤ گے، لہذا نام اچھے رکھو(۱)

پس ہر باپ اور گھر کے ہر ذمے دار کو چاہیے کہ اپنے بچوں کے لیے اچھے سے اچھے

(۱) مسند احمد ۵/۱۹۴، ابوداود (۴۹۴۸) صحیح ابن حبان (۵۸۱۸)، بہت سے محدثین کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند میں انقطاع ہے، یعنی ابوالدرداء سے روایت کرنے والے راوی عبداللہ بن أبی زکریا کی ان سے ملاقات ثابت نہیں، ابوداود نے خود حدیث نقل کرنے کے بعد اس کی صراحت کی ہے، مگر اس کے باوجود امام نووی نے الاذکار میں (ص ۵۱۶) اور (المجموع (۸/۲۵۳) میں اور ابن قیم نے تحفۃ المودود میں (ص ۹۹) اس کی تحسین کی ہے، اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں اس کو روایت کیا ہے، امام نووی فرماتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی زکریا نے حضرت ابودرداء سے روایت سنی ہے، لیکن امام بیہقی اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کو ان سے سماع حاصل نہیں ہے (المجموع محولۂ بالا)

ناموں کا انتخاب کرے، جس سے کم سے کم اس کے دین کی شناخت تو باقی رہے، جب فرانسیسی حکومت اپنے مخصوص نام رکھنے کے لیے قانون بناسکتی ہے، تاکہ یہ بچے اپنی تاریخ سے دور نہ ہوں اوران کی وطنی روح مجروح نہ ہو، جب بلغاریہ اور تھائی لینڈ وغیرہ میں مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہو کہ اپنے اسلامی نام نہ رکھیں، یا اس کے ساتھ قومی ناموں کا اضافہ کریں تو ہم مسلمانوں کو جن کا دین ہی حق، نجات دہندہ اور دنیا وآخرت کی کامیابیوں کا ضامن ہے، اپنے ناموں کے بارے میں زیادہ حساس ہونا چاہیے، اور کسی حال میں اسلامی پہچان والے ناموں سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے۔ اور چوں کہ ناموں کا اثر پڑتا ہے، اس لیے بھی اچھا نام رکھنا چاہیے، پس عوام کو بچوں کے نام رکھنے کے سلسلے میں علماء سے رجوع کرنا چاہیے۔

فصل سوم
نام رکھنے کے آداب

۱۔سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ نام ایسی چیز ہے جو زندگی بھر اس شخص کے ساتھ لگی رہے گی، یہ کوئی کپڑا نہیں ہے کہ آج پہن لیا،کل اتار دیا، جب کہ اس کے لیے بھی بہت اہتمام کیا جاتا ہے، اس لیے اچھے سے اچھا نام رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے،جس کا مفصل بیان آگے آرہا ہے۔

۲۔جہاں تک ممکن ہو نام زیادہ لمبے نہ ہوں۔

۳۔نام ایسے ہوں جو آسانی سے زبان پر چڑھتے ہوں۔

۴۔نام ایسے ہوں کہ سننے والا سنتے ہی سمجھ سکے کہ یہ نام کیا ہے۔

۵۔نام سنتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ کسی مسلمان کا نام ہے(۱) یہ عام آداب ہیں۔ ہر معاشرے کے لحاظ سے اس کی رعایت ہونی چاہیے، کسی نبی یا صحابی کا نام کسی معاشرے میں اجنبی ہو تو اس نام کو وہاں رواج دینے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ لوگ اس سے واقف ہوں، لیکن انبیاء یا صحابہ میں سے کوئی نام کسی معاشرے کی جہالت اور دین سے دوری کی وجہ سے ان کے لیے اس کو ادا کرنا مشکل ہو رہا ہو اور اس کو بگاڑ کر بولتے ہوں، تو ایسے معاشرے میں ان ناموں سے احتیاط کرنی چاہیے، تاکہ ان کی بے حرمتی نہ ہو، انبیاء کے ناموں میں اس کا اور زیادہ خیال رکھنا چاہیے مثلاً زکریا، اگر کہیں لوگ اس کو جکریا بولتے ہوں تو وہاں یہ نام نہیں رکھنا چاہیے۔

(۱) دیکھیے تسمیۃ المولود، شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید،ص ۱۷، (الیکٹرانک ایڈیشن)

فصل چہارم

سب سے اچھے اور پسندیدہ نام

سب سے بہتر نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں اور اسی طرح وہ تمام نام جو اللہ کے اسمائے حسنیٰ کی طرف عبد کی اضافت کے ساتھ رکھے جائیں، جیسے عبدالحی، عبدالخالق، عبد الباری، عبدالرزاق وغیرہ۔ اس سے بندہ کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ صرف اللہ کا بندہ ہے، اسی کی بندگی اور عبادت کے لیے پیدا ہوا ہے، اور اسی کی بندگی ہمیشہ کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا تمھارے ناموں میں اللہ کے نزدیک سب سے محبوب اور پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں (۱)۔ آپ صلی اللہ نے ایک آدمی سے فرمایا کہ اپنے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھو (۲)

انبیاء علیہم السلام کے نام رکھنے کی ترغیب:

اس طرح کے ناموں کے بعد سب سے افضل نام انبیاءے کرام علیہم السلام کے نام ہیں، بعض حدیثوں سے بھی اس کی تاکید معلوم ہوتی ہے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: تسموا بأسماء الانبیاء (انبیاء کے نام رکھا کرو) (۳)۔

حضرت سعید بن المسیبؒ یہاں تک فرماتے ہیں کہ اللہ کو سب سے محبوب نام انبیاء کے نام ہیں (۴) ظاہر ہے کہ اس سے مراد عبداللہ، عبدالرحمٰن وغیرہ ناموں کے بعد

(۱) صحیح مسلم (۲۱۳۲)۔ (۲) بخاری (۶۱۸۶) وصحیح مسلم (۲۱۳۳)۔

(۳) احمد (۴/۳۴۵)، ابوداؤد (۴۹۵۰)، نسائی، (۳۵۶۵) اس حدیث پر محدثین نے کچھ کلام کیا ہے، لیکن انبیاء کے نام رکھنے کی فضیلت دوسری روایتوں سے معلوم ہوتی ہے۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبۃ (۱۳/۲۴۶)۔

ہے۔ بعض تابعین، انبیاء کے نام رکھنا بے حرمتی کے خدشے سے ناپسند کرتے تھے، چناں چہ ابوالعالیہ فرماتے ہیں: تم اپنے بچوں کے نام انبیاے کرام کے ناموں پر رکھتے ہو، پھر ان پر لعنت کرتے ہو(۱)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک بھی یہی نقل کیا جاتا ہے(۲) لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ خود آپ ﷺ نے اپنے صاحبزادے کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر ابراہیم رکھا، اور بخاری و مسلم کی یہ روایت بھی ایک سے زائد دفعہ گزر چکی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بیٹے کا نام بھی آپ ﷺ نے ابراہیم رکھا، اسی طرح حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے یوسف کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا نام یوسف رکھا (۳) اور دسیوں صحابہ نے آپ ﷺ کی زندگی میں، اور آپ ﷺ کے بعد اپنی اولاد کے نام انبیاء کے ناموں پر رکھے (۴) حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ ان کے سات بیٹے تھے اور سب کے نام انبیاء کے ناموں پر تھے (۵)۔

رسول اللہ ﷺ کے نام رکھنے کی فضیلت اور اس کی برکت:

متعدد روایتیں وارد ہوئی ہیں، جن میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے نام پر نام

---

(۱) ایضاً ۱۳/۲۴۵۔

(۲) دیکھیے الروض الأنف للسہیلی (۲/۶۸)۔

(۳) الادب المفرد (رقم ۸۶۱) اور اس کی سند صحیح ہے (فتح الباری (۱۴/۷۲)۔

(۴) دیکھیے المجموع ۸/۱۵۳۔

(۵) دیکھیے المعجم الکبیر (۱۹/۲۴۲) علامہ ابن قیمؒ نے تاریخ ابن أبی خیثمہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے دس لڑکے تھے اور سب کے نام انبیاء کے ناموں پر تھے (تحفۃ المودود، ص ۱۱۰) لیکن ابن أبی خیثمہ کی تاریخ میں یہ بات نہیں ملی جب کہ وہ واقعہ جو ابن قیمؒ نے اس کے بعد ذکر کیا ہے وہ تاریخ ابن أبی خیثمہ میں موجود ہے (دیکھیے ص ۲۹۲)۔

رکھو، مگر میری کنیت اختیار نہ کرو(۱) یہاں ایک لمبی علمی بحث ہے(۲) کہ آپ ﷺ کی کنیت اختیار کرنے کا کیا حکم ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی کنیت ''ابوالقاسم'' اس شخص کو اختیار کرنا ممنوع ہے جس کا نام محمد ہے۔

اس کے علاوہ محمد اور احمد نام رکھنے کی فضیلت کے سلسلے میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے(۳) مگر اس کے لیے روایت کی کیا ضرورت؟ یہی کیا کم ہے کہ یہ سیدالاولین والآخرین امام المتقین، خاتم النبین، فخرِ موجودات، حبیبِ ربِ کائنات حضرت محمد ﷺ کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی ہے، اسی لیے آپ ﷺ کی زندگی میں اور آپ کے بعد کئی صحابہ نے اپنے بچوں کے نام محمد رکھے، جن میں مشہور صحابہ میں حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابی بن کعب، حضرت کعب بن مالک، حضرت جعفر، حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم ہیں، ان تمام حضرات کے بچوں کے نام محمد تھے، ان میں سے بعض نام خود آپ ﷺ کے رکھے ہوئے تھے، ان کے علاوہ بعض دیگر بچوں کا نام بھی آپ ﷺ نے اپنے نام پر محمد رکھا(۴)۔

تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ ''محمد'' نام رکھنے کا زمانہ جاہلیت میں رواج نہیں

---

(۱) یہ روایتیں متعدد صحابہ حضرت ابوہریرہ، حضرت انس اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ دیکھیے بخاری(۶۱۸۷، ۶۱۸۸، ۶۱۸۹، ۲۱۲۰) ومسلم(۲۱۳۳، ۲۱۳۴)

(۲) چوں کہ ہمارے برصغیر میں کنیت کا مسئلہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اس لیے یہ بحث چھیڑنا فضول ہے۔ تفصیل کے لیے اہل علم مراجعت کریں: تحفۃ المودود لابن قیم ص ۱۱۶-۱۲۰، زادالمعاد ۳/۳۴۴-۳۴۸، فتح الباری ۱۴/۶۳-۶۶، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ سموا باسمی ولا تکنوا بکنیتی

(۳) ابن بکیر البغدادی (متوفی ۳۸۸ھ) نے ایک کتاب لکھی ہے ''فضائل من اسمہ محمد واحمد'' جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکی ہے، اس میں چھبیس حدیثیں ہیں جن میں سے کوئی حدیث صحیح نہیں ہے(دیکھیے تسمیۃ المولود، ص ۱۶)۔

(۴) دیکھیے الاصابہ ۵/۷۳، ۸۰، ۸۲، ۹۰، ۹۲، ۹۳۔

تھا، یہاں تک کہ جب آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کا نام ''محمد'' رکھا تو لوگوں کو اس نئے نام پر تعجب ہوا تھا، ہاں بعثت کے قریب زمانے میں اہل کتاب سے ''محمد'' نام کے ایک نبی کی حجاز میں بعثت کی خبر سن کر کچھ لوگوں نے اپنے بچوں کے نام محمد رکھے تھے، لیکن آپ کی بعثت کے بعد آپ کی برکت سے اس کثرت سے لوگوں نے محمد نام رکھے کہ حیرت ہوتی ہے، حافظ ابن حجر نے الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ میں ایک سو تیس کے قریب محمد نام کے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، جن میں سے بیشتر حضرات کا تعلق نوعمر صحابہ سے ہے، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ محمد نام کے جتنے عظیم، جینیس (Genius) اور مشہور لوگ تاریخ میں گزرے ہیں اتنے کسی اور نام کے نہیں (۱)۔

اور آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ افراد محمد نام کے پائے جاتے ہیں، GUINNESS WORLD RECORD کے مطابق اس وقت سات کروڑ آدمی محمد نام کے دنیا میں موجود ہیں دنیا بھر میں جو کسی ایک نام کے سب سے زیادہ افراد ہیں (۲)۔

---

(۱) اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ مشہور تذکرہ نگار خیرالدین زرکلی کی کتاب الأعلام (جو زمانۂ جاہلیت سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک مشاہیر اور عظیم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا ہے) کی آٹھ جلدوں میں سے ڈیڑھ سے زائد جلدیں (چھٹی جلد مکمل، ساتویں تقریباً آدھی اور پانچویں کا کچھ حصہ) محمد نام کے مشاہیر کے تذکروں پر مشتمل ہے، جن میں سے دوسو اکیاسی (۲۸۱) شخصیات ایسی ہیں جن کے باپ کا نام بھی محمد ہے، اور ان میں ستاون (۵۷) مشاہیر تو ایسے ہیں جن کے باپ کے نام کے ساتھ دادا کا نام بھی محمد ہے جن میں مشہور متکلم عالم وفقیہ حجۃ الاسلام امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) مشہور سیرت نگار ابن سید الناس (متوفی ۷۳۴ھ) مشہور عربی شاعر ابن نباتہ (متوفی ۷۶۸ھ) سید القراء امام ابن الجزری (متوفی ۸۳۳ھ) مشہور مورخ ابن فہد مکی (متوفی ۸۷۱ھ) مشہور فقیہ ابن امیر حاج (متوفی ۸۷۹ھ) مشہور تذکرہ نگار نجم الدین الغزی (متوفی ۱۰۶۱ھ) بھی شامل ہیں۔

(۲) اگر بہت نیچے اتر کر کل مسلم آبادی ایک ارب ساٹھ کروڑ بھی مانیں، اور اس میں تقریباً آدھی عورتوں کو الگ کریں، تو یہ مبارک نام تقریباً دس فیصد مسلمانوں کا ہوگا۔

برطانیہ اور فرانس میں مسلمان سب سے زیادہ محمد نام رکھتے ہیں، یہاں تک کہ یہاں کے تمام انگریزی ناموں کے مقابلے میں بھی یہ نام سب سے آگے ہے، چناں چہ BRITISH NATIONAL STATISTICS OFFICE کی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۶ء کے دوران انگلینڈ اور ویلز میں ۴۲۵۵ بچوں کے نام محمد رکھے گئے جو وہاں کے سب سے پسندیدہ اور رائج نام جورج سے بھی تجاوز کر گیا جب کہ جورج ۳۳۸۶ بچوں کے نام رکھے گئے۔

اور گزشتہ سال (۲۰۰۷ء) میں برطانیہ میں محمد نام کے بچوں کی تعداد چھ ہزار سے بڑھ گئی (۱)۔

بہر حال، یہ سب سے مبارک ہستی کا نام ہے، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ کثرت سے اپنے بچوں کے نام محمد رکھیں، اسی طرح احمد بھی حضور ﷺ کا حقیقی نام ہے، اس لیے اس کی برکتوں سے بھی مالا مال ہو جائیں۔

لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ جس شخص کا نام محمد یا احمد ہو، بلکہ کسی نبی کے نام پر جس کا نام ہو، اس کے نام کا احترام کرنا چاہیے، اس نام کے ساتھ اس کو برا بھلا نہ کہیں، لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے اور ان ناموں کی بے حرمتی کرتے ہیں، مثلاً مذمت کے وقت اس طرح نہ کہیں کہ یہ محمد ایسا ہے ویسا ہے، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی نبی کے نام پر نام رکھنے سے منع کرتے تھے، انھوں نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ ان کے بھتیجے محمد بن زید بن

(۱) فرانس میں محمد نام کے افراد کے سلسلے میں اسلام آن لائن کے نامہ نگار نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ مرکب ناموں میں جو محمد ہوتا ہے جیسے محمد علی، ایسے نام اس حساب سے خارج ہیں، اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر ایسے نام اس فہرست میں شامل کیے جائیں (اور بالخصوص ہندوستان میں جہاں تقریباً آدھے لوگوں کے ناموں کے ساتھ محمد شامل ہے) تو پھر محمد نام کے افراد کی کل تعداد کا شاید صحیح حساب بھی نہ لگایا جا سکے۔ یہ بھی ہے ورفعنا لك ذكرك (اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کر دیا) کی ایک تفسیر۔ صلی اللہ علی الحبیب المصطفی محمد۔

الخطاب سے کہہ رہا تھا، یا محمد فعل الله بك وفعل (اے محمد! اللہ تجھے سمجھے) انھوں نے اپنے بھتیجے کو بلایا اور کہا، میں نہیں دیکھ سکتا کہ تمھاری وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہا جا رہا ہو، اور انھوں نے ان کا نام تبدیل کر دیا۔ اور ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص محمد بن عبدالحمید کو اس طرح گالی دے رہا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے کو بلوا کر مذکورہ بات فرمائی اور اس کا نام بدل کر عبدالرحمٰن رکھ دیا، اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے لڑکوں کو بلا بھیجا، تا کہ ان کے نام بدل دیں وہ سات لڑکے تھے (اور سب کے نام نبیوں کے نام پر تھے) محمد بن طلحہ سب سے بڑے تھے، انھوں نے عرض کیا، خدا کی قسم خود رسول اللہ ﷺ نے میرا نام محمد رکھا ہے، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو پھر جاؤ، تب تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے نام پر نام رکھنے کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو خیال تھا اس سے رجوع کر لیا تھا (۱) لیکن بہرحال، وہ ان ناموں کا احترام ضروری سمجھتے تھے۔

صالحین کے ناموں پر نام رکھنا:

انبیاء کرام کے بعد صالحین کے نام سب سے افضل ہیں، ایک حدیث سے بھی صالح لوگوں کے نام پر نام رکھنے کی فضیلت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا کہ وہ لوگ انبیاء اور گزرے ہوئے صالح لوگوں کے ناموں پر نام رکھتے تھے (۲) اور ان صلحائے امت کے سرگروہ صحابۂ کرام ہیں؛ اس لیے ان کے نام رکھنا چاہیے، اول تو یہ سارے نام آپ ﷺ کے سامنے تھے، اور جو ان میں نامناسب تھے وہ آپ نے تبدیل کر دیے تھے، اس کا مطلب یہی ہوا کہ جو باقی رکھے وہ آپ ﷺ کے پسند

(۱) اس تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری ۱۴/ ۶۴۔

(۲) مسلم (۲۱۳۵)۔

فرمودہ تھے، اور پھر یہ کہ ناموں کا اثر پڑتا ہے، تو امید کی جانی چاہیے کہ اس سے ان کے صلاح وتقوے کا اثر ان بچوں میں منتقل ہوگا، اور نام رکھتے وقت یہ نیت ہوگی اور اللہ سے امید ہوگی تو انشاء اللہ یہ اثر ظاہر ہوکر رہے گا۔ صحابہ اور صلحاے امت کے ناموں پر نام رکھنے کی افضلیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے ان کے نام محفوظ ہوں گے، جب بہت سے لوگ یہ نام رکھیں گے اور ان کا چرچا ہوگا تو بیشتر لوگوں کو ان ناموں کے حقائق کے بارے میں جاننے کا شوق ہوگا، اس طرح وہ اللہ کے ان نیک بندوں کا تذکرہ کریں گے، پھر کچھ لوگوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ہوگی، اس طرح امت میں خیر پھیلے گا، اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سے بچے سمجھ آنے کے بعد اپنے ناموں کی تحقیق کرتے ہیں، وہ ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کیا نام ہے، میرا یہ نام کیوں رکھا گیا ہے، دوسرے ناموں کو چھوڑ کر اس نام کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟ جب اسے معلوم ہوگا کہ یہ فلاں صحابی کا یا بزرگ کا نام ہے تو طبعی طور پر اس کو ان سے محبت ہوگی، اور یہ فطری بات ہے کہ جب کسی شخص کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نام کا کوئی بڑا آدمی گزر چکا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی ایسا ہی بنے، اس طرح اچھے ناموں کی برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

دیگر اچھے نام:

ان مذکورہ ناموں کے بعد سب سے اچھا اور سچا نام وہ ہے جس میں حقیقتِ حال کی ترجمانی ہو، اور وہ انسانی وصف یا خوبی کا سچا آئینہ ہو، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"أصدقها حارث وهمام" یعنی سب سے سچے نام حارث اور ھمام ہیں (۱)۔

---

(۱) مسندِ احمد ۴/۳۴۵، ابوداؤد (۴۹۵۰) نسائی (۳۵۶۵) "حارث" کے معنی حرکت کرنے والا، کام کرنے والا، کمائی کرنے والا، اور "ھمام" فکر کرنے والا، ارادہ کرنے والا، ظاہر ہے کہ ہر انسان ایسا ہی ہوتا ہے، ہر ایک پر یہ نام صادق آسکتے ہیں، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا "أصدقها حارث وهمام"، اور لطیفہ ہے کہ اسی وجہ سے حریری نے ==

فصل پنجم

برے اور ناپسندیدہ نام

ناجائز نام:

ا۔علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ سب سے برے اور ناپسندیدہ نام جن کی حرمت پر اتفاق ہے، وہ نام ہیں جن میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے علاوہ کسی نام پر عبد لگایا جائے، یا بالفاظِ دیگر جن سے غیر اللہ کی عبادت کا اظہار ہوتا ہو، جیسے: عبدالعزی، عبدالکعبہ، وغیرہ (۱)

عبدالنبی اور عبدالمصطفیٰ وعبدالرسول کا بھی یہی حکم ہوگا۔ یہ تاویل ناقابلِ قبول ہوگی کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کی غلامی کا اظہار مقصود ہے، اس لیے کہ غلام کے لیے عبد کہنے کی تو خود رسول اللہ ﷺ نے ممانعت کی ہے (۲) تو خود رسول اللہ ﷺ کی غلامی کے لیے عبد کا استعمال بڑی جرأت اور ڈھٹائی ہے، اس کا بدل غلامِ رسول یا غلام مصطفیٰ ہوسکتا ہے جیسا کہ بہت سے لوگ نام رکھتے ہیں؛ لیکن یہ بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس سے بھی ایک طرح کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو صرف اور صرف اللہ کا حق ہے، اور آدمی کو توحید وشرک کے معاملے میں بہت زیادہ حساس اور محتاط ہونا چاہیے، اس لیے بعض علماء ان ناموں کو بھی حرام کہتے ہیں (۳)

جب رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ عبد لگانے کا یہ حکم ہے تو پھر عبدعلی (۴)

== اپنے مقامات میں مرکزی کردار کا نام حارث بن ہمام رکھا، اور یہ بھی ایک تاریخی لطیفہ ہے کہ ایک ضعیف راوی نے جو منکر (ضعیف) حدیثیں روایت کرتا تھا، اس نے تدلیس کے طور پر اپنے ایک شیخ کا نام ہمام بن مسلم بتایا، اس لیے کہ ہر انسان ہمام ہوتا ہے، اور یقیناً اس کا باپ مسلمان تھا۔ (دیکھیے تاریخ بغداد ۹/ ۵۴۔۵۵)

(۱) دیکھیے مراتب الاجماع، ۱/ ۱۵۳۔ (۲) دیکھیے صحیح مسلم، ۲۲۴۹۔

(۳) دیکھیے مجموع فتاوی ابن تیمیۃ (۱/ ۲۶۰) نیز تسمیۃ المولود، ص: ۱۹۔

(۴) عبدعلی اور عبدالعلی میں فرق ہے، پہلا نام حضرت علی کی بندگی کا اظہار ہے، اور دوسرے نام سے اللہ کی بندگی معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ العلی اسمائے حسنی میں سے ہے، یہ نام تو محبوب ترین اور افضل ترین ناموں میں ہوگا۔

عبدالحسن، عبدالحسین، عبدالکعبہ وغیرہ نام رکھنے کی حرمت کس درجے کی ہوگی، اندازہ لگایا جاسکتا ہے!!

ہمارے یہاں برصغیر میں عبد کی اضافت کے ساتھ ایک اور نام عام ہے ''عبدالسبحان'' جس کی کراہت کی طرف عموماً لوگوں کا ذہن نہیں جاتا، لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ کی تعریف میں سبحان اللہ کہا جاتا ہے، اور اردو والے کہتے ہیں ''سبحان تیری قدرت''، اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ سبحان بھی اللہ کا کوئی نام ہو، مگر ایسا نہیں ہے، چوں کہ سبحان اسمائے حسنی میں سے نہیں ہے اس لیے بعض علماء نے تو یہ نام رکھنا ناجائز بتایا ہے(۱) اسی طرح عبد کی اضافت کے ساتھ کچھ اور بھی نام رکھے جاتے ہیں، سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ اللہ کے نام ہیں، اگر چہ معنی کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہوتی، لیکن قرآن وحدیث سے ان کا اسمائے حسنی میں سے ہونا معلوم نہیں ہوتا، اور چوں کہ اسمائے الٰہی توقیفی ہیں، یعنی قرآن وحدیث میں جو وارد ہیں بس وہی ہیں، معنی صحیح ہونے کی وجہ سے کسی دوسری صفت کی نسبت اللہ کی طرف کرنا متفقہ طور پر جائز نہیں ہے، لہذا ایسے نام رکھنا بھی بعض علماء کے نزدیک جائز نہیں، مثلاً عبدالمقصود، عبدالستار، عبدالمعبود، عبدالموجود، عبدالمرسِل، عبدالوحید، عبدالطالب، وغیرہ (۲) لیکن ان سب پر ایک حکم لگانا صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ ستار اور معبود تو اللہ ہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اس لیے یہ نام ناجائز نہیں ہونے چاہیے۔ مگر چوں کہ ان کا اسمائے حسنٰی میں سے ہونا بھی معلوم نہیں ہوتا اس لیے کراہت ہوگی۔ واللہ اعلم

بہت سے لوگ عبدالمطلب نام رکھنے کو بھی برا نہیں سمجھتے، اس لیے کہ رسول اللہ

(۱) دیکھیے معجم المناهي اللفظية، ص:۳۷۴، تالیف شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید

(۲) تسمية المولود، تالیف بکر بن عبداللہ ابوزید، ص:۱۹

ﷺ کے دادا کا نام تھا، یہاں تک کہ مشہور عالم محدث وفقیہ علامہ ابن حزم نے بھی لکھا ہے کہ اللہ کے اسماء کے علاوہ کوئی نام عبد کے ساتھ رکھنا جائز نہیں، سوائے عبدالمطلب کے، اس لیے کہ حضور ﷺ نے حنین کے دن خود فرمایا تھا، أنا ابن عبدالمطلب، (۱) لیکن اتنی بات اس نام کے جواز کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے کہ حضور ﷺ نے ایک خبر دی تھی اور حقیقتِ حال کا بیان کیا تھا، نہ کہ اس نام کے صحیح ہونے کا اعلان، اس لیے تمام علماء نے اس کے ناجائز ہونے پر اتفاق کیا ہے (۲)۔

بہت سے غیر مسلم اور بعض انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان بھی جن کو اسلامیات کا علم نہیں ہوتا وہ نادانی میں ابو کو عبد سے بدل دیتے ہیں، مثلاً ابوالحسن کو عبدالحسن اور ابو الکلام کو عبدالکلام، اس سے بھی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ نام جائز نہیں۔

۲۔ خاص اللہ کے اسماء وصفات میں سے کوئی نام رکھنا بھی جائز نہیں جیسے رحمٰن، رزاق، خالق، صمد، اُحد، قدوس وغیرہ، (۳) لیکن اللہ کی وہ صفات جن کا استعمال بندوں کے لیے بھی ہوتا ہے، وہ نام رکھنا جائز ہے جیسے سمیع، بصیر، مالک۔

۳۔ اسی طرح ایسے نام رکھنا بھی حرام ہے جن میں ایسا دعوی پایا جائے جو صحیح نہیں ہوسکتا جن سے توحید پر زد پڑتی ہو اور شرک کی بو آتی ہو مثلاً ملک الملوک یا شاہنشاہ، اس لیے کہ ان کے معنی بادشاہوں کے بادشاہ کے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ صرف اللہ کی شان ہے (۴)

---

(۱) مراتب الاجماع، ۱/۱۵۳، دار الکتب العلمیۃ۔

(۲) دیکھیے تحفۃ المودود، ص: ۱۰۰۔۱۰۱، نیز دیکھیے معجم المناهی اللفظیۃ، ص: ۳۸۰۔

(۳) نہایت افسوس اور مسلمانوں کی آخری درجے کی جہالت کی بات ہے کہ اللہ صاحب نام بھی بعض دیہاتوں میں سنا گیا ہے

(۴) دیکھیے بخاری (۶۲۰۲) مسلم (۲۱۴۳)

۴۔ وہ نام بھی اسی حرمت میں داخل ہیں جن کی نسبت اللہ کی طرف ہی ہونی چاہیے مگر وہ مخلوق میں سے کسی کی طرف کی جائے، مثلاً: نبی بخش، پیر بخش، علی بخش، حسین بخش وغیرہ، بخش کے معنی عطیہ کے ہوتے ہیں، مطلب ہوتا ہے کہ یہ بندہ فلاں پیر کا دیا ہوا ہے، یہ صریح شرک ہے، سب اللہ کے دیے ہوئے ہیں، اس لیے ان سب کی جگہ اللہ بخش یا الٰہی بخش ہونا چاہیے، عربی میں یہی نام عطاء اللہ یا عطاء الرحمٰن ہوتے ہیں۔

۵۔ وہ نام رکھنا بھی مسلمانوں کے لیے جائز نہیں جو خاص غیر مسلموں کے ہوں جیسے جرجس، بطرس، یوحنا وغیرہ (۱) جرجس نام یہاں ہندوستان میں بھی بعض مسلمانوں کے سنے گئے ہیں، بدل دینا چاہیے۔

۶۔ بتوں کے نام پر نام رکھنا بھی جائز نہیں، جیسے: اساف، نائلہ، ھُبل (۲)۔

۷۔ شیاطین کے نام رکھنا بھی ممنوع ہے، جیسے خنزب، ولھان، اَعور، اَجدع (۳)

مکروہ نام:

۱۔ بعض نام معنی کے لحاظ سے مناسب نہیں ہوتے، اس لیے حدیث میں ان سے منع کیا گیا ہے، اسی سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا: بدترین نام حرب اور مرّہ ہیں (۴) حرب کے معنی لڑائی کے ہیں اور مرّہ کے معنی کڑوا اور تلخ کے ہیں، ایسے بہت سے نام آپ ﷺ نے تبدیل کیے ہیں جن کا آگے تفصیل سے بیان آ رہا ہے۔

۲۔ اسی طرح بدشگونی کے خطرے سے بھی آپ ﷺ نے بہت سے ناموں سے

(۱) احکام أھل الذمۃ (ابن قیم) ۲/۵۲۲۔

(۲) تسمیۃ المولود ص ۲۰۔

(۳) تحفۃ المودود، ص ۱۰۳

(۴) احمد (۴/۳۴۵) ابوداؤد (۴۹۵۰) نسائی (۳۵۶۵)

منع فرمایا۔حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بچے کا نام یسار (سہولت وآسانی) رباح (نفع) نجیح اور افلح (کامیاب) نہ رکھو، تم پوچھو گے کہ وہ ہے؟ نہیں ہوگا تو کہا جائے گا نہیں ہے"(۱)۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یعلی، برکۃ (۲)، افلح، یسار، نافع اور ان جیسے ناموں سے منع کرنے کا ارادہ کیا، پھر میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ خاموش ہوگئے، اور اس سلسلے میں کچھ نہیں فرمایا، پھر آپ ﷺ کا انتقال ہوا اور آپ نے منع نہیں کیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے روکنے کا ارادہ کیا، لیکن انھوں نے بھی یہ ارادہ ترک کردیا(۳) اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر میں انشاء اللہ زندہ رہا تو رباح، نجیح، افلح، نافع، یسار اور برکۃ نام رکھنے سے ضرور منع کروں گا(۴) یعنی سختی سے اور تاکید کے ساتھ منع کروں گا، ورنہ اس طرح کے ناموں سے منع کرنا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہو چکا ہے۔امام نووی فرماتے ہیں کہ سمرہؓ کی روایت میں نہی تنزیہی مراد ہے اور یہاں تحریمی(۵) بالفاظِ دیگر یہ نام مکروہِ تنزیہی ہیں نہ کہ مکروہِ تحریمی۔ درحقیقت اس طرح کے ناموں سے ممانعت کی علت بدشگونی ہے جیسا کہ خود حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً کسی کا نام برکت ہے اس کے بارے میں پوچھا جائے اور موجود نہ ہونے کی صورت میں جواب ملے کہ برکت نہیں ہے، تو یہ بہت بری بات ہوئی، ہر شخص بہت برا سمجھے گا کہ برکت نہیں ہے کہا جائے۔ چناں چہ اس طرح کی بات جس نام میں بھی پائی

(۱) مسلم (۲۱۳۷)۔

(۲) اسی مفہوم میں برکت اور برکات ہے۔

(۳) مسلم (۲۱۳۸)۔

(۴) دیکھیے مصنف ابن ابی شیبۃ ۱۳/۲۲۵، مسند احمد ۳/۳۳۶، ۳۸۸، الادب المفرد للبخاری (۸۵۶) ابوداود (۴۹۶۰)

(۵) شرح مسلم للنووی ۱۴/۳۴۵۔

جائے وہ نام مکروہ ہوگا (۱) مثلاً مبارک، مفلح، خیر، سرور، نعمت اور اس طرح کے تمام نام جن میں یہ علت پائی جائے، اس لیے کہ کوئی بھی ان کے بارے میں پوچھے گا اور جواب میں "نہیں" سنے گا وہ ایک انقباض اور ناگواری محسوس کرے گا اور بدشگونی لے گا (۲) اس لیے ایسے تمام ناموں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

(۳) وہ نام جو جنسی اور شہوانی جذبات کو ابھار سکتے ہوں، جیسے عاشق، معشوق، نازنین، گلبدن، نازکبدن، ماہ وش (مہوش) ماہ جبین، مہ جبین

(۴) وہ نام جن سے اپنی پاکیزگی اور بڑائی کا اظہار ہوتا ہو، جیسے مبارک، مکرم اور اسی میں "برّہ" نام بھی ہے، جس کے معنی نیکی اور احسان کے ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے برہ نام رکھنے سے منع کیا اور فرمایا اپنے کو پاکیزہ اور نیکی کا پتلا مت قرار دو، اللہ جانتا ہے کہ تم میں نیک اور پاکیزہ کون ہیں (۳) برہ نام کی کئی عورتوں کے نام آپ ﷺ نے تبدیل کیے (۴) اسی طرح وہ نام بھی اسی میں شامل ہیں، جو حضرت کے ساتھ رکھے جائیں جیسا کہ بعض دیہاتوں میں حضرت عمر اور حضرت علی وغیرہ رکھتے ہیں۔

(۵) فلمی ستاروں، گلوکاروں، بدقماش، بداطوار، بدکردار اور فاسق وفاجر لوگوں کے نام بھی مکروہ ہیں، یہ نام، رکھنے والوں کی گندی ذہنیت کا پتا دیتے ہیں، اس سے نام رکھے جانے والے بچوں پر غلط اثرات مرتب ہونے کے ساتھ، نام رکھنے والوں کو اپنے گندے مزاج کے اظہار کا گناہ بھی ہوسکتا ہے، اس لیے ایسے تمام ناموں سے احتیاط کرنی

---

(۱) دیکھیے شرح مسلم نووی ۱۴/۳۴۶-۳۴۷۔

(۲) دیکھیے تحفۃ المودود ص ۱۰۲-۱۰۳

(۳) مسلم (۲۱۴۲) ابوداؤد (۴۹۵۳)

(۴) تفصیل آگے آرہی ہے

چاہیے۔ اسی طرح کھلاڑیوں کے نام رکھنے میں بھی احتیاط کرنی چاہیے، جو نام رکھنے والے کی محدود بلکہ پست ذہنیت کو بتاتے ہیں، جب کہ ایک مسلمان کو اعلیٰ سے اعلیٰ سوچ کا حامل ہونا چاہیے۔ افسوس کہ بعض مسلمان اس طرح کے نام رکھتے ہیں اور ذرا شرم اور غیرت محسوس نہیں کرتے!!

اگر کوئی اپنے بچے کا نام کسی صالح آدمی کے نام پر رکھنا چاہتا ہے، لیکن اتفاق سے وہ نام کسی فلم اسٹار یا مذکورہ لوگوں میں سے کسی کا بھی ہو، تو نام رکھتے وقت اپنی نیت کو ٹٹولنا چاہیے، اور اچھی نیت کو دماغ میں حاضر رکھنا چاہیے، تاکہ ویسے ہی اثرات بچے پر پڑیں۔

(۶) اللہ کے باغی اور سرکش انسانوں کے نام جو عذابِ الٰہی کا شکار ہوئے، جیسے فرعون، ہامان، قارون (۱) اور قدار بھی ایسا ہی نام ہے جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو مار ڈالا تھا، پھر وہ اور پوری قوم ثمود، اللہ کے عذاب سے ہلاک کی گئی۔

(۷) وہ نام جو گناہ پر دلالت کرتے ہوں جیسے ظالم، قاتل، فاتک، سارق۔

(۸) کوئی مسلمان بادشاہ، حاکم، وزیر، یا وہ شخص جو مسلمانوں کے مخلص اور نجات دہندہ کے طور پر ابھرے، لیکن علماء کو دینی نقطۂ نظر سے ان پر اعتراض ہو، جب تک ایک عرصہ گزرنے کے بعد ان کی حیثیت واضح نہ ہو جائے، ان کے نام رکھنے میں بھی جلدی نہیں کرنی چاہیے، جیسے ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا (کمال اتاترک کے نام سے بھی مشہور ہے) جس کے ملحد اور یہودی ہونے میں اب کوئی دورائیں نہیں، اس کے نام پر مصطفیٰ کمال نام رکھنا سخت مکروہ ہوگا۔ اسی طرح جمال عبدالناصر کے زمانے میں اور اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کے نام پر جمال عبدالناصر، جمال ناصر اور ناصر جمال نام رکھے، اس کے نہ

(۱) تحفۃ المودود ص ۱۰۴

صرف یہ کہ بددین بلکہ دین دشمن (جس نے حق پرست سچے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا) ہونے میں اب کسی کو کلام نہیں، یہ نام بھی قابلِ تبدیل ہے۔

اسی طرح جنگِ خلیج کے زمانے میں بہت سے لوگوں نے جب عراقی صدر صدام حسین نے امریکہ کے خلاف آواز اٹھائی تو دینی جذبے کے تحت اپنے بچوں کے نام صدام حسین رکھے، مگر کچھ ہی عرصے میں جب اس کی دین بیزاری کی خبریں آنے لگیں تو اکثر لوگوں نے نام بدل بھی دیے۔

(۹) گھٹیا اور ناپسندیدہ صفات والے جانوروں کے نام رکھنا، جیسے: کلب، کُلیب (کتا) حمار (گدھا) قِرد (بندر) وغیرہ (۱)۔

(۱۰) ملائکہ کے ناموں پر نام رکھنا بھی بعض علماء کے نزدیک مکروہ ہے، جیسے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل (۲)۔

(۱۱) اسی طرح بہت سے علماء کے نزدیک قرآن کی سورتوں کے ناموں پر نام رکھنا بھی مکروہ ہے جیسے طٰہٰ، حٰم، یٰس، طٰس (اردو والے جن کو یاسین اور طاسین لکھتے ہیں) یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ یٰس اور طٰہٰ حضور ﷺ کے ناموں میں سے ہے یہ بات صحیح نہیں ہے، اس سلسلے میں نہ کوئی صحیح حدیث ہے، نہ حَسن، نہ کسی صحابی سے یہ بات مروی ہے، یہ تو بس الم، الر، اور حم وغیرہ کی طرح حروف ہیں (۳)۔

جب قرآن کی سورتوں کے نام پر نام رکھنا مکروہ ہے تو لفظ ''قرآن'' سے نام رکھنا بدرجۂ اولیٰ مکروہ ہوگا۔

---

(۱) تسمیۃ المولود ص ۲۲

(۲) دیکھیے تحفۃ المودود، ص ۱۰۴

(۳) دیکھیے ایضاً ص ۱۰۹-۱۱۰

(۱۲) نبی اور رسول نام رکھنا بھی مکروہ ہے، اس سے اشتباہ ہوتا ہے؛ اس لیے کہ مطلق نبی اور رسول سے حضرت محمد ﷺ مراد ہوتے ہیں۔

(۱۳) اسی طرح وہ نام بھی مکروہ ہوں گے جو اصلاً کسی خاص عقیدے کی بنیاد پر رکھے گئے ہوں جن سے عقیدۂ توحید متاثر ہوتا ہو جیسے تصورِ علی، الطافِ حسین اور افضالِ حسین (اضافت کے ساتھ) اگرچہ عموماً اب اضافت کے ساتھ نہیں بولتے، تاہم ان کا ترک ہی اولیٰ ہے۔

(۱۴) لفظ ''اللہ'' اور ''رحمٰن'' اور ''دین'' اور ''اسلام'' کی طرف اضافت کر کے نام رکھنے میں بڑی بے احتیاطیاں ہوتی ہیں، کبھی تو عربی میں کچھ مفہوم نہیں ہوتا، جیسے سعیداللہ، وحیداللہ، وحیدالرحمٰن، حسیب اللہ، نجیب اللہ، نجیب الرحمٰن، حسیب الرحمٰن، لئیق الرحمٰن، تنزیل الرحمٰن، باب اللہ وغیرہ۔ اور بعض نام تو کفر معلوم ہوتے ہیں، جیسے شفیع اللہ، شفیع الرحمٰن۔ شفیع کے معنی سفارشی کے ہیں، اللہ کا سفارشی؟ استغفراللہ! اور اگر اس کو بالفرض مشفوع کے معنی میں اسم مفعول مانا جائے (جب کہ یہ اس معنی میں آتا بھی نہیں) تو اس کے معنی ہوئے اللہ کا سفارش کیا ہوا، سفارش تو اللہ کی اجازت سے اس کے پاس ہوگی نہ کہ وہ سفارش کرے، اس سے بڑا کون ہے جس کے پاس وہ سفارش کرے، اس معنی کے لحاظ سے بھی کفر ہے۔ شفیع کے ایک معنی جوڑے کے آتے ہیں، اس معنی کے لحاظ سے تو صریح کفر ہے، اللہ ہر جوڑے سے بے نیاز ہے۔

اسی میں سے عطیف الرحمٰن ہے۔ عطیف کے معنی نرم اور مطیع وفرماں بردار عورت کے آتے ہیں۔ اللہ کی عورت؟ اس سے بڑھ کر کیا کفر وشرک ہوگا!!

اسی میں سے ایک نام جوان سے زیادہ رائج ہے وہ ذکاء اللہ ہے۔ ذکاء کے معنی

بھڑکنا اور تیز ہونا، سورج کے ساتھ آئے تو اس کی تمازت بڑھنا، جنگ کے ساتھ ہو تو اس کے شعلے بھڑکنا، اگر یہ معنی مان کر اللہ کا غصہ مراد لیا جائے، تب بھی یہ نام بالکل ناموزون ہے۔ اس کے ایک معنی ذہانت اور ہوشیاری کے ہیں، اللہ کو اس صفت سے موسوم نہیں کیا جا سکتا، ایک معنی مشک کے مہکنے کے ہیں، اللہ کی کوئی مہک نہیں، بہرحال یہ نام غلط ہے۔

انہی ناموں میں سے ایک نام صدر اللہ ہے، صدر کے معنی: سینہ، دل، سردار، کسی چیز کا پہلا اور ابتدائی حصہ، کسی چیز کا ٹکڑا، کسی بھی معنی کے لحاظ سے اس کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہو سکتی۔

ظل اللہ اور ظل الرحمٰن بھی نام صحیح نہیں ہیں، ظل کے معنی سایہ، سایہ کے لیے جسم ضروری ہے، اور اللہ جسم سے مستغنی ہے، تو سایہ کا سوال ہی نہیں، پہلے لوگ بادشاہ کو ظل اللہ فی الأرض کہتے تھے، وہ بھی صحیح نہیں تھا۔

قطب اللہ بھی اسی طرح کا نام ہے، قطب کے معنی محور اور مدار کے ہیں، اور اس کی ضرورت عاجز کو پڑتی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔

اسی طرح نہایت مکروہ اور غلط ناموں میں وھاب الدین اور زاہد الدین ہے، وھاب کے معنی دینے والا، عطا کرنے والا، یہ اللہ کی صفت ہے۔ اور زاہد کے معنی بے رغبتی اختیار کرنے والا، یہ نام دین بے زاری کا اعلان ہے۔

ان میں سے بعض نام ایسے ہوتے ہیں، جن کی جمع کی صورت میں اضافت اللہ اور دین واسلام وغیرہ کی طرف کی جاتی ہے، جیسے انصار اللہ، احرار اللہ، اصحاب اللہ، اصحاب الدین، ارباب الدین، اور احکام الدین وغیرہ۔ یہ نام بھی لاحاصل اور قابل تبدیل ہیں۔

حزب اللہ کا بھی یہی حکم ہے، حزب اللہ یعنی اللہ کی پارٹی یہ لفظ جمع کے معنی میں ہے۔

اس طرح بعض نام ایسے ہیں جو فارسی یا کسی اور زبان کے ہوتے ہیں۔مگران کی اضافت اللہ اور دین وغیرہ کی طرف کی جاتی ہے، جیسے آصف اللہ، آصف الدین، چراغ الدین، سہراب الدین، شایان الحق، اس طرح کے نام بھی عربی کے لحاظ سے غلط ہیں۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ ایسے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے، جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں، بلکہ ان کا استقصا ممکن بھی نہیں۔بعض علماء نے دین اسلام کی طرف اضافت کر کے رکھے جانے والے ان ناموں کو ناجائز قرار دیا ہے، جو محض دعویٰ اور صریح جھوٹ ہوں، جیسے نور الدین، ضیاء الدین، نور الاسلام، ضیاء الاسلام، سیف الدین، سیف الاسلام، یہ تو اصل میں لقب ہیں، اس لیے نام کے طور پر ان کو رکھنا ٹھیک نہیں ہے، لیکن اکثر علماء اس کو مکروہ بتاتے ہیں۔

(۱۵) بعض نام عربی جمع کی خاص اعرابی صورت میں رکھے جاتے ہیں، جیسے عارفین، صالحین، مرسلین، اس طرح کے نام بھی نامناسب ہیں۔

(۱۶) بعض نام عربی کے پورے جملے کی صورت میں رکھے جاتے ہیں، جیسے، بسم اللہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، انشاء اللہ، یہ بالکل بے ڈھنگے نام ہیں۔

(۱۷) کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی مطلب واضح نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ ایک شخص کی پہچان ہیں، مثلاً ایک نام سنا گیا ہے، افضان، جس کی حقیقت کا کوئی پتا نہیں۔ایسے ناموں سے سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

(۱۸) بعض لوگ قرآن کے الفاظ سے کبھی کسی کو کاٹ کر کبھی کسی کو جوڑ کر عجیب وغریب نام رکھتے ہیں، مثلاً سیقول، یقول فعل مضارع ہے، س حرف ہے مستقبل قریب کے لیے لگتا ہے، اور اس سے بھی حیرت انگیز ایک نام سنا گیا ہے وریشا، یہ سورۂ اعراف کی

آیت (قد أنزلنا علیکم لباساً یواری سوآتکم وریشاً) سے لیا گیا ہے، لفظ صرف ''ریش،، ہے، جس کے معنی عمدہ لباس اور زیب وزینت کی چیز کے ہیں ۔ حالتِ نصبی میں ریشاً ہوگیا، واو عطف کا ہے، عطف لباساً پر ہے، اور نام رکھا گیا ہے حالت نصبی میں حرف عطف کے ساتھ۔ اس جہالت اور نادانی کو آخر کیا کہا جائے!!

لوگ قرآن میں ہے کہہ کر کچھ بھی نام رکھ دیتے ہیں خواہ اس کے معنی کچھ بھی ہوں۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کے کئی بیٹے تھے، سب کے نام ہم وزن تھے، سلیم، شمیم، نسیم، وغیرہ، ایک اور بیٹا ہوا تو اس کا نام زنیم رکھ دیا۔ ایک مولوی صاحب نے اس سے پوچھا کہ یہ نام تم نے کیوں رکھا؟ اس نے سوال کا حقارت سے جواب دیتے ہوئے کہا: مولوی صاحب! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ قرآن میں ہے، سورہ قلم میں ہے ''عتل بعد ذلك زنیم'' ۔ انھوں نے کہا: ارے بے وقوف! تم نے اس کے معنی بھی معلوم کرنے کی کوشش کی، اس کے معنی تو کمینے کے ہیں ۔ اس پر وہ سر پکڑ کر رہ گیا۔ یہ لطیفہ ہو یا واقعہ، معنی معلوم کیے بغیر نام رکھنے کا بسا اوقات یہی نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے نام رکھنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے، اور علماء سے رجوع کرنا چاہیے۔

فصل ششم

ناموں کے اثرات اور اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات

نام اور معنی میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے، جس طرح جسم اور روح میں تعلق ہوتا ہے، نام چوں کہ معنی کے لیے سانچے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دونوں کے درمیان مناسبت اور ربط و تعلق ہو۔ اسم، مسمّٰی میں اثر ڈالتا ہے، (یعنی نام اس میں اثر ڈالتا ہے جس کا یہ نام رکھا گیا ہے، اور مسمّٰی اپنے اسم کے اچھے برے اثرات قبول کرتا ہے، نام کا اتنا اثر پڑتا ہے کہ ایاس بن معاویہ (۱) آدمی کو دیکھ کر اس کا نام بتا دیتے تھے اور اکثر صحیح ہوتا تھا۔

ناموں کی اندرونی تاثیر کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ ابن قیم لکھتے ہیں: ان چھ آدمیوں کے ناموں پر غور کیجیے جنھوں نے غزوۂ بدر کے دن مبارزت طلب کی تھی، (یعنی اس وقت کے جنگ کے دستور کے مطابق پہلے جو مقابلے کے لیے نکلے تھے) دیکھیے ان کے ناموں کا ان کے احوال پر کیسا اثر پڑا، اور یہی تقدیر کا تقاضا تھا، کفار کی طرف سے تین آدمی نکلے شیبہ، عتبہ اور ولید، ولید تو بچے کو کہتے ہیں جو کمزوری کا آغاز ہوتا ہے اور شیبہ بڑھاپے کو کہتے ہیں جو کمزوری کی انتہا ہوتی ہے اور عتبہ عتب سے مشتق ہے اور عتب تکلیف دہ بات کو کہتے ہیں، تو ان کے نام بتاتے تھے کہ یہ کمزور پڑ جائیں گے اور ان پر مصیبت اور تکلیف آئے گی، ان کے بالمقابل جو مسلمان نکلے تھے وہ علی، عبیدہ اور حمزہ (۲) تھے، علی

(۱) مشہور تابعی ہیں، بصرہ کے قاضی تھے، ذہانت وفطانت میں ضرب المثل تھے، ۱۲۲ھ میں انتقال کیا۔

(۲) یہاں ابن قیم نے حمزہ کی بجائے حارث لکھا ہے اور اس کے مطابق توجیہ کی ہے، جب کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے حمزہ تھے، اور حارث تو عبیدہ کے والد تھے، یہیں سے غالباً سہو ابن قیم کو ہوا، ہم نے حمزہ کے مطابق توجیہ کی ہے۔

سے علو اور بلندی معلوم ہوتی ہے، اور عبیدہ سے عبادت اور اللہ کی بندگی کا پتا چلتا ہے، اور حمزہ مضبوط دل والے اور شیر کو کہتے ہیں، تو اپنے ناموں کی ان خصوصیات کی وجہ سے گویا وہ ان پر غالب آگئے (۱)

بہر حال، ناموں کا اچھا برا اثر پڑتا ہے، رسول اللہ ﷺ ہر چیز میں اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے اپنے گورنروں کو لکھ بھیجا تھا کہ جب تم کوئی قاصد میرے پاس بھیجو، تو ایسے شخص کو بھیجو جو شکل وصورت کے لحاظ سے بھی ٹھیک ہو اور جس کا نام بھی اچھا ہو۔ (۲) آپ ﷺ نام کی اچھائی اور برائی کا بہت زیادہ احساس رکھتے تھے، اچھا نام سنتے تو اچھا شگون لیتے، اور جب بھی کوئی ایسا نام سنتے جس سے ذہن غلط خیال یا بدشگونی کی طرف منتقل ہو سکتا ہو، فوراً اس نام کو بدل دیتے، افراد ہی کے نام نہیں (جن کی فہرست آگے آرہی ہے) سڑکوں، گلیوں اور شہروں کے نام بھی بدل دیتے تھے، ان کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی، خود مدینہ کا نام بھی آپ کا بدلا ہوا ہے، پہلے اس کا نام یثرب تھا، یثرب کے مادّہ میں ملامت، خرابی اور برائی کا مفہوم ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اس کا نام بدل کر طابۃ رکھا۔ (۳) جس کے مادہ میں خوش گواری، عمدگی اور اچھائی کا مفہوم ہے۔ اسی طرح آپ نے اس کا نام مدینہ بھی رکھا (۴) جس کے معنی ہیں، وہ آباد شہر جس میں تمام تمدنی ضرورت کی چیزیں موجود ہوں۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ کسی چیز سے بدشگونی نہیں

---

(۱) زاد المعاد ۲/ ۳۳۹-۳۴۰

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ (۱۷/ ۵۲۱-۵۲۲) المعجم الأوسط للطبرانی (۵/ ۱۰۲ رقم ۴۷۷۷)

(۳) دیکھیے بخاری (۱۸۸۲) مسلم (۱۳۹۲)

(۴) بخاری ۱۸۸۱) مسلم (۱۳۸۲)

لیتے تھے، جب کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو اس کا نام معلوم کرتے، نام اچھا لگتا تو خوش ہوتے اور خوشی کا اثر چہرے سے عیاں ہوتا، اور جب کوئی نام آپ کو اچھا نہیں لگتا اور ناپسند ہوتا، تو اس کا اثر بھی چہرے سے ظاہر ہوتا، اسی طرح جب کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس کا نام پوچھتے، نام پسند آتا تو آپ خوش ہوتے اور خوشی کا اثر چہرے سے نمایاں ہوتا، اور اس کا نام ناپسند ہوتا تو اس کا بھی چہرے سے اظہار ہوتا۔(۱)

آپ ﷺ ایک دفعہ سفر میں تھے، راستے میں دو پہاڑوں کے درمیان سے گزر ہوا، آپ ﷺ نے لوگوں سے ان کے نام پوچھے، بتایا گیا کہ فاضح اور مخزی ہے، (دونوں کے معنی ذلیل اور رسوا کرنے والے کے ہیں) یہ نام سن کر آپ ﷺ نے راستہ بدل دیا، اور وہاں سے نہیں گذرے۔(۲) متعدد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ناموں کا آپ پر کتنا اثر پڑتا تھا اور آپ اس کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

سفرِ ہجرت کے موقع پر راستے میں بُریدہ اسلمی ملے، حضور ﷺ نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ تمھارا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا "بریدہ" آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف رخ کر کے فرمایا: "یا أبابکر برد أمرنا وصلح" (اے ابوبکر! ہمارے معاملے میں دشمن کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں، (۳) اور ہمارا کام ٹھیک ہوگیا، پھر پوچھا: کس قبیلے سے تمھارا

---

(۱) ابوداود (۳۹۲۰) ومسند احمد ۵/ ۳۴۷-۳۴۸)۔

(۲) تحفة المودود ص: ۱۰۵- اسی طرح ابن قیم نے نقل کیا ہے، ابن ہشام نے سیرت میں غزوۂ بدر کے سفر کے سلسلے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے، لیکن اس میں نام فاضح اور مخزی کے بجائے مُسلح اور مُخریٔ (را کے ساتھ) ہے، (دیکھیے سیرت ابن ہشام ۲/ ۴۵۸، نیز دیکھیے الروض الانف ۳/ ۵۷) اس میں ان کی وجہ تسمیہ بھی بیان ہوئی ہے۔ مسلح، اَسلح کا اسم فاعل ہے، یہ لفظ جانور کو لید یعنی پاخانہ کرانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، مخریٔ کے بھی یہی معنی ہیں، یہ لفظ خرء (لید، بیٹ، پاخانہ) سے مشتق ہے، رسول اللہ ﷺ نے یہ نام بہت ناپسند کیے اور راستہ بدل دیا۔

(۳) برد کے معنی ٹھنڈے ہونے کے ہیں۔

تعلق ہے؟ انھوں نے کہا "اسلم" سے، آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا "سلمنا" (یعنی اب ہم صحیح سلامت خطرے سے نکل آئے) پھر پوچھا، اسلم کی کس شاخ سے ہو؟ انھوں نے کہا بنوسہم سے، آپ ﷺ نے فرمایا: "خرج سهمك" (۱)۔ یعنی تمھاری قسمت جاگ اٹھی (۲)۔

اور مشہور واقعہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار مکہ ہر طرح سے آپ ﷺ کو پریشان کرنے اور مکہ میں داخل نہ ہونے دینے کی ٹھانے ہوئے تھے، ان کی طرف سے سفیر پر سفیر آرہے تھے، لیکن کوئی بات طے نہیں ہو پا رہی تھی، اتنے میں کفار کی طرف سے سہیل بن عمرو آئے، آپ ﷺ نے ان پر نظر پڑتے ہی فرمایا کہ اب معاملہ سہل اور آسان ہوگیا (۳) چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

اور بات یہ بھی ہے کہ اللہ نے تقدیری طور پر اچھے اور برے ناموں میں تاثیر رکھی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کے متعدد واقعات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے:

اونٹنی کا دودھ دوہنا تھا، حضور ﷺ نے پوچھا کون دوہے گا؟ ایک شخص کھڑا ہوا، حضور ﷺ نے پوچھا تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ میرا نام "مرّہ" (۴) ہے، آپ ﷺ نے اس سے کہا: بیٹھ جاؤ، پھر پوچھا: کون اس اونٹنی کا دودھ دوہے گا؟ تو ایک دوسرا شخص کھڑا ہوگیا، حضور ﷺ نے اس سے پوچھا: تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے اپنا نام "حرب" (۵) بتایا، حضور ﷺ نے اس سے کہا، بیٹھ جاؤ، آپ ﷺ نے پھر پوچھا کون اس کا دودھ دوہے گا؟ تو

---

(۱) سہم قسمت وتقدیر کو کہتے ہیں۔

(۲) الاستیعاب ۱/۲۶۳۔

(۳) بخاری (۲۷۳۱ و ۲۷۳۲)۔

(۴) مرہ کے معنی تلخ اور کڑوے کے ہیں۔

(۵) حرب کے معنی لڑائی اور جنگ کے ہیں۔

ایک تیسرا آدمی کھڑا ہوا، حضور ﷺ نے اس سے پوچھا: تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرا نام ''یعیش'' (۱) ہے، حضور ﷺ نے اس سے کہا: ہاں تم دودھ لو (۲)

اسی کے قریب ایک واقعہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ہماری اونٹنیوں کا دودھ کون ہمیں پہنچائے گا، ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا میں پہنچاؤں گا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمھارا نام کیا ہے، اس نے: صخر یا جندل (۳) بتایا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ پھر پوچھا: اونٹنیوں کا دودھ کون ہمارے پاس لائے گا؟ تو ایک دوسرا شخص کھڑا ہوا، آپ ﷺ نے پوچھا: تمھارا نام؟ اس نے کہا: یعیش۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جاؤ تم دودھ لے آؤ۔ (۴)

اسی طرح ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ہماری ان اونٹنیوں کو کون لے چلے

(۱) یعیش کے مادہ میں جینے اور زندہ رہنے کا مفہوم ہے۔

(۲) موطا، کتاب الاستیذان، باب ما یکرہ من الاسماء، نمبر ۲۴، ص: ۶۶۹-۶۷۰۔ اسی طرح کا ایک واقعہ معجم کبیر طبرانی (۲۲/۲۷۷) میں بھی موجود ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق بدشگونی اور بدفالی سے نہیں ہے، جس کی اسلام میں ممانعت ہے، بلکہ اچھے نام کو آپ ﷺ پسند کرتے تھے اور برے نام کو ناپسند کرتے تھے۔ چوں کہ آپ ﷺ نے بدشگونی سے منع فرمایا تھا اس لیے یہ اشکال اس وقت بھی بعض صحابہ کو ہوا، چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ اس پر حضرت عمرؓ کھڑے ہوے اور سوال کرنے کی اجازت چاہی، حضور ﷺ نے اجازت دی، تو انھوں نے عرض کیا، کہ آپ ﷺ نے تو بدشگونی سے منع فرمایا تھا، حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے کوئی بدشگونی نہیں لی، البتہ میں نے اچھے نام کو ترجیح دی (دیکھیے الروض الانف، ۳/۵۷-۵۸)۔ اور متعدد صحابہ نے یہ بات صراحت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بدشگونی نہیں لیتے تھے، مثلاً حضرت ابن عباس کی ایک روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اچھا شگون لیتے تھے، بدشگونی نہیں لیتے تھے اور اچھا نام آپ کو پسند آتا اور اچھا لگتا (مسند احمد، ۱/۲۵۷) حضرت بریدہ کی مذکورہ روایت میں بھی مسند احمد میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کسی چیز سے بدشگونی نہیں لیتے تھے۔

(۳) صخر اور جندل دونوں کے معنی چٹان کے آتے ہیں اور جندل کے ایک اور معنی: پانی کے بہاؤ کی وہ جگہ جہاں پتھر ہوتے ہیں۔

(۴) المعجم الکبیر (رقم: ۱۷۹۲)۔

گا؟ ایک شخص کھڑا ہوا تو آپ ﷺ نے اس سے نام پوچھا۔ اس نے کچھ بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ پھر دوسرا آدمی کھڑا ہوا، اس سے آپ ﷺ نے پوچھا تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: ناجیہ(۱) آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں تم ہو، چلو لے چلو(۲)۔

خواب کی تعبیر تک میں آپ ﷺ نام سے اچھا شگون لیتے تھے، اپنے ایک خواب کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے ایک رات خواب دیکھا، گویا ہم عقبہ بن رافع (ایک انصاری صحابی کا نام ہے) کے گھر میں ہیں، اور ابن طاب (۳) کی کچھ تازہ کھجوریں ہمارے پاس لائی گئیں، میں نے خواب کی یہ تعبیر لی کہ ہمیں دنیا میں رفعت و بلندی حاصل ہوگی اور آخرت میں ہماری عاقبت اچھی ہوگی، اور ہمارا دین طیب و پاکیزہ ہے(۴)۔

ناموں کا کتنا اثر پڑتا ہے، اس سلسلے میں سعید بن المسیب کی حدیث پر غور کیجیے، ان کے دادا کا نام حزن (۵) تھا، وہ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے دریافت کیا، آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا: حزن، آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تمھارا نام سہل (۶) ہے۔ انھوں نے کہا: میں وہ نام نہیں بدلتا، جو میرے والد نے رکھا ہے، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا: تمھارا نام سہل ہے، تو اس پر انھوں نے کہا: نہیں، سہل (یعنی نرم زمین) پر پاؤں رکھا جاتا ہے اور حقارت

---

(۱) ناجیہ: تیز: تیزی سے کوئی کام کرنے والا، تیز اونٹنی کو بھی ناجیہ کہتے ہیں۔

(۲) المعجم الکبیر (۲۲/۳۵۳)۔

(۳) رطب ابن طاب مدینہ کی ایک عمدہ قسم کی کھجور ہے، شرح مسلم للنووی ۱۵/۳۳۔

(۴) مسلم (۲۲۷۰)۔

(۵) حزن: سخت زمین۔

(۶) حزن کے معنی سخت اور کھردری زمین کے ہیں، اور اس کے بالمقابل سہل نرم زمین کو کہتے ہیں۔

سے روندا جاتا ہے، سعید کہتے ہیں کہ اب تک ہمارے خاندان میں سختی اور اکھڑ پن ہے (۱)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے پوچھا: تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: جمرہ (دہکتا ہوا انگارا) پھر پوچھا تمھارے باپ کا نام کیا ہے؟ اس نے کہا شہاب (سلگتا ہوا آگ کا شعلہ) کس قبیلہ سے تمھارا تعلق ہے؟ اس نے کہا: حُرقہ (سوزش، جلن) سے، پھر پوچھا: گھر کہاں ہے؟ اس نے کہا: حرۃ النار میں (حرۃ النار: آگ سے جلی ہوئی کالے پتھر والی زمین) پھر پوچھا، اس کی کس گلی میں؟ اس نے کہا: ذات لظیٰ میں (لظی: آگ کی لپٹ کو کہتے ہیں) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جاؤ، اپنے گھر والوں کی خبر لو، وہ تو جل چکے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا۔(۲)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا میں اترے تو انھوں نے اس سرزمین کا نام پوچھا، لوگوں نے کہا یہ کربلا ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کہا، کرب وبلاء (۳) کرب بے چینی، پریشانی، رنج وملال کو کہتے ہیں، اور بلاء یعنی مصیبت اور آزمائش، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جن مصائب سے دوچار رہوئے دنیا جانتی ہے۔

اور دیکھا گیا ہے کہ آدمی کا نام بدلا گیا تو اُس کی پوری زندگی بدل گئی، لہٰذا نام رکھنے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔

وہ نام جو رسول اللہ ﷺ نے تبدیل کیے:

ناموں کی اسی تاثیر کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اس معاملے میں بہت سختی سے کام

(۱) بخاری (۶۱۹۰) اور ابوداؤد (۴۹۵۶)۔

(۲) موطا، کتاب الاستیذان، نمبر ۲۵، ص: ۶۷۰۔

(۳) المعجم الکبیر للطبرانی (۳/۱۰۶ و ۱۰۸۔۱۰۹) اس کی سند میں ضعف ہے

لیتے تھے۔ جب بھی کوئی بُرا نام سنتے اس کو فوراً بدل دیتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ برے نام کو بدل دیتے تھے، (۱) اور ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ برا نام سنتے تو بدل کر اچھا نام رکھتے (۲) رسول اللہ ﷺ نے افراد واشخاص کے نام بھی بدلے، خاندانوں اور قبائل کے نام بھی تبدیل کیے، اور شہروں اور راستوں کے ناموں میں بھی تبدیلی کی۔ ہم یہاں جدول کی صورت میں صرف افراد کے ان ناموں کا تذکرہ کرتے ہیں، جو آپ ﷺ نے تبدیل کیے (۳)۔

نمبر شمار	پہلے کے نام	معنی	تبدیل شدہ نام	معنی
۱	أسود	کالا، سیاہ	ابیض (۱)	گورا، سفید
۲	أصرم	کاٹنے والا، وہ شخص جس کے کانوں کے کنارے کٹے ہوئے ہوں۔	زُرعۃ (۲)	اچھی قابلِ کاشت زمین
۳	الأصم	بہرا	عبدالرحمٰن (۳)	رحمٰن (اللہ) کا بندہ
۴	أکبر	سب سے بڑا	بشیر (۴)	بشارت دینے والا
۵	بُجیر	سست، ڈھیلا، بوجھل۔	عبداللہ (۵)	

(۱) ترمذی (۲۸۳۹)

(۲) مصنف ابن ابی شیبۃ (۱۳/ ۲۳۹-۲۴۰)

(۳) اس چارٹ کے حاشیے کے نمبر ہر صفحے کے بجائے مسلسل دیے گئے ہیں اور چارٹ کے اخیر میں حواشی ہیں۔

۶	بَحِیر	خوف زدہ ہونے والا (٦)	بشیر یا بشر (۷)	خوشی
۷	بربر	وحشی، غصہ ور (۸)	بکر (۹)	جوان اونٹ (یہ نام عربوں میں بہت رائج تھا)
۸	جثّامہ	سست وکاہل عورت	حسانہ (۱۰)	خوبصورت عورت
۹	برّہ	نیکی، احسان (تفصیل پیچھے گزر چکی ہے)	زینب (۱۱)	ایک حسین خوشبودار پودا (عرب یہ نام بہت رکھتے تھے)
۱۰	برّہ		جویریہ (۱۲)	لڑکی، کم سن عورت (۱۳)
۱۱	برہ		میمونہ (۱۴)	مبارک، وہ عورت جس سے اچھا شگون لیا جائے
۱۲	بغیض	مبغوض: وہ شخص جس سے لوگ نفرت کریں	ہشام (۱۵)	سخاوت
۱۳	جبّار	زبردست (یہ اللہ کا نام ہے)	عبدالجبار (۱۶)	اللہ کا بندہ
۱۴	جُعَیل	اجرت، رشوت	عمرو (۱۷)	عمر کا مصدر ہے بمعنی: جینا، لمبی عمر پانا
۱۵	حُباب	ایک قسم کا سانپ، شیطان کا نام	عبداللہ (۱۸)	اللہ کا بندہ
۱۶	حرام	حرام، ناجائز	حلال (۱۹)	حلال، جائز

۱۷	حرب	جنگ، لڑائی	سَلم (۲۰)	امن، صلح
۱۸	حرب	جنگ، لڑائی	حسن (۲۱)	خوبصورت
۱۹	حرب	جنگ، لڑائی	حسین (۲۱)	خوبصورت
۲۰	الحکم	فیصلہ کرنے والا (یہ اللہ کا نام ہے)	عبداللہ (۲۲)	اللہ کا بندہ
۲۱	حُمَیر	حمیر کی تصغیر (۲۳)	عبدالرحمٰن (۲۴)	رحمٰن (اللہ) کا بندہ
۲۲	دینار	ایک سکہ (۲۵)	عبداللہ (۲۶)	اللہ کا بندہ
۲۳	ذُوَیب	چھوٹا بھیڑیا	عبداللہ (۲۷)	اللہ کا بندہ
۲۵	زحم (۲۸)	بھیڑ، دھکا دینا	بشیر (۲۹)	اللہ کا بندہ
۲۶	السائب	آزاد پھرنے والا	عبداللہ (۳۰)	اللہ کا غلام
۲۷	سواد	سیاہی، کالا رنگ	عبدالرحمٰن (۳۱)	
۲۸	شریس	بدخلق، بدمزاج، جھگڑالو	شریح (۳۲)	وضاحت، حفاظت
۲۹	شہاب	آگ کا شعلہ	ہشام (۳۳)	سخاوت
۳۰	شیبۃ	بڑھاپا	عُتبہ (۳۴)	سخت (۳۵)
۳۱	شیطان	شیطان، سرکش، نافرمان	عبداللہ (۳۶)	اللہ کا بندہ
۳۲	الصَرم	کاٹنا (مصدر) چمڑا	سعید (۳۷)	خوش نصیب

۳۳	ضرّار	نقصان پہنچانے والا	مسلم (۳۸)	دینِ اسلام کو ماننے والا، امن وامان دینے والا۔
۳۴	الطیب	پاک (۳۹)	عبداللہ (۴۰)	اللہ کا بندہ
۳۵	ظالم	ظلم کرنے والا	راشد (۴۱)	صحیح راستے پر قائم
۳۶	عازب	دور، غیر شادی شدہ	عفیف (۴۲)	پاک دامن، ناپسندیدہ بات یا کام سے بچنے والا۔
۳۷	العاص	نافرمان	مطیع (۴۳)	فرماں بردار
۳۸	عاصیہ	نافرمان عورت	جمیلہ (۴۴)	خوبصورت عورت
۳۹	عاصیہ		مطیعہ (۴۵)	فرماں بردار عورت
۴۰	عَتَلہ	کدال (۴۶)	عتبہ (۴۷)	قوی، سخت (۴۸)
۴۱	عزیز (۴۹)	زبردست، غالب (اللہ کا نام)	عبدالرحمٰن (۵۰)	اللہ کا بندہ
۴۲	عُصَیّہ	لاٹھی (۵۱)	عصمہ (۵۲)	حفاظت، گناہ سے دوری
۴۳	عِنَبہ	انگور کا دانہ	عُنقودہ (۵۳)	انگور کا خوشہ (۵۴)
۴۴	غافل	غفلت میں پڑا ہوا	عاقل (۵۵)	عقل مند
۴۵	غُراب	کوا	مسلم (۵۶)	اسلام کو ماننے والا، امن والا
۴۶	غَوِی	گمراہ	راشد (۵۷)	ہدایت یافتہ
۴۹	قیوم	اللہ کا نام ہے (۵۸)	عبدالقیوم (۵۹)	اللہ کا بندہ

۵۰	کثیر	زیادہ، بہت (۶۰)	بشیر (۶۱)	بشارت دینے والا
۵۱	الکلاح	قحط زدہ سال	ذؤیب (۶۲)	(۶۳)
۵۲	ماناہیہ	ایک مجوسی نام (۶۴)	محمد (۶۵)	
۵۳	مخشی (۶۶)	وہ جس سے ڈرا جائے (۶۷)	عبداللہ	اللہ کا بندہ
۵۴	مُضطجع	لیٹنے والا، لیٹا ہوا	مُنبعث (۶۸)	اٹھنے والا
۵۵	مِیسم	علامت، داغ لگانے کا اوزار	مُسلم (۶۹)	مسلمان، امن وامان والا
۵۶	نذیر	ڈرانے والا	بشیر (۷۰)	بشارت دینے والا
۵۷	نُشبہ	کسی کام میں پھنس جانے والا	عتبہ (۷۱)	قوی، سخت
۵۸	نھلہ	کمزور، تھک جانے والا (۷۲)	عبداللہ (۷۳)	اللہ کا بندہ
۵۹	نُعم	فراخی، آسودہ حالی (۷۴)	عبداللہ (۷۵)	اللہ کا بندہ
۶۰	نُعیم	نعمت (۷۶)	صالح (۷۷)	اچھا، بہتر، نیک
۶۱	نکرہ	انکار، ناواقفیت، انجان	معروف (۷۸)	جانا پہچانا ہوا شخص، اچھی بات

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی ۶/۲۳۲ (۸۶۱۸)

(۲) ابوداود (۴۹۵۴) صرم یعنی کاٹنا اور زرعۃ، زرع سے مشتق ہے۔ زرع کے معنی: بونا

(۳) سیر أعلام النبلاء ۴/۵۱۸۔

(۴) التاریخ الکبیر للبخاری ۲/۱۰۵ نیز دیکھیے الاصابہ ۱/۹۶ و ۲۴۰

(۵) الاصابۃ ۳/۱۹۳ رقم ۴۶۶۹

(۶) اصلأیہ بحر یعنی سمندر کو دیکھ کر خوف زدہ ہونے والے کو بولتے ہیں، اس کے ایک معنی وہ شخص بیماری کی وجہ سے جس کی پیاس بڑھی ہوئی ہو اور پانی پینے سے بھی پیاس نہ بجھ رہی ہو۔ اور ایک معنی وہ شخص جو دوڑنے کی کوشش کرے مگر دوڑ نہ سکے۔

(۷)الاصابۃ ۱/۲۳۰رقم ۶۶۸

(۸)بربر شمالی افریقہ کی ایک قوم کا نام ہے، وحشی لوگوں کو بھی عرب بربر کہتے ہیں، اور بَرْبَرَ غصے میں الٹی سیدھی باتیں بکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۹)الاصابۃ ۱/۲۴۴ بعض نسخوں میں بربر کی جگہ بریر ہے۔

(۱۰)الاستیعاب ۴/۳۷۱)۔

(۱۱)بخاری (۶۱۹۲) ومسلم (۲۱۴۱) ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اور آپ ﷺ کی پروردہ زینب بنت ابی سلمۃ، دونوں کا نام برّہ تھا، حضور ﷺ نے بدل کر زینب رکھا (مسلم نمبر ۲۱۴۲)۔

(۱۲)ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا نام برہ تھا، حضور ﷺ نے بدل کر جویریہ رکھا (مسلم: ۲۱۴۰)۔

(۱۳)عرب اس سے عورت کی چستی، تیزی اور پھرتیلا پن مراد لیتے تھے۔

(۱۴)الأدب المفرد (حدیث نمبر: ۸۵۵)۔

(۱۵)فتح الباری ۶/۶۴۱، کتاب الشروط۔

(۱۶)الإصابۃ ۳/۳۱۶۔

(۱۷)الإصابۃ ۱/۳۶۲۔

(۱۸)مصنف عبدالرزاق ۱۰/۹۵ (۱۱/۳۹) مصنف ابن أبی شیبۃ (۱۳/۲۴۱) منافق سردار عبداللہ ابن اُبی کے لڑکے عبداللہ جو پکے مومن تھے ان کا نام بھی حباب تھا آپ نے بدل کر عبداللہ رکھا (الاصابۃ ۳/۲۳۷ رقم ۴۷۸۲)۔ حباب نامی ایک شخص کا نام آپ نے بدل کر مُسرّق رکھا، (الإصابۃ ۲/۳۰۶) سرق کے مادہ میں چوری کرنے کا مفہوم ہے۔ معلوم نہیں کس خاص وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ نام رکھا، خود ان سے بھی لوگوں نے پوچھا تھا کہ یہ کیا نام ہے؟ انھوں نے فرمایا یہ نام حضور ﷺ نے رکھا۔

(۱۹)مسند احمد ۳/۴۷۱۔

(۲۰)ابوداوٗد (۴۹۵۶)۔

(۲۱)حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب پیدا ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حرب نام رکھا، حضور ﷺ نے بدل کر حسن رکھا، اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حرب ہی نام رکھا، حضور ﷺ نے بدل کر حسین کیا (الأدب المفرد، نمبر حدیث ۸۴۶، وتاریخ ابن ابی خیثمہ (ص: ۲۹) ومستدرک حاکم ۳/۱۶۵، وصححہ ووافقہ الذہبی، وصحیح ابن حبان (۱۵/۴۱۰)

(۲۲)الاستیعاب ۱/۱۴۱۱ رقم ۵۴۱۔ اور حکم اللہ ہی کی صفت ہے، کسی اور کو زیبا نہیں (معالم السنن ۴/۱۱۸)۔ اسی طرح ایک صاحب کی کنیت ابوالحکم تھی، آپ نے فرمایا: حکم تو اللہ ہے، حکم یعنی فیصلہ کرنے والا، ایسا کہ جب وہ فیصلہ کرے تو اس کو ٹالا

نہ جاسکے۔ پھر حضور ﷺ نے ان سے ان کے لڑکوں کے نام پوچھے، انھوں نے کہا: شریح، مسلم، عبداللہ۔ حضور ﷺ نے پوچھا: ان میں بڑا کون ہے؟ انھوں نے کہا: شریح۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تب تو تمھاری کنیت ابوشریح ہے (الأدب المفرد (۸۳۴)، ابوداود، (۴۹۵۵) نسائی (۵۳۸۹)۔

(۲۳) حمیر کے ایک معنی وہ شخص جس کی کھال اتاری گئی ہو، اور حمیر حمار کی جمع بھی ہے، بمعنی: گدھا۔

(۲۴) الاصابۃ ۵/۱۰۲ رقم ۷۸۴۰

(۲۵) اس سے دنیا کی محبت معلوم ہوتی ہے، اس لیے بدلا ہوگا۔

(۲۶) الاصابۃ ۳/۲۱۰ رقم ۴۹۵۶

(۲۷) الاصابۃ ۲/ ۱۲۷ رقم ۲۵۰۱ و ۳/ ۲۷۹ رقم ۴۹۱۸

(۲۸) یہ مشہور صحابی بشیر بن الخصاصیہ کا نام تھا۔

(۲۹) الادب المفرد (۸۵۲) تاریخ ابن ابی خیثمہ (ص: ۲۸۸۔۲۸۹) نیز دیکھیے الاستیعاب (۱/۲۵۳)۔

(۳۰) الاستیعاب ۳/ ۱۲۶ رقم ۱۲۷۱، لیکن چند اور صحابہ کے نام سائب ملتے ہیں جو آپ ﷺ نے تبدیل نہیں کیے، اس کے معنی اچھے بھی ہوسکتے ہیں، برے بھی۔

(۳۱) الاصابۃ ۲/ ۴۲۰، رقم ۳۵۸۱

(۳۲) معجم البلدان ۳/ ۸ (مادہ شبیر) تاج العروس مادہ شرس۔

(۳۳) الأدب المفرد (۸۴۸) مسند احمد ۶/ ۷۵، مجمع الزوائد ۸/ ۵۱

(۳۴) دیکھیے مجمع الزوائد ۸/ ۵۳

(۳۵) عتب کے مادہ میں سختی اور شدت کا مفہوم ہے۔ اس لفظ کی ایک تشریح پیچھے ناموں کے اثرات کے تحت گزر چکی ہے، بڑھاپے کی مقابلے میں قوت کے مفہوم کے پیش نظر آپ ﷺ نے یہ نام رکھا۔

(۳۶) مسند احمد ۴/ ۳۵۰

(۳۷) الادب المفرد (۸۴۵)، مجمع الزوائد، ۸/ ۵۲۔

(۳۸) فیض القدیر للمناوی ۵/ ۲۳۵

(۳۹) اس نام کی کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اپنی پاکیزگی اور بڑائی کا اظہار ہے، اور برّہ کے سلسلے میں پہلے اس طرح کے ناموں کی تفصیل گزر چکی ہے، اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا نام ہے اس لیے یہ نام رکھنا جائز نہیں۔

(۴۰) الاصابۃ ۳/ ۹۶، رقم ۴۲۹۲

(۴۱) الاصابۃ ۳/ ۱۲۹، رقم ۴۴۲۶

(۴۲) التاریخ الکبیر للبخاری (۵/ ۱۷۳)

(۴۳) مسلم (۲۱۳۲) مصنف ابن ابی شیبۃ ۱۳/ ۲۴۲، الأدب المفرد (۸۴۹) تاریخ ابن أبی خیثمۃ (ص ۲۹۰-۲۹۱)۔

(۴۴) مسلم (۲۱۳۹) ابوداود (۴۹۵۲) ترمذی (۲۸۳۸) ابن ماجہ (۳۷۳۳) مصنف ابن ابی شیبۃ (۱۳/ ۲۳۸) مسند احمد (۲/ ۱۸)، الأدب المفرد (۸۴۳)۔

(۴۵) الإصابۃ ۷/ ۲۵۵، رقم ۱۱۷۴۵

(۴۶) عَتَلَة: لوہے کا سخت اوزار جس سے پتھر وغیرہ توڑے جائیں، اس کے مادے میں سختی اور درشتی کا مفہوم ہے، جب کہ مومن کی صفت نرم خوئی ہے، اس لیے یہ نام حضور ﷺ نے تبدیل کیا، (معالم السنن للخطابی ۴/ ۱۱۸)

(۴۷) مجمع الزوائد ۸/ ۵۳، نیز دیکھیے الإصابۃ ۳/ ۴۱۳

(۴۸) اس کے معنی میں بھی سختی ہوتی ہے، لیکن عتلہ کے معنی میں درشت مزاجی بھی ہوتی ہے، اس لیے تبدیل کر کے یہ نام رکھا۔

(۴۹) یہ اللہ کے ناموں میں سے ہے، اس لیے آپ ﷺ نے تبدیل کیا۔

(۵۰) مسند احمد ۴/ ۷۸، مصنف ابن أبی شیبۃ ۱۳/ ۲۳۹، مستدرک حاکم ۴/ ۲۷۶۔ تاریخ ابن أبی خیثمۃ (ص: ۲۸۹)

(۵۱) عُصَیۃ، عصا (لاٹھی) کی تصغیر ہے، لیکن اس کے مادہ میں عصیان اور معصیت کا مفہوم بھی ہے، اس لیے حضور ﷺ نے اس کے بالمقابل مفہوم والے نام میں تبدیل کیا۔

(۵۲) الإصابۃ ۳/ ۴۵۴-۴۵۵۔

(۵۳) الإصابۃ ۷/ ۲۰۳

(۵۴) پہلے نام میں کمی کا مفہوم تھا، اس لیے حضور ﷺ نے اسی مفہوم کو نیک شگون کے طور پر عنقود ۃ سے بدل دیا۔

(۵۵) طبقات ابن سعد ۳/ ۳۶۰

(۵۶) الأدب المفرد (۸۴۷)، تاریخ ابن أبی خیثمۃ (ص: ۲۸۸) المعجم الکبیر للطبرانی (۱۹/ ۴۴۳)

(۵۷) الإصابۃ (۲/ ۱۳۹)۔

(۵۸) قیوم: وہ ذات خود قائم اور کائنات کی ہر شئ کو قائم رکھنے والی اور اس کی محافظ، اور یہ صرف اللہ ہی کی صفت ہو سکتی ہے۔

(۵۹) دیکھیے مجمع الزوائد ۸/ ۵۴، نیز مجموعۃ الفتاوی لابن تیمیۃ ۱/ ۲۶۰ (۱/ ۳۷۸)

(۶۰) اس نام میں کوئی خوبی نہیں ہے، اس لیے اس کے ہم وزن بامعنی اچھے نام سے آپ نے بدل دیا۔

(۶۱) مستدرک حاکم ۴/ ۲۷۵

(۶۲) الإصابۃ ۲/ ۱۳۳ رقم ۲۴۸۵

(۶۳) تبدیل کیے ہوئے ناموں میں ذؤابہ گزر چکا ہے، اس لیے کہ یہ اصل میں ذئب (بھیڑیا) کی تصغیر ہے، مگر یہاں

آپ ﷺ نے خود یہ نام رکھا، یہاں یہ ذؤابۃ (پیشانی کے لمبے بال) سے مشتق ہے، چوں کہ ان صاحب کے بال ایسے تھے، اس لیے اس کی مناسبت سے آپ ﷺ نے یہ نام رکھا۔

(۶۴) اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی دوسری زبان کا غیر مفہوم نام، یا دوسرے مذہب والوں کے نام نہیں رکھنا چاہیے۔

(۶۵) الاصابۃ ۵/۹۳ رقم ۷۸۱۵

(۶۶) ان کا نام قشی بن مُخَیّر تھا، انھوں نے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کا اور ان کے والد کا نام بدل دیں تو آپ نے ان کا نام عبداللہ رکھا اور ان کے والد کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ مُخَیّر کے تحت حوالہ گزر چکا ہے۔

(۶۷) یہ تو اللہ کی شان ہے کہ اس سے ڈرا جائے، اسی وجہ سے آپ ﷺ اس کے بالمقابل مناسب نام عبداللہ رکھا۔

(۶۸) مصنف بن أبی شیبۃ ۱۳/ ۲۴۱، ابوداود (۴۹۵۶)

(۶۹) الاصابۃ ۵/ ۱۲۵۔۱۲۶ رقم ۶۹۲۶

(۷۰) ایضاً ۵/ ۳۳۳ رقم ۸۶۹۲

(۷۱) تاریخ ابن أبی خیثمہ (ص ۲۹۱) المعجم الکبیر للطبرانی (۱۷/ ۱۲۵)۔

(۷۲) نضل: تیراندازی میں مقابلہ کر کے غالب آنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

(۷۳) الاصابۃ ۵/ ۳۳۸ رقم ۸۷۱۵

(۷۴) غالباً رسول اللہ ﷺ نے نعیش کے مفہوم کے پیشِ نظر اس کو تبدیل کیا اور اسی لیے اللہ کی عبدیت کے اظہار والا نام رکھا۔

(۷۵) المعجم الکبیر (۲/ ۲۵، رقم ۱۱۷۳) والمعجم الأوسط (۱/ ۴۵۵ رقم ۱۶۷۵)

(۷۶) یہاں بھی اوپر والی علت پیش نظر رہی ہوگی، واللہ أعلم، جب کہ یہ نام آپ ﷺ نے بہت سے اصحاب کے باقی رکھے۔

(۷۷) الاصابۃ ۱/ ۱۴۸-۱۴۹

(۷۸) ایضاً ۵/ ۱۸۱

کچھ اور نام بھی ہیں جو ہم نے اس فہرست میں شامل نہیں کیے، اس لیے کہ یہ نام ایسے ہیں جن کا بدلا جانا ضعیف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، جتنے ناموں میں عبد کی نسبت غیر اللہ کی طرف ہوتی تھی وہ سارے نام آپ نے بدل دیے، ایسا کوئی نام جائز نہیں، اس کی تفصیل کی چنداں حاجت نہیں۔

فصل ہفتم

نام کے بارے میں متفرق مسائل

۱- نام رکھنا باپ کا حق ہے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، یہاں تک ماں کو بھی اس سلسلے میں لڑنے کا حق نہیں، بہتر ہے کہ ماں کو راضی کرلیا جائے لیکن کوئی ضروری نہیں۔ یہ ایک طبعی اور فطری بات بھی ہے اور نفسیاتی اور عقلی بات بھی، اس لیے کہ بچے کی نسبت شرعاً اور عرفاً باپ کی طرف ہوتی ہے، نام اچھا رکھے تو اس پر، بُرا رکھے تو اس پر، لیکن باپ کو چاہیے کہ اگر وہ دین کا علم نہیں رکھتا تو وہ اپنی پسند سے کوئی نام اختیار نہ کرے، بلکہ کسی معتبر عالم دین سے معلوم کرے، بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں صحیح حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے وہ اپنے بچوں کو پیدا ہونے کے بعد آپ ﷺ کے پاس لے جاتے تھے اور آپ ان کے نام رکھتے تھے۔

۲- یہ جو بات عوام میں مشہور ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنی ماں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا، یہ بات صحیح نہیں ہے، اس سلسلے میں جو روایت نقل کی جاتی ہے اس کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے(۱)۔ اور صحیح روایتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ آدمی باپ کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب قیامت کے دن اللہ اگلے پچھلے تمام لوگوں کو جمع کرے گا اس وقت ہر غدار اور دھو کے باز کے لیے پہچان کے طور پر ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی غداری کا نشان ہے(۲)۔

۳- نام چوں کہ پہچان اور ایک دوسرے کے درمیان فرق کرنے کے لیے رکھا جاتا

---

(۱) دیکھیے تحفۃ المودود (ص:۱۲۴)۔

(۲) یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت انسؓ سے الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ مروی ہے، امام بخاری نے کئی جگہ اس کو نقل کیا ہے مثلاً دیکھیے (۳۱۸۶-۳۱۸۷) نیز مسلم (۱۷۳۵) اور ایک ==

ہے، اور یہ مقصد ایک نام سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے ایک ہی نام رکھنا اولیٰ ہے، لیکن ایک سے زیادہ نام رکھنا بھی جائز ہے(۱)۔ خود رسول اللہ ﷺ کے ایک سے زیادہ نام تھے، مگر محمد اور احمد کے علاوہ سب نام صفاتی تھے اور آپ کے یہ دو نام بھی اس طرح نہیں تھے کہ دونوں بیک وقت کہے جاتے ہوں، جیسے برصغیر میں ہوتا ہے، بلکہ یا تو محمد کہا جاتا تھا یا احمد۔ لیکن عربی قاعدہ سے قطعِ نظر اس طرح مرکب نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا جیسے طارق محمود، خالد مسعود وغیرہ۔

۴- برکت کے لیے محمد یا احمد نام کے آگے پیچھے لگانے کا جو معمول ہے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں، بلکہ انشاء اللہ یہ باعثِ برکت ہی ہوگا، لیکن عربی قواعد کے اعتبار سے عربی کے ماہرین نے اس پر اشکال کیا ہے۔

۵- باپ اور بیٹے کے نام کو ایک نام کی طرح لکھنے کا طریقہ بھی بہت سے علاقوں میں چل پڑا ہے، مثلاً کسی کا نام منصور ہے، اور اس کے باپ کا نام حامد، لیکن اس کا نام اس طرح لیا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے منصور حامد، یہ دراصل اہلِ یورپ کا طریقہ ہے، یورپ سے یہ بیماری عرب تک پہنچی اور براہِ راست یورپ سے یا عرب سے ہوتے ہوئے ہمارے ملک میں بھی رائج ہو چکی ہے۔ جب کہ پوری اسلامی تاریخ میں کہیں بھی ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ باپ کا نام بیٹے کے نام کے جز کی طرح استعمال ہوتا ہو، نہ بولنے میں، نہ لکھنے میں، ابن کا لازماً اضافہ کرتے تھے، لیکن آج مغرب کی اندھی تقلید میں عربوں میں یہ بات اتنی رائج ہو چکی ہے کہ ابن کا بیچ میں لکھنا گویا متروک یا معیوب سا ہو گیا ہے، مگر غیرت مند عرب علماء نے اس پر شدید نکیر کی ہے اور سختی سے اس سے روکا ہے، ان ناموں میں تو اور مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، جو مردوں اور عورتوں میں مشترک ہوتے ہیں، جب تک ابن یا بنت کا اضافہ نہیں ہوگا کاغذ پر پتا چلنا مشکل ہو جائے گا، اور معاملہ کچھ کا کچھ ہو جائے گا(۲)۔

۶- بہت سے لوگ غیروں کی تقلید میں جانوروں کو انسانی نام رکھ دیتے ہیں،

== جگہ امام بخاری نے اس کے لیے عنوان ہی یہ قائم کیا ہے باب مایدعی الناس بآبائهم دیکھیے (۶۱۷۷)۔

(۱) تحفۃ المودود (ص:۱۲۱)
==

بالخصوص وہ لوگ جو کتے پالتے ہیں، ویسے کتا رکھنا عام حالات میں جائز بھی نہیں ہے، مگر جن ناگزیر حالات میں مثلاً کھیت وغیرہ کی حفاظت کے لیے کتا رکھنے کی جو اجازت دی گئی ہے مسلمانوں کے نام ان کو نہ رکھے، اور خاص طور پر انبیاء کے نام تو ہرگز ہرگز نہ رکھے، اسی طرح صحابہ اور اولیاء کے نام بھی نہ رکھے۔

۷- جو نام رکھنا جائز نہیں ،لیکن رکھا جا چکا ہے تو اس کو بدلنا ضروری ہے، خواہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں ہو، اور جو نام مکروہ اور نامناسب ہیں، اگر نام بدلنے سے بہت زیادہ مسائل پیدا نہ ہوں تو ان کو بھی کسی اچھے نام سے بدل دینا چاہیے۔

۸- سابقہ تفصیل سے یہ بات تو بالکل واضح ہو چکی ہے کہ نام ہمیشہ معنی معلوم کر کے رکھنا چاہیے، لیکن اگر انبیاء کے نام ہیں تو معنی معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، ان کا نام ہونا ہی سعادت اور برکت کے لیے کافی ہے، ان کے بعد صحابہ کے ناموں سے اسی برکت کی امید کرنی چاہیے بالخصوص وہ صحابہ جن کو حضور ﷺ کے ساتھ بہت زیادہ رہنے کا اور فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہو، جیسے خلفاے راشدین، اور بقیہ عشرہ مبشرہ وغیرہ، اس لیے ایسے ناموں کے معنی کا کھوج لگانے کی ضرورت نہیں۔

۹- بعض لوگوں کو فاطمہ کے معنی دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا نام ہوا؟ اس لیے کہ اس کے معنی ہیں بچے کا دودھ چھڑانے والی عورت۔ یہ نام عربوں میں بہت رائج تھا، حضور ﷺ کے خاندان میں آپ ﷺ کی پیاری صاحبزادی کے علاوہ اور کئی خواتین اس نام سے موسوم تھیں، بظاہر معنی دیکھ کر اس نام میں کوئی خوبی نہیں معلوم ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ معنی کے لحاظ سے بھی یہ بہت اچھا نام ہے، اس میں نیک شگون ہے کہ یہ بچی زندہ رہے، بڑی ہو، صاحبِ اولاد ہو، بلکہ بچے کے بھی نازک مراحل سے گزرنے تک کا اس میں شگون ہوتا ہے۔

== (۲) دیکھیے تسمیۃ المودود، ص:٦ (الیکٹرانک ایڈیشن) تالیف شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید، نیز انھی کی کتاب معجم المناھی اللفظیۃ ص ۴۹۵-۴۹۶۔

چھٹا باب

ختنے کے احکام و مسائل

ختنہ درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ اسّی سال کی عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنا ختنہ کیا تھا (۱) اس کے بعد ملتِ ابراہیمی کی دونوں شاخوں یعنی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام دونوں کی اولاد میں یہ طریقہ جاری رہا، یہودی شریعت میں تو بڑی سختی سے اس پر عمل ہوتا تھا یہاں تک کہ وہ غیر مختون (وہ شخص جس کا ختنہ نہیں ہوا) کو نجس سمجھ کر اپنے عبادت خانے میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے، (۲) حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد یعنی عرب بھی اس کے پابند تھے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ ﷺ نے بڑی تاکید سے اس کا حکم دیا اور اس کو خصالِ فطرت (۳) (یعنی فطرت کی عادتوں) میں شمار کیا، ایک مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں: ختنہ کرنا، زیرِ ناف کے بال مونڈنا، بغل کے بال اکھاڑنا، ناخن تراشنا، مونچھیں کاٹنا (۴)۔ اسی لیے اس کے ایک تاکیدی شرعی عمل ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، بعض فقہاء اس کو واجب کہتے ہیں اور بعض سنت، تابعین میں سے امام شعبی، امام ربیعۃ الرائے، امام اوزاعی وغیرہ اس کو واجب کہتے ہیں، ائمۃ اربعہ میں سے امام مالک، امام شافعی اور امام احمدؒ بھی واجب کہتے ہیں، مشہور تابعی حضرت حسن

(۱) صحیح بخاری (۳۳۵۶) ومسلم (۲۳۷۰) نیز دیکھیے فتح الباری ۷/ ۶۴۶۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے ختان الذکور والاناث عند الیہود والمسیحیین والمسلمین، ص ۴۹-۵۰ (الیکٹرانک ایڈیشن)۔

(۳) فطرت کی تشریح میں اختلاف ہے، امام خطابی کہتے ہیں کہ بہت سے علماء کے نزدیک فطرت سے مراد سنت ہے، یعنی انبیاء کی سنتوں اور طریقوں میں سے یہ بات ہے، اور دوسرے بہت سے علماء کہتے ہیں کہ فطرت سے مراد دین ہے یعنی دین کی خصلتوں اور عادتوں میں سے ہے، بعض نے فطرت میں سے ہونے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب کوئی بندہ ان چیزوں پر عمل کرے گا تو وہ اس فطرت کے مطابق ہوگا جس پر اللہ نے بندوں کو پیدا کیا ہے اور اس کو ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان چیزوں پر ابھارا ہے۔ (دیکھیے معالم السنن (۱/ ۲۷) المجموع (۱/ ۱۵۷) فتح الباری (۱۳/ ۳۹۲-۲۹۳)

(۹۴) بخاری (۵۸۸۹) ومسلم (۲۵۷)۔

(۴) بخاری (۵۸۸۹)، مسلم (۲۵۷)۔

بصری اور ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہؒ اس کو سنت کہتے ہیں اور جو حضرات اس کو سنت کہتے ہیں ان کے نزدیک بھی اس کا درجہ عام سنتوں کا نہیں بلکہ تاکیدی سنت، ایسی سنت جس کے چھوڑنے سے گناہ ہوگا، امام مالکؒ کا ایک قول بھی یہی ہے، اور امام ابو حنیفہ کا ایک قول واجب ہونے کا بھی ہے(۱)۔

ختنے کا وقت:

ختنے کا وقت یوں تو پیدائش سے بلوغ تک ہے، بلوغ سے پہلے ختنہ واجب نہیں، اور یہ بالکل معقول بات ہے، اس لیے کہ بلوغ سے پہلے بچہ عبادات کا مکلّف نہیں ہوتا، جب بہت ضروری فرض اعمال بھی بلوغ سے پہلے واجب نہیں ہوتے تو ختنہ جو فرض سے کم درجے کی چیز ہے بدرجۂ اولی بلوغ سے پہلے واجب نہیں ہوگا۔ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، اور اس میں اختلاف ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ لیکن ہاں اس میں اختلاف ہوا ہے کہ ختنہ کس عمر میں کرنا مستحب ہے؟ بعض علماء نے ساتویں دن سے پہلے کرنا مکروہ کہا ہے اور بہت سے علماء نے ساتویں دن ختنہ کرنا مستحب قرار دیا ہے(۲) ایک حدیث میں ہے کہ بچے کے سلسلے میں ساتویں دن سات سنتیں ہیں، اس میں ختنے کا بھی ذکر ہے(۳)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ساتویں دن حسن اور حسین کا ختنہ کیا(۴)۔

اور امام باقرؒ سے نقل کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ

(۱) تحفۃ المودود ص ۱۳۵، المجموع ۱/۱۶۴) المغنی (۱/۱۱۵) الدر المختار مع الرد (۱۰/۴۸۰ وبعد) فتح الباری (۱۳/۳۹۵)۔

(۲) المجموع (۱/۱۶۶)۔

(۳) المعجم الأوسط للطبرانی ۱/۱۷۰ (۵۸۵) حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے (فتح الباری ۱۳/۳۹۸)۔

(۴) السنن الکبری للبیہقی ۸/۵۶۲ (۸/۳۲۴) اس حدیث کی بھی تضعیف کی گئی ہے۔

عنہا ساتویں دن اپنے بچوں کا ختنہ کراتی تھیں(۱)۔

ان میں سے کوئی روایت سند کے لحاظ سے پوری طرح صحیح نہیں ہے، تاہم بہت سے علماء نے ان جیسی روایتوں کی بنیاد ہی پر ساتویں دن ختنہ کرنا مستحب کہا ہے۔

مشہور تابعی وہب بن منبہؒ سے اس سلسلے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے بھی ساتویں دن اس کو مستحب قرار دیا، لیکن اس کی توجیہ انھوں نے دوسری کی، انھوں نے کہا اس لیے کہ بچے کے لیے اس میں زیادہ راحت ہے، اس لیے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا پورا بدن سن ہوتا ہے، سات دن تک اس کو تکلیف کا زیادہ احساس نہیں ہوتا، اور اگر ساتویں دن ختنہ نہ ہو سکے تو کچھ طاقت پیدا ہونے تک چھوڑ دیا جائے(۲)۔

حضرت حسن بصریؒ اور امام مالکؒ ساتویں دن ختنہ کرنے کو یہودیوں سے مشابہت کی وجہ سے مکروہ سمجھتے تھے، اس لیے کہ یہود ساتویں دن کرتے ہیں(۳) اگر ساتویں دن نہ کر سکے تو چالیسویں دن کرے اور اگر اس وقت بھی نہ کر سکے تو ساتویں سال میں کرے(۴)۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے اس شہر (مدینہ منورہ) میں عام طور پر لوگ اس وقت ختنہ کرتے ہیں جب بچے کے سامنے کے یعنی دودھ والے دانت گر جاتے ہیں، اور یہ دانت ساتویں سال میں یا اس کے کچھ آگے پیچھے گرتے ہیں(۵)۔

(۱) دیکھیے التمہید (۲۱/۶۰)۔

(۲) تحفۃ المودود (ص ۱۵۰)۔

(۳) تحفۃ المودود ص ۱۵۰، فتح الباری ۱۲/ ۳۹۸۔ ایک ضعیف روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کا ختنہ جب کیا تو وہ سات دن کے تھے (سنن البیہقی ۸/ ۳۲۶)۔

(۴) المجموع (۱/ ۱۶۵)۔

(۵) فتح الباری ۳/ ۳۹۸

مشہور فقیہ امام لیث بن سعد مصریؒ کہتے ہیں کہ بچے کا ختنہ سات سال سے دس سال کی عمر میں کرنا چاہیے(۱)۔

متاخرین احناف نے بھی یہی بات لکھی ہے(۲)۔

اور سچی بات تو یہ ہے جیسا کہ ابن منذر لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی قطعی بات کہی جا سکے(۳) لیکن ان حکمتوں پر غور کرنے سے (جن کا بیان آگے آتا ہے) بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سات سال کی عمر سے پہلے اس سے فارغ ہوا جائے، اس لیے کہ حدیث میں ہے کہ سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو دس سال کی عمر سے پہلے ضرور ختنہ کر لیا جائے، اس لیے کہ اس عمر میں نماز نہ پڑھنے پر مارنے کا حکم ہے، اور اگر بالغ ہونے تک نہ کرے تو گناہ لازم آئے گا۔ یہ ہوئی شرعی مدت۔ لیکن طبی نقطۂ نظر سے ختنے کا بہترین وقت پیدائش کا پہلا ہفتہ ہے، اس لیے کہ عضوِ تناسل کی وہ کھال جو ختنے میں کاٹی جاتی ہے، اس وقت چھوٹی ہوتی ہے اور اس کا کاٹنا اس وقت نسبتاً آسان ہوتا ہے اور زیادہ عمل جراحی کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے نہ زیادہ خون بہتا ہے اور نہ قابل ذکر تکلیف ہوتی ہے، جیسا کہ بڑی عمر میں ختنہ کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ ختنہ کرنے میں جلدی کرنے سے بچہ ضیقِ غلفہ (phimosis) کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے(۴) اور اس کی وجہ سے پیشاب، گردے، اور مثانہ سے متعلق دوسری بیماریوں اور

---

(۱) التمهيد ۲۱/۶۰۔

(۲) العناية شرح الهداية، بهامش فتح القدير (۶/۴۹۱) متقدمین احناف سے اس سلسلے میں کوئی بات مروی نہیں، کنز الدقائق میں سات سال لکھا ہے (دیکھیے البحر الرائق (تكملة) شرح كنز الدقائق (۹/۳۵۹)۔

(۳) دیکھیے المجموع (۱/۱۶۷)۔

(۴) اس بیماری میں عضو تناسل کی کھال کا منہ سکڑ جاتا ہے اور اوپر چڑھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔

پیچیدگیوں سے بھی محفوظ رہتا ہے(۱)۔

ختنے کی دعوت:

ختنے کے موقع پر دعوت کرنا اور اس کا قبول کرنا جائز، بلکہ مستحب ہے(۲)۔

اگر چہ اس کی کوئی خاص فضیلت وارد نہیں ہوئی، لیکن ایک شرعی حکم کے پورا کرنے پر وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دعوت کرتا ہے اور اپنے رشتہ داروں اور دوست احباب کو اس میں شریک کرتا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے۔ چناں چہ متعدد صحابہ سے یہ بات ثابت ہے:(۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بچوں کے ختنے کے موقع پر دعوت کیا کرتے تھے۔ اور ختنے کی دعوت میں کوئی بلاتا تو اس کو قبول کرتے تھے۔(۴)

---

(۱) الطفل المثالی، تالیف الدکتور محمد نبیل النشواتی ص ۸۳ بحوالہ

(۱) امام نوویؒ نے مستحب دعوتوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے، (شرح مسلم ۹/ ۲۱۶) نیز دیکھیے فتح الباری ۱۱/ ۵۳۶ رقم ۵۱۷۶ و ۱۳/ ۳۹۹۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں: ولیمہ کے علاوہ ختنہ اور دوسری تمام دعوتوں کا حکم یہ ہے کہ وہ مستحب ہے، اس لیے کہ اس میں کھانا کھلانا ہوتا ہے اور اس کا قبول کرنا بھی مستحب ہے واجب نہیں ہے، ائمہ اربعہ کا یہی قول ہے۔ (المغنی ۱۰/ ۲۰۷) لیکن کسی بھی غیر مشروع موقع پر دعوت کا اہتمام کر کے اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ بلکہ درحقیقت بعض صحابہ سے، اس موقع پر دعوت کرنا ثابت ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے

اگر چہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان بن أبی العاص کو ختنے کی دعوت میں بلایا گیا، تو انھوں نے جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم ختنے کی دعوت میں نہیں جاتے تھے اور نہ اس کی دعوت ہوتی تھی۔ (مسند احمد، ۴/ ۲۱۷)۔ لیکن طبرانی کی روایت سے صحیح صورت حال کا علم ہوتا ہے: انھیں جب معلوم ہوا کہ یہ لڑکی کا ختنہ ہے تو انھوں نے کہا: یہ چیز (لڑکی کے ختنے کی دعوت) تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں ہوتی تھی، پھر انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا (المعجم الکبیر، ۹/ ۵۷ رقم: ۸۳۸۲) اور حافظ ابن حجر نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ لڑکے کے ختنے کا اظہار اور لڑکی کے ختنے کا اخفاء مسنون ہے۔ (فتح الباری ۱۳/ ۳۹۹)۔

(۴) العیال لابن أبی الدنیا رقم ۵۸۳ و ۵۸۴۔

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے ختنے پر لوگوں کی دعوت کی (۱)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے مشہور فقیہ قاسم (بن محمد بن ابی بکر) فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سو درہم یہ کہہ کر میرے پاس بھیجے کہ اپنے بیٹے کے ختنے کے موقع پر اس سے دعوت کرنا (۲)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد عکرمہ بیان کرتے، کہ ابن عباس نے اپنے بچوں کا ختنہ کیا تو مجھے بلایا، میں دو کھلونے لے کر حاضر ہوا، بچوں نے اس سے کھیلا، اور انھوں نے ان کو چار درہم دیے (۳)۔

ختنے کی شرعی حکمتیں اور مصلحتیں:

ختنے کی بہت سی شرعی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ملتِ ابراہیمی کا شعار ہے، اسی لیے یہود بھی جو اپنے کو ملتِ ابراہیمی کا نمایندہ سمجھتے ہیں، ختنے پر سختی سے عمل کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں، اور عرب بھی اس کے پابند تھے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے کو ملتِ ابراہیمی کا ترجمان سمجھتے تھے، یہاں تک عربوں کو زمانۂ جاہلیت میں اُمَّۃ الختان (ختنہ کرنے والی قوم) کہا جاتا تھا۔اسلام چوں کہ ملتِ ابراہیمی کی صحیح شکل ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کی بہت تاکید کی ہے۔

اس کی ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان اس سے فرق

---

(۱) العیال، رقم ۳۵۸ نیز ۵۸۸۔

(۲) ایضاً، رقم ۵۸۵

(۳) ایضاً، رقم ۵۸۶

وامتیاز ہوتا ہے، بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں ہم ان غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں (خواہ ہندو ہوں یا کسی اور مذہب کے پیرو) جو ختنہ بالکل نہیں کرتے، تو مرنے کے بعد ختنے کی بنیاد پر ہی لاش کی پہچان ممکن ہے۔ بالخصوص فسادات میں جو موتیں ہوتی ہیں، یا انجان جگہوں میں جو لوگ مرتے ہیں، یا گھر سے دور سڑک حادثات کا شکار ہوکر جو لوگ اپنی جان کھو بیٹھتے ہیں، ان جیسے موقعوں پر تو ختنہ ہی واحد ذریعہ ہے، جس سے مسلمان کی قطعی پہچان ہوسکتی ہے۔

ختنے کی ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے جنسی جذبات میں اعتدال پیدا ہوجاتا ہے، جس کی افراط آدمی کو جانوروں سے ملادیتی ہے(۱)۔ اور پھر انسانیت کیسی شرمسار ہوتی ہے، ہر کوئی اس کو جانتا ہے۔

اور اس سب سے بڑھ کر ختنے کی سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ یہ طہارت اور پاکیزگی کا ذریعہ ہے، جس کا ختنہ نہیں ہوتا اس کے عضو کی اس کھال میں جس کو ختنے میں کاٹا جاتا ہے، پیشاب کا اثر باقی ہونے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے، اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس معاملے میں بڑی سختی کرتے تھے، فرماتے تھے کہ غیر مختون کی نہ نماز صحیح ہوتی ہے، نہ اس کا ذبیحہ حلال ہے نہ اس کی شہادت قبول ہے(۲)۔ متفرق مسائل کے ضمن میں اس سلسلے میں تفصیل آرہی ہے۔

ختنے کے طبی فوائد:

ختنے کا حکم جہاں متعدد شرعی حکمتوں پر مبنی ہے، وہیں اس کے دسیوں طبی فوائد بھی ہیں، انھی طبی مصلحتوں کی وجہ سے آج مغربی ممالک میں بہت سے عیسائی بھی ختنہ کرنے

(۱) تحفۃ المودود ص ۱۵۴، اطباء نے بھی ختنے کے اس فائدے کا ذکر کیا ہے کہ اس سے جنسی جذبات میں اعتدال پیدا ہوتا ہے

(۲) مصنف عبدالرزاق ۱۸۶/۱۰ (۱۷۵/۱۱) والسنن الکبری للبیہقی ۵۶۳/۸ (۳۲۵/۸)

لگے ہیں، اس سلسلے میں بہت سے ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے۔

ڈاکٹر حسان شمسی باشا لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام جنسی امراض ان لوگوں کے مقابلے میں جن کا ختنہ ہوا ہے ان لوگوں میں زیادہ ہوتے ہیں جن کا ختنہ نہیں ہوا، ڈاکٹر وینک (جنھوں نے ختنہ کے موضوع پر کتاب لکھی ہے جو ۱۹۸۸ء میں کیلی فورنیا امریکہ میں شائع ہو چکی ہے) نے اس موضوع پر ہوئی ساٹھ سے زیادہ تحقیقات جمع کی ہیں، ان سب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جنسی امراض غیر مختون لوگوں میں (وہ لوگ جن کا ختنہ نہیں ہوا) زیادہ ہوتے ہیں۔(۱)

ختنے پر تحقیق کرنے والے تمام ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر یہ بات لکھی ہے کہ ختنہ عضو تناسل کے کینسر سے بچاتا ہے۔ غلفہ (عضو تناسل کی وہ کھال جس کو ختنے میں کاٹا جاتا ہے) میں جو مرطوب مواد جمع ہوتا ہے وہ کینسر کا سبب ہوتا ہے، ختنہ کرنے سے آدمی اس سے محفوظ رہتا ہے۔ یہودیوں اور مسلمانوں میں یہ بیماری نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے کہ ان کا بچپن میں ختنہ ہوتا ہے۔ امریکہ میں سالانہ عضو تناسل کے کینسر سے مرنے والوں کی شرح ۵۰۔۷۔۱۰۰۰ کے درمیان ہے، لیکن گزشتہ بیس سالوں کے دوران میں امریکہ میں ختنہ شدہ لوگوں میں عضو تناسل کے کینسر کے صرف تین واقعات سامنے آئے، امریکی اعداد وشمار کے مطابق ۱۹۳۰ء سے اب تک ساٹھ ہزار سے زاید عضو تناسل کے کینسر کے کیس ہوئے جن کی اصل تعداد کے لحاظ سے دس سے کم کیس مختون لوگوں میں پائے گئے، اسی طرح مردوں کا ختنہ کرنا عورتوں کو عُنق رحم (رحم کا ابتدائی حصہ) کے کینسر سے بچاتا ہے(۲)

(۱) اسرار الختان تتجلی فی الطب الحدیث ۵۳ (بحوالۂ ختان الذکور والاناث ص ۳۴۴)

(۲) ایضاً، بحوالہ ختان الذکور والاناث ۳۴۶، نیز دیکھیے سنت نبوی اور جدید سائنس حصہ دوم (ص ۳۶۱)

۔امریکی میگزین برائے امراض اطفال نے ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ غیر مختون شخص کسی بھی وقت عضو تناسل کے کینسر کا شکار ہوسکتا ہے، اس سے بچنا اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ نومولود کا ختنہ کر دیا جائے (۱)۔

بعض ڈاکٹروں کے مطابق ختنہ ایڈز سے بچاؤ کا سبب ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مختون (وہ شخص جس کا ختنہ ہوا ہے) ایڈز میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ مختون کے مقابلے میں غیر مختون اس کا زیادہ شکار ہوتے ہیں (۲)۔

اوراس سے پہلے بات گزر چکی ہے کہ ختنہ سے آدمی ضیق غلفہ (phimosis) سے بھی محفوظ رہتا ہے (۳)۔

ختنہ، سوزاک (ایک بیماری جس میں پیشاب سوزش کے ساتھ آتا ہے) کی بیماری سے بچنے میں معاون ہوتا ہے، تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سوزاک کے مریضوں میں غیر مختون لوگوں کا تناسب مختون کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے (۴)۔

ختنہ نہ کرنے سے پیشاب کی بندش اور گردے کی پتھری کے خطرات موجود رہتے ہیں، بلکہ بے شمار مریض ختنہ نہ ہونے کی وجہ سے پتھری کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں (۵)۔ دوسرے لفظوں میں ختنہ نہ کرنے والوں میں یہ مرض زیادہ پایا جاتا ہے۔

---

(۱) دیکھیے: سنت نبوی اور جدید سائنس حصہ دوم (ص ۳۶۱) ۔

(۲) دیکھیے ختان الذکور والاناث ص ۳۵۱۔۳۵۲۔ سنتِ نبوی اور جدید سائنس حصہ دوم (ص ۳۶۲)۔

(۳) نیز دیکھیے ختان الذکور والاناث، ص ۳۵۵۔۳۵۶۔

(۴) تفصیل کے لیے دیکھیے اسرار الختان تجلی فی الطب الحدیث ص ۳۷۔۳۹ (بحوالہ ختان الذکور والاناث ۳۶۰)، نیز دیکھیے سنتِ نبوی اور جدید سائنس، دوم (ص ۳۵۸۔۳۶۰)۔

(۵) دیکھیے سنت نبوی اور جدید سائنس حصہ اول (ص ۲۶۴)

ختنے کے بارے میں متفرق مسائل:

(۱) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بچیوں کا ختنہ بھی مستحب ہے، مدینہ میں اس کا رواج تھا، جمہور فقہاء نے اس کو مستحب لکھا ہے، لیکن اس کی تاکید نہیں ہے، ہمارے برصغیر میں اس کو کوئی نہیں جانتا لیکن آج بھی مصر اور بعض دوسرے ممالک میں اس پر عمل ہوتا ہے۔

(۲) بچے کا اگر مال ہے تو ختنے کی اجرت اس کے مال سے ادا کی جائے گی، اس کا مال نہ ہونے کی صورت میں وہ شخص خرچ اٹھائے گا جس کے ذمے بچے کا نفقہ ہے۔(۱)

(۳) بلوغ تک اگر ختنہ نہیں ہوا تو باپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے، اب وہ خود اپنے ختنے کا ذمہ دار ہوگا، خرچ وہی اٹھائے گا، لیکن ترکِ واجب کا باپ کو گناہ ہوگا۔

(۴) بچہ اتنا کمزور ہو کہ ختنہ کرنے سے جان کو خطرہ لاحق ہو تو جب تک طاقت نہ پیدا ہو جائے ختنے کا حکم ساقط رہے گا۔

(۵) مخنث کے ختنے کے سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، لیکن تمام مذاہب کے فقہاء نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس کا ختنہ ضروری نہیں (۲)۔

(۶) اگر کوئی غیر مختون مر جائے تو کسی کے نزدیک اس کا ختنہ ضروری نہیں، اور اکثر علماء کے نزدیک مستحب بھی نہیں ہے، ائمۂ اربعہ کے نزدیک بھی راجح یہی ہے کہ اس کا ختنہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ ختنے کی شرعی اور طبی مصلحتیں موت سے فوت ہو گئیں، اس لیے اس وقت ختنہ ایک فضول عمل ہے (۳)۔

(۷) اگر کوئی مختون پیدا ہو جائے (یعنی پیدائشی طور پر اس کا ختنہ کیا ہوا ہو) تو

---

(۱) المجموع (۱/۱۶۶)۔

(۲) دیکھیے المجموع ورد المحتار ۵/۴۷۹، مواہب الجلیل۔

(۳) المجموع ۱/۱۶۶، المغنی (۳/۴۸۴)، فتاوی ابن تیمیۃ ۱۱/۶۹ (۲۱/۱۱۵)، تحفۃ المودود ص ۱۶۳۔

عام فقہائے شافعیہ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ اتباعِ سنت کے جذبے سے اوزار اس پر پھیرا جائے گا(۱) لیکن امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اس کا ختنہ نہ واجب ہے نہ مستحب ہے(۲) اور امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، یہ ایک عبث عمل ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں، صرف اوزار پھیرنا تو مقصود ہے نہیں، بلکہ وہ مقصود تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، جب مقصود حاصل ہو چکا ہو تو وسیلے کا کوئی مطلب نہیں رہا(۳)۔

(۸) کوئی غیر مسلم مسلمان ہو جائے تو اس کا ختنہ کرنا ضروری ہے، لیکن اگر وہ بڑی عمر کا ہو اور اس کو اس سے جان کا خوف معلوم ہو تو جمہور فقہاء کے نزدیک ختنہ اس سے ساقط ہو جائے گا(۴)۔

(۹) غیر مختون کے بعض احکام میں علماء نے اختلاف کیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک نہ اس کی نماز صحیح ہے، نہ ذبیحہ جائز، نہ شہادت قابل قبول، امام مالک کے نزدیک بھی اس کی امامت جائز نہیں ہے۔ جمہور کے نزدیک اس کے پیچھے نماز صحیح ہے(۵) جمہور کے نزدیک اس کی شہادت بھی قبول ہے(۶)۔ اسی طرح جمہور فقہاء کے نزدیک اس کا ذبیحہ بھی حلال ہے، اس لیے کہ اللہ نے اہل کتاب (یہود ونصاری) کا ذبیحہ حلال کیا ہے، جن میں مختون اور غیر مختون دونوں ہوتے ہیں تو مسلمان کا بدرجۂ اولی جائز ہونا چاہیے(۷)۔

(۱۰) غلفہ (ختنے میں کاٹی جانے والی کھال) کو دفن کرنا مستحب ہے۔

(۱) فتح الباری ۱۳/۳۹۴۔ (۲) المجموع (۱/۱۶۶)۔
(۳) تحفۃ المودود ص ۱۶۱۔ (۴) ایضاً ص ۱۶۲۔
(۵) الہدایۃ ۳/۱۳۷، المغنی ۱۱/۳۵۔ (۶) شرح منتھی الارادات ۱/۲۵۷۔
(۷) المجموع ۹/۵۵۔

(۱۱) اگر ختنہ کرنے والے کی غلطی سے مختون کو کوئی نقصان پہنچے اس کو بیماری لاحق ہو جائے یا مر جائے، اگر ختنہ کرنے والا ماہرِ فن تھا اور اس نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی تو اس پر کوئی قصاص یا تاوان واجب نہیں وہ بری ہوگا، اگر سخت گرمی یا سخت سردی مین ختنہ کرے یا مختون بہت کمزور ہو، اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ اگر مختون بڑا تھا اور اس کی اجازت سے ختنہ ہوا تھا تو ختنہ کرنے والے پر کوئی ذمہ داری نہیں آئے گی، اگر بچہ تھا تو ختنہ کرنے والا ذمہ دار ہوگا، اگرچہ ولی کی اجازت سے ہی ختنہ کیوں نہ ہوا ہو(۱)۔

(۱) تحفۃ المودود ص ۱۵۹۔

ساتواں باب

بچوں کے زیب وزینت اور لباس کے احکام

فصل اول

کان ناک چھیدنے کا حکم

بچی کے کان چھیدنا جائز ہے، اور بچے کے حق میں یہ جائز نہیں ہے، اور دونوں کے درمیان فرق واضح ہے، اس لیے کہ بچی کو زیور پہنائے جاتے ہیں اور اسی مصلحت سے کانوں میں چھید کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور بچے کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ کوئی دینی دنیوی مصلحت اس سے وابستہ نہیں، اس لیے اس کا کان چھیدنا جائز نہیں ہے۔ (۱)

زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کے کان چھیدے جاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی نکیر نہیں کی۔ اور کسی چیز کے جائز ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ یہ کام آپ ﷺ کے زمانے میں ہوتا ہو، اس لیے کہ اگر وہ کام صحیح نہ ہوتا تو اس سے ضرور روک دیا جاتا۔

حدیث شریف میں عورتوں کے بالیاں صدقہ کرنے کا ذکر موجود ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عید کے دن نماز پڑھائی پھر عورتوں کے پاس آئے، حضرت بلال آپ ﷺ کے ساتھ تھے، حضور ﷺ نے عورتوں کو صدقے کی ترغیب دی، بلال کپڑا پھیلائے ہوئے تھے، تو عورتیں اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں بلال کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔ (۲)

اس حدیث سے عورتوں کے کان چھیدنے پر استدلال کیا گیا ہے (۳)۔ نیز حدیث ام زرع (۴) سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ جس میں اس نے اپنی بالیوں کا تذکرہ کیا ہے، اور

(۱) دیکھیے تحفۃ المودود، ص: ۱۷۰-۱۷۱۔

(۲) بخاری، ۹۸، ۵۸۸۳، وغیرہ۔ ومسلم ۸۸۴ و ۸۸۵۔

(۳) دیکھیے فتح الباری ۱۳/ ۳۷۹، حدیث نمبر ۵۸۸۳۔

(۴) یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشہور حدیث ہے۔ جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ گیارہ عورتیں عہد کر کے بیٹھیں کہ وہ اپنے شوہر کی کوئی بات نہیں چھپائیں گی۔ اس میں ایک عورت ام زرع ہے۔ حدیث دیکھیے بخاری (۵۱۸۹) ومسلم (۲۴۴۸)۔

اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا میں تمھارے لیے اسی طرح ہوں جس طرح ابوزرع ام زرع کے لیے تھا۔(۱) واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بچے کے سلسلے میں ساتویں دن سات کام مسنون ہیں، اس میں انھوں نے کان چھیدنے کا بھی تذکرہ کیا ہے(۲)۔

بہرحال فقہاء نے لکھا ہے کہ لڑکیوں کے کان چھیدنے میں کوئی حرج نہیں (۳)

لیکن لڑکوں کا کان چھیدنا جائز نہیں، بعض علماء کے نزدیک اس سے یہ لڑکا بڑا ہونے کے بعد فاسق شمار ہوگا، لیکن کسی ایسی بات پر جس میں اس کا کوئی دخل نہ ہو اس پر فسق کا حکم لگانا زیادتی ہے۔ مسئلے کی صحیح صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ بالغ ہونے کے بعد اپنے اختیار سے بالی پہنتا ہے جس طرح بانکے اور رنگیلے نوجوان پہنتے ہیں تو بلاشبہ وہ فاسق ہوگا، ورنہ صرف سوراخ رہنے سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

ناک میں چھید کرنے کے سلسلے میں علماء قدیم نے کلام نہیں کیا، مگر تیرھوی صدی کے مشہور فقیہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر زینت کے لیے ایسا کیا جاتا ہے تو اس کا حکم بھی کان چھیدنے کی طرح ہے، یعنی یہ جائز ہے(۴)۔

عصر حاضر کے بعض علماء شیخ صالح عثیمین وغیرہ نے یہ فتوی دیا ہے کہ جہاں ناک میں زیور پہنا جاتا ہے وہاں یہ صحیح ہے۔

---

(۱) اس میں حضور ﷺ نے ام زرع کی بالیوں پر نکیر کیے بغیر حضرت عائشہ کو اس سے مشابہ قرار دیا۔ اگر یہ بات ناپسندیدہ ہوتی تو حضور ﷺ اس کے استثنا کے ساتھ مشابہ قرار دیتے۔

(۲) المعجم الاوسط للطبرانی (۱/۱۷۰ رقم ۵۵۸)۔

(۳) تبیین الحقائق للزیلعی ۶/۲۲۵، فتاوی ہندیہ ۵/۳۵۷، نہایۃ المحتاج ۸/۲۹۔

(۴) ردالمحتار مع الدر ۹/۶۰۲۔

دوسری فصل

بچوں کے لیے سونے، چاندی اور ریشم وغیرہ کا استعمال

سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال مردوں اور عورتوں سب کے لیے حرام ہے۔ مگر سونے چاندی کے زیورات کا استعمال عورتوں کے لیے جائز ہے۔ اسی طرح ریشم کا استعمال بھی عورتوں کے لیے جائز ہے؛ مگر مردوں کے لیے یہ جائز نہیں۔ اس سلسلے میں متعدد روایتیں ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سیدھے ہاتھ میں ریشم لیا اور بائیں ہاتھ میں سونا، پھر فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں(۱)۔

اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ریشم کا لباس اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام کیا گیا ہے اور عورتوں کے لیے جائز (۲)۔

دوسری حدیثوں کی بنیاد پر (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) چاندی کا حکم بھی سونے کی طرح ہے، ہاں چاندی کی انگوٹھی مرد کے لیے جائز ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کے لیے ان کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

اکثر فقہاء کے نزدیک بچوں کے لیے بھی یہی حکم ہے، لیکن مکلّف نہ ہونے کی وجہ

---

(۱) ابوداؤد (۴۰۵۷) ونسائی (۵۱۴۷-۵۱۵۰) وابن ماجہ (۳۵۹۵)۔

(۲) ترمذی (۱۷۲۰) ونسائی (۵۱۵۱)۔

سے ان پر تو کوئی گناہ نہیں ہوگا، بلکہ پہنانے والے پر گناہ ہوگا(۱)۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ حدیث میں ''ذکور'' کا لفظ ہے جو''ذکر'' کی جمع ہے، جس کے معنی نر کے آتے ہیں خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، اور اس لیے بھی کہ جس طرح اس کو حرام کاموں سے شراب، جُوا، زنا وغیرہ سے روکنا ضروری ہے، اس طرح سونے چاندی اور ریشم سے بھی اس کو دور رکھنا ضروری ہے۔

شافعی فقہاء کے اس سلسلے میں تین اقوال ہیں: ایک تو یہی کہ حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ چوں کہ وہ مکلّف نہیں ہے، اس لیے بلوغ تک اس کو پہنانا جائز ہے۔ تیسرا قول یہ کہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو منع کیا جائے گا اور اس سے دور رکھا جائے گا، اس سے پہلے تک جائز ہے۔ (امام نووی فرماتے ہیں کہ سات سال کے بجائے سنِ تمیز کی قید لگائی جاتی تو زیادہ اچھا ہوتا) اس لیے کہ بہت سے معاملات میں سات سال کی عمر میں بالغ کا حکم اور اس کا حکم برابر ہو جاتا ہے، امام رافعی نے اس سلسلے میں تیسرے قول ہی کو صحیح قرار دیا ہے، اور امام نووی دوسرے قول کو زیادہ صحیح قرار دیتے ہیں، (۲) جب کہ پہلے قول ہی میں زیادہ احتیاط معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اُعلم۔

اسی طرح مہندی بھی چوں کہ مردوں کے لیے حرام ہے، اس لیے بچوں کو بھی اس سے دور رکھا جائے۔

(۱) المغنی ۲/۳۱۰-۳۱۱، ردالمحتار، مرقاۃ المفاتیح ۸/۱۱۲-۲۱۲۔

(۲) المجموع ۴/۲۲۴-۲۲۵، و۵/۳۷۲۔

تیسری فصل
بچوں کے لباس کا حکم

حیا کی اسلام میں جو اہمیت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ بچپن سے ہی بچوں کو حیا کی تعلیم دی جائے (بچوں کی تعلیم وتربیت کے احکام کے باب میں اس سلسلے کی حدیثیں نقل کر کے بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی ضرورت پر ہم نے بحث کی ہے)۔

کپڑے حیا یا بے حیائی کا بڑا ثبوت دیتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ بچے یا بچی کو بچپن میں بھی ایسا کپڑا نہ پہنائیں جس سے بے حیائی کا اظہار ہوتا ہو، آج بہت سے لوگ بچیوں کو ایسے لباس پہناتے ہیں جن سے پورا جسم ظاہر ہوتا ہے، کبھی سینہ کھلتا ہے، کبھی پیٹھ کھلتی ہے اور کبھی کچھ اور حصہ نظر آتا ہے، آج بازاروں میں بے حیا اور فاحشہ مغربی عورتوں کی تقلید میں ایسے ایسے لباس آئے ہیں کہ باحیا آدمی کی نظر جھک جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ صاف کہتے ہیں کہ ابھی تو بچی ہے، بچی چھوٹی ہے کہتے رہتے ہیں یہاں تک کہ بچی بڑی ہو جاتی ہے اور ایسے بے حیا لباس کی عادی ہو جاتی ہے اور اس کی حیا رخصت ہو جاتی ہے، پھر پورا معاشرہ فتنوں میں پڑ جاتا ہے، اس لیے ہر ماں باپ کو اس پر غور کرنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ بچوں کو بچپن ہی سے صحیح شرعی لباس پہنائیں اور گھر سے باہر تو پورا ہی لباس پہنائیں۔

علماء نے صراحت کی ہے کہ ممیز بچوں کو یعنی جب بچے اپنے کو سمجھنے لگیں تو ایسے بچوں کو اور بالخصوص ایسی بچی کو چھوٹا لباس پہنانا جس سے اس کے پاؤں کھلتے ہوں یا جسم کا اندرونی حصہ چھلکتا ہو یا پیٹ، سینہ وغیرہ کوئی حصہ کھلتا ہو، جائز نہیں ہے۔

آٹھواں باب

بچے کی طہارت کے مسائل

فصل اول

بچوں کے پیشاب کا حکم

متعدد صحیح حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دودھ پیتا بچہ اگر کپڑے پر پیشاب کرے تو اس کا دھونا ضروری نہیں، صرف اس پر پانی چھڑکنا کافی ہے، اور بچی پیشاب کرے تو دھونا ضروری ہے۔

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بچے نے دودھ کے علاوہ کوئی غذا نہ کھائی ہو، اگر کوئی چیز کھائے تو دونوں کے پیشاب کا حکم برابر ہوگا یعنی دھونا ضروری ہے(۱)۔

قولی روایتوں کے علاوہ عملی روایتوں سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے:

حضرت ام قیس بنت محصن رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ وہ اپنے چھوٹے بچے کو لے کر جس نے ابھی کچھ کھایا نہیں تھا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، حضور ﷺ نے بچے کو گود میں بٹھایا تو اس نے پیشاب کر دیا، حضور ﷺ نے پانی منگوا کر اس پر چھڑک دیا اور اس کو دھویا نہیں (۲)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تحنیک کے لیے ایک بچے کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا، اس نے پیشاب کر دیا، حضور ﷺ نے پانی منگوا کر اس پر ڈال دیا اور نہیں دھویا (۳)۔

ابوالسمح کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت کرتا تھا، ایک مرتبہ حسن یا حسین

(۱) مسند احمد ۱/ ۷۶، ابوداود (۳۷۸) ترمذی (۶۱۰) ابن ماجہ (۵۲۵، ۵۲۶)۔

(۲) صحیح بخاری (۲۲۳) مسلم (۲۸۷)۔

(۳) بخاری (۲۸۲) مسلم ۲۸)۔

کولایا گیا، بچے نے آپ کے سینے پر پیشاب کر دیا، میں دھونے کے لیے اٹھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ بس پانی چھڑک دو، اس لیے کہ بچی کے پیشاب سے دھویا جاتا ہے اور بچے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی چھڑکا جاتا ہے(۱)۔

ان جیسی حدیثوں کی بنیاد پر جمہور فقہاء ومحدثین نے بچے اور بچی کے پیشاب میں فرق کرتے ہوئے کہا ہے کہ بچے کے پیشاب کرنے سے پانی چھڑکنا کافی ہے، لیکن بچی کے پیشاب سے، بہر صورت کپڑا دھونا ضروری ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک دونوں کے پیشاب میں فرق نہیں ہے، دونوں کے پیشاب سے کپڑا دھونا ضروری ہے، اس لیے کہ پیشاب سے پاکی حاصل کرنے اور دھونے کی احادیث میں بڑی تاکید آئی ہے، بچے کے پیشاب کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا، لیکن دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ جب حدیث میں خود تفریق کی گئی ہے تو قیاس کی یہاں کوئی گنجایش نہیں، صریح حدیث کے سامنے قیاس جائز نہیں۔

اور پانی چھڑکنے سے مراد یہ ہے پانی اس پر ڈال دیا جائے، پانی کا بہنا یا کپڑا نچوڑنا ضروری نہیں۔

اور یہ ضروری ہے کہ بچے نے دودھ کے علاوہ کچھ نہ کھایا ہو، تحنیک میں جو کھجور یا کوئی دوسری چیز دی جاتی ہے یا دوا وغیرہ کے لیے شہد یا کوئی چیز دی جائے تو یہ اس میں شامل نہیں، اس کا شمار کھانے میں نہیں ہوگا (۲)۔

لیکن گائے بکری وغیرہ کا دودھ پیے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلے میں کہیں صراحت نظر سے نہیں گزری، مگر اس زمانے میں اکثر عرب علماء دودھ دودھ میں کوئی فرق نہیں

---

(۱) ابوداود (۳۷۶) ابن ماجہ (۵۲۶) نیز دیکھیے نسائی (۳۰۴)۔

(۲) فتح الباری ۱/ ۵۵۷۔

کرتے ، بلکہ ڈبے کا دودھ بھی اگر اس میں کوئی دوسری چیز ملی ہوئی نہ ہو تو اس کا یہی حکم ہے، اس لیے کہ یہ سب طعام یعنی کھانے کے حکم میں نہیں آتے ،حدیث کے ظاہری الفاظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس میں ہے ''صبی لم یأکل الطعام'' (جس بچے نے کھانا نہ کھایا ہو)،لیکن دوسرے بعض علماء کہتے ہیں کہ احتیاط اس میں معلوم ہوتی ہے کہ انسان اور جانور کے دودھ میں فرق کیا جائے (۱)، اور اُس زمانے میں بچے کو ماں یا دایہ ہی کا دودھ پلایا جاتا تھا، جانور کا دودھ نہیں پلایا جاتا تھا؛ اس لیے بھی فرق کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے، پس جس بچے نے ماں یا کسی عورت کے علاوہ کوئی چیز کھائی ہو، یا کسی جانور کا یا ڈبے کا دودھ پیا ہو، اس کے پیشاب سے بھی کپڑا اسی طرح دھونا چاہیے، جس طرح بچی کے پیشاب سے دھویا جاتا ہے۔ واللہ اُعلم۔

بچے اور بچی کے پیشاب میں فرق کی شرعی حکمتیں:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے اور بچی کے پیشاب میں کیا فرق ہے کہ دونوں کا حکم الگ ہوگیا؟

اس کے کئی جوابات دیے گئے ہیں، امام شافعی سے ایک صاحب نے یہ اشکال کیا انھوں نے جواب میں جو فرمایا اس کی توضیح یہ ہے: دیکھو اللہ نے آدم کو پانی اور مٹی سے پیدا کیا اور یہ پاک چیزیں ہیں، اور حوا کو آدم کے اندر سے پیدا کیا ان کے گوشت اور خون سے مل کر حوا کی پیدائش ہوئی، اور خون ناپاک ہے، بچے کے پیشاب میں آدم کا اثر ہے اور بچی کے پیشاب میں حوا کا اثر، اس لیے شروع ہی سے بچی کا پیشاب دوسری نجاستوں کی طرح

(۱) میں نے اس سلسلے میں سعودی کے عرب مشہور عالم حرم شریف کے مدرس شیخ عبدالرحمٰن عجلان سے سوال کیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا: واللہ اُعلم۔ دونوں احتمالات ہوسکتے ہیں، اور ان کا رجحان دونوں میں فرق کا معلوم ہورہا تھا۔

ہوگا، اور بچے کا پیشاب جب تک اس نے غذا کے طور پر کوئی چیز نہ کھائی ہو ایسا نجس نہیں ہوگا اس لیے پانی چھڑکنا کافی ہے(۱)۔

ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ بچی کے مقابلے میں بچے کو لوگ زیادہ گود میں لیتے ہیں اور بار بار دھونا مشقت سے خالی نہیں، اس لیے پانی چھڑکنے کی رخصت دی گئی(۲)۔

نیز بچی کا پیشاب زیادہ گاڑھا ہوتا ہے اور اس میں بدبو زیادہ ہوتی ہے اس کے بالمقابل بچے کا پیشاب ہلکا اور اس میں بو کم ہوتی ہے(۳)۔

اور بھی فرق بیان کیے گئے ہیں لیکن وہ بہت کمزور معلوم ہوتے ہیں۔

طبی حکمتیں:

یہ تو ہوئیں فقہاء کی توجیہات، انھوں نے اپنے اپنے مطابق اس کی توجیہ کی ہے، لیکن طبی تحقیق سے جو بات ظاہر ہوئی ہے، اس کے سامنے ان تاویلات اور توجیہات کی کوئی ضرورت ہی نہیں، ابھی حال ہی میں (۴) حیرت انگیز تحقیق سامنے آئی ہے، مائیکروسکوب (microscope) کے ذریعے بچی اور بچے کے پیشاب میں موجود بیکٹر یا (Bacteria) کا جائزہ لیا گیا تو حیرت انگیز طور پر بچے کے مقابلے میں بچی کے پیشاب میں بہت زیادہ بیکٹر یا (جراثیم) پائے گئے۔ جس نے اعجازِ نبوی پر مہر تصدیق ثبت کی کہ بیکٹر یا کی دریافت سے صدیوں پہلے رسول اللہ ﷺ نے کیسے یہ فرق بیان کیا؟ یقیناً آپ

(۱) دیکھیے سنن ابن ماجہ(۵۲۵)۔

(۲) فتح الباری ۱/۵۵۹۔

(۳) تحفۃ المودود ص ۱۷۵۔

(۴) یہ تحقیق ابھی حال ہی میں عراق کی یونیورسٹی جامعۃ دھوک میں مکمل ہو کر اپریل ۲۰۰۸ء میں انٹرنیٹ پر دی گئی۔ نہایت حیرت کی بات ہے کہ یہ تحقیق ایسے ملک میں ہوئی ہے جہاں کے مسلمان اس وقت ناگفتہ بہ حالات سے اس وقت گزر رہے تھے، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ مسلمان کسی حال میں علم سے پیچھے نہیں رہتا۔

اللہ ﷺ کے رسول اور خدائے علیم وحکیم سے وابستہ تھے، اور براہِ راست آپ کے پاس اللہ کی طرف سے علم آتا تھا، ورنہ یہ بات ممکن ہی نہیں تھی۔

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ کل ۷۳ دودھ پیتے بچوں پر تحقیق کی گئی، جن میں ۳۸ بچے اور ۳۵ بچیاں تھیں، اوران کو عمر کے لحاظ سے چار جماعتوں میں تقسیم کیا گیا، پہلے گروپ میں ایک مہینے سے کم عمر کے بچے تھے، دوسرا گروپ ایک اور دو مہینوں کے درمیانی عمر والوں کا تھا، اور تیسرا گروپ دو اور تین مہینوں کے بچوں کا تھا، اور چوتھے میں تین مہینے سے زیادہ عمر کے بچے تھے، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ پیٹ میں دودھ کے علاوہ کسی چیز کے پہنچنے کا احتمال بھی بڑھ جاتا ہے۔

پہلے گروپ کے بچوں میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کے پیشاب میں ۴۴ء ۹۵ فی صد بیکٹر یا زیادہ پائے گئے، اور دوسرے گروپ میں ۴۸ء ۹۱ فی صد بیکٹر یا، اور تیسرے گروپ میں ۶۹ء ۹۳ فی صد بیکٹر یا بچوں کے مقابلے میں بچیوں میں زیادہ پائے گئے اور چوتھے گروپ میں ۶۹ فی صد بیکٹر یا بچوں کے مقابلے میں بچیوں کے پیشاب میں زیادہ پائے گئے۔ یہ تحقیق اس میدان کی پہلی تحقیق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب فرق بیان کیا تو یقیناً یہ بات ملحوظ تھی، لیکن لوگوں کے سامنے واضح نہیں تھی، نہ اس زمانے میں لوگ اس کو سمجھ سکتے تھے۔ عام عقل کے لحاظ سے اس پر اشکال ہوسکتا تھا، اس لیے فقہاء نے مختلف توجیہات کیں، تاکہ لوگوں کو عقلی طور پر کچھ اطمینان ہوجائے۔ اب اس تحقیق نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں، اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر اور ایک دلیل ہاتھ آئی (۱)۔

---

(۱) نقشوں کے ساتھ اس پوری تفصیل کے لیے رجوع کیجیے http://netaman.jeeran.com۔

فصل دوم
بچے کا لعاب اور قے کا حکم

قے نجس ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، قے کے بعد منہ نجس ہو جاتا ہے، اس لیے منہ دھونا کلی کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر کوئی چیز کھانا صحیح نہیں، منہ دھونے سے پہلے لعاب گر جائے تو وہ بھی نجس ہوگا، اس لیے کہ اس میں قے کا اثر ہوتا ہے، یہ مسئلہ تو عام حالات میں ہے۔ جہاں تک بچے کی قے اور لعاب کا تعلق ہے تو قے تو نجس ہے، لیکن بچہ چوں کہ بہت قے کرتا رہتا ہے اس کا منہ دھونا ممکن نہیں ہوتا اور اس کا لعاب مستقل گرتا رہتا ہے، اس لیے اس کو معاف رکھا گیا ہے، دوسرے الفاظ میں اس کا شمار معفو عنہ نجاستوں میں ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں سب کے نزدیک یہی حکم ہے(۱)۔

(۱) دیکھیے تحفۃ المودود (ص:۱۷۶)

فصل سوم

نماز میں بچے کو گود میں اٹھانے اور بچوں کو مسجد لے جانے کا حکم

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ نماز پڑھا رہے تھے، اس حال میں کہ اپنی نواسی (رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرتِ زینب رضی اللہ عنہا کی لڑکی) امامہ کو شانوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ جب رکوع میں جاتے تو اتار لیتے اور جب کھڑے ہو جاتے (سجدے سے سر اٹھاتے) تو دوبارہ اٹھا لیتے (۱)۔

اس حدیث میں بظاہر عملِ کثیر (اتنی زیادہ حرکتیں جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے) معلوم ہوتا ہے، اس لیے علماء نے اس میں طرح طرح کی تاویلات کی ہیں (۲)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بعض مالکیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے، اور ان میں سے بعضوں کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کے خصائص میں سے ہے، اور بعض نے یہ دعوی کیا ہے کہ ضرورتاً اور مجبوری میں آپ ﷺ نے ایسا کیا تھا، لیکن سب دعوے باطل اور مردود ہیں، ان پر کوئی دلیل نہیں ہے، اور حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے شرعی قاعدوں کی مخالفت ہوتی ہو، اس لیے کہ اصلاً آدمی پاک ہے، اور اس کے پیٹ میں نجاستیں معفو عنہ ہیں، اور بچوں کے کپڑے اور ان کے بدن کو طہارت پر محمول کیا جائے گا (یعنی وہ پاک سمجھے جائیں گے) جب تک ان کی گندگی اور ناپاکی ظاہر نہ ہو جائے، اور نماز میں حرکتیں جب کم ہوں یا اکھٹی

(۱) صحیح بخاری (۵۱۶) وصحیح مسلم (۵۴۳)۔

(۲) دیکھیے فتح الباری ۲/ ۲۶۸۔

نہ ہوں (بلکہ الگ الگ وقفہ وقفہ سے ہوں) تو ان سے نماز باطل نہیں ہوتی ، اور ان سب چیزوں کے دلائل بالکل ظاہر ہیں، اور آپ ﷺ نے بیان جواز کے لیے یہ کیا تھا(۱)۔

اس حدیث سے یہاں ہمارے موضوع سے متعلق کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ بچوں کے کپڑے اور جسم جب تک گندگی ظاہر نہ ہو، پاک ہیں۔

۲۔ بچوں کو مسجد میں لے جانا درست ہے۔

۳۔ بچے کو اس طرح اٹھا کر نماز پڑھنا صحیح ہے، لیکن اس میں چوں کہ کچھ حرکتیں ہو ہی جاتی ہیں، اور بچے کے گرنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے اس لیے ایسا نہ کرنا بہتر ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ کو بچوں سے جو محبت وشفقت تھی وہ اس سے بالکل ظاہر ہے۔ نماز بہت خشوع وخضوع چاہتی ہے، اس کے باوجود آپ ﷺ نماز میں بھی بچوں کو گود میں اٹھا لیتے تھے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے، جب سجدے میں گئے تو آپ کے نواسے حسن اور حسین آپ کی پیٹھ پر چڑھ گئے، جب آپ ﷺ نے سجدے سے سر اٹھایا تو آہستہ سے پیچھے سے ان کو پکڑا اور زمین پر اتارا۔ پھر جب سجدے میں گئے تو وہ دوبارہ پیٹھ پر چڑھ گئے، یہاں تک کہ آپ نے اس طرح نماز پوری کی۔(۲)۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے اور آپ کے نواسے حضرت حسن آپ کے بغل میں تھے۔(۳)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ

---

(۱) شرح مسلم نووی (۵/۳۴-۳۵)۔

(۲) احمد ۲/۵۱۳) اسی کے قریب ایک اور قصہ بھی حدیث میں آیا ہے، دیکھیے مسند احمد (۳/۴۹۳-۴۹۴) و(۶/۴۶۷) ونسائی (۱۱۴۱)۔

(۳) بخاری (۲۷۰۴)

دے رہے تھے کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما لڑکھڑاتے ہوئے آئے، حضور ﷺ نے منبر سے اتر کران کو لیا پھر منبر پر چڑھے اوران کو اپنے سامنے بٹھایا اور فرمایا: سچ کہا اللہ نے: إنما أموالكم و أولادكم فتنة (سورۃ التغابن:۱۵) یعنی تمھارا مال اور اولاد تمھارے لیے آزمایش ہے، میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہوسکا۔ یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ پھر خطبہ دینے لگے(۱)۔

آگے بچوں کے روزے کے سلسلے میں بھی ایک حدیث آرہی ہے جس میں بچوں کو مسجد لے جانے کا تذکرہ ہے، یہ اور اس طرح کی دیگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو مسجد لے جانا درست ہے، اور جب تک نجاست اور گندگی ظاہر نہ ہو ان کے بدن اور کپڑوں کو پاک سمجھا جائے گا۔

اور بچوں کو مسجد لے جانے کا جواز ان حدیثوں سے بھی ملتا ہے، جن میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ بچوں کے رونے کی آواز سن کر رسول اللہ ﷺ نماز مختصر کرتے تھے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں کہ طویل نماز پڑھوں، لیکن بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں نماز مختصر کر لیتا ہوں کہ کہیں اس کی ماں کو مشقت نہ ہو۔(۲)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اس طرح کی روایت ملتی ہے(۳)

نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بچے کا رونا سن کر آپ نماز مختصر کرتے تھے، اس خوف سے کہ اس کی ماں پریشانی میں نہ پڑے۔(۴)۔

ان حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بچوں کے مسجد میں رونے سے غصے میں نہیں آنا چاہیے، بلکہ ان کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ ہونا چاہیے نہ کہ سختی کا۔

---

(۲) احمد (۳۵۴/۵) ابوداود (۱۱۰۹) ترمذی (۳۷۷۴) ونسائی (۱۵۸۵) وابن ماجہ (۳۶۰۰)۔

(۲) بخاری (۷۰۷)

(۳) بخاری (۷۰۹۔۷۱۰)۔

(۴) بخاری (۷۰۸)۔

نواں باب
نسب کے احکام ومسائل

فصل اول

نسب کی سماجی اور شرعی اہمیت

نسب کی اہمیت سماجی لحاظ سے بھی ہے اور شرعی لحاظ سے بھی۔ خاندانی نظام کی بنیاد نسب ہی پر قائم ہے۔ اسی کے فقدان سے آج یورپ وامریکہ میں خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ نسب ہی سے افراد ایک دوسرے سے جڑتے ہیں، رشتے وابستہ ہوتے ہیں، خاندان باہم دگر اور شیر وشکر ہوتے ہیں، اور محبت وشفقت، رحم وکرم، ہمدردی اور بھائی چارگی والا معاشرہ قائم ہوتا ہے اور ایک صالح تمدن وجود میں آتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک عظیم احسان کے طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے، ارشاد ہے: ﴿وهو الذی خلق من الماء بشراً و جعله نسباً و صهراً، و كان ربك قديراً﴾ (الفرقان: ٥٤)

(اللہ ہی تو ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو نسبی اور سسرالی رشتوں میں جوڑا اور تمھارا پروردگار تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

اور پھر بہت سے شرعی احکام اس سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً نکاح کی حرمت، میراث کا استحقاق، مرض الموت میں وصیت، نکاح اور مال کی ولایت، بچے کی رضاعت اور حضانت، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، دیت کے مطالبے کا حق، ماں باپ سے قصاص کا سقوط، ایک دوسرے پر نفقے کا وجوب وغیرہ۔ یہ تمام باتیں صرف اور صرف نسب کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہیں، اگر نسب ثابت اور معلوم نہ ہو تو کوئی کسی کا مال دبا لے، کسی کی میراث لے اڑے، کسی کی وصیت کا مستحق ثابت کرے، کسی دیت کا حق جتائے۔ اور اگر نسب کا پتا نہ چلے تو کتنے بچے ضائع ہو جائیں، کتنے والدین دکھ اٹھائیں، کتنے رشتے دار آنکھوں کے سامنے بے چارگی اور ذلت جھیلیں اور ظلم وستم کا شکار ہو جائیں، پھر باپ بیٹی سے شادی

کرے، ماں بیٹے کے نکاح میں آئے، چچا بھتیجی سے رشتہ کرے اور ماموں بھانجی پر ہاتھ ڈالے، اور اس طرح انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے، اور عصمت وحیا کی چادر تار تار ہو جائے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے نسب کا انکار کرنے یا دوسرے کی طرف منسوب کرنے کو سخت ترین جرم اور حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے: ''جو جان بوجھ کر اپنی نسبت باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف کرے تو جنت اس پر حرام ہے (۱)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے باپ سے گریز نہ کرو (یعنی اپنا نسب ان سے الگ نہ کرو) جو ایسا کرے تو وہ کفر ہے۔ (۲)۔

اور انھی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو انھوں نے کہتے ہوئے سنا:

جو عورت بچے کو ان لوگوں کی طرف منسوب کرے جن سے اس کا نسبی تعلق نہیں، تو اس عورت کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، (اللہ اس سے سخت بیزار ہوگا، توجہ ہٹا لے گا) اور اللہ اس عورت کو ہرگز اپنی جنت میں داخل نہیں کرے گا اور جو مرد اپنے بچے کے نسب کا انکار کرے جب کہ وہ اس کو جانتا ہے (۳) تو اللہ اس کو اپنی رحمت سے دور رکھے گا اور اگلوں پچھلوں (یعنی تمام خلائق) کے سامنے اس کو رسوا کر دے گا (۴)۔

---

(۱) بخاری (۴۳۲۶، ۴۳۲۷، ۶۷۶۶، ۶۷۶۷) ومسلم (۶۳) اس حدیث کو حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابو بکرہ دونوں نے روایت کیا ہے، اور بڑی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے محفوظ رکھا، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد......

(۲) بخاری (۶۷۶۸) ومسلم (۶۲)۔

(۳) ابوداؤد اور نسائی میں وھو ینظر إلیه کا لفظ ہے ھو کی ضمیر باپ کی طرف لوٹ سکتی ہے اس صورت میں ایک مطلب یہ کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اسی کا بچہ ہے، اور یہی مطلب راجح ہے، اس لیے کہ ابن ماجہ کی روایت میں وقد عرفه کا لفظ ہے، اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اس سے اس کی نہایت بے غیرتی اور ڈھٹائی کی طرف اشارہ ہے، اور ضمیر بچے کی طرف لوٹے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص نہایت درجہ بے رحم اور سخت دل ہے، بچہ تو اس کی طرف دیکھ رہا ہے، اور وہ اپنا بچہ ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ (دیکھیے مرقاۃ ۶/ ۴۳۷، رقم: ۳۳۱۷)۔

(۴) ابوداؤد (۲۲۶۳) نسائی (۳۴۸۱) ابن ماجہ (۲۷۴۳)۔

فصل دوم

ثبوت نسب کی صورتیں

ثبوتِ نسب کی کل پانچ صورتیں ہیں: ۱- نکاح ۔۲- اقرار ۔۳- بیّنہ (دلیل، ثبوت)۴-شہرت ۔۵- قیافہ۔

اوران کی تفصیل سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ نسب کے معاملے میں بچے کی حفاظت اس کی زندگی اور مستقبل کی خاطر بڑی احتیاط کی جاتی ہے، اورامکان پر ماں کے شوہر سے اس کو جوڑ دیا جاتا ہے۔

پہلی صورت: نکاح

نسب کے ثابت ماننے کے لیے پہلی صورت نکاح کا پایا جانا ہے۔یعنی جس شخص کا بچہ مانا جارہا ہے اس کا بچے کی ماں کے ساتھ نکاح کا تعلق ہوخواہ نکاح صحیح ہو یا فاسد،لیکن نکاح ہونا معلوم ہو،مشہور حدیث ہے:الولد للفراش (۱)یعنی جس کے بستر پریعنی جس کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے اس کا مانا جائے گا۔دوسرے الفاظ میں بچہ جس کے نکاح میں پیدا ہوا ہے اس کا ہوگا،مگر نکاح سے نسب ثابت ہونے کی تین شرطیں ہیں:

۱-شوہراس عمر کا ہوجس سے عادتاً حمل قرار پاسکتا ہو،یعنی بالغ ہو۔(۲)۔

۲-دوسری شرط یہ ہے امکانِ وطی سے کم سے کم چھ ماہ بعد بچے کی پیدائش ہوئی ہو، یہ جمہور علماء کے نزدیک ہے اوراحناف کے نزدیک نکاح کے بعد چھ ماہ گزرنا کافی ہے۔لیکن یہ

---

(۱)دیکھیے بخاری(۶۷۴۹)۶۸۱۸۔

(۲)یہ شوافع اور مالکیہ کے نزدیک ہے،احناف اور حنابلہ کے نزدیک مراھق (قریب البلوغ) ہونا بھی کافی ہے۔

متفقہ مسئلہ ہے کہ چھ ماہ سے پہلے بچہ پیدا ہو جائے تو نسب اس سے ثابت نہیں ہوگا، بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ حمل نکاح سے پہلے کا ہے، اس لیے کہ حمل کی سب سے کم مدت چھ ماہ ہے(۱)۔

۳۔عقدِ نکاح کے بعد شوہر اور بیوی کے ملنے کا امکان ہو(۲)۔

اور نکاح فاسد میں عورت کے ساتھ دخول کا پایا جانا ضروری ہے، اگر دخول نہ پایا جائے تو نسب ثابت نہیں ہوگا۔

(مسئلہ) اپنی بیوی سمجھ کر شبہ میں کسی دوسری عورت سے ہم بستری ہوئی یا تین طلاق دی ہوئی بیوی کے ساتھ عدت کے دوران میں جائز سمجھ کر ہم بستری کرے، ان دونوں صورتوں میں بھی جو بچہ ہوگا وہ اگر وطی کے کم سے کم چھ مہینے کے بعد ہو تو اس شخص سے اس بچے کا نسب مانا جائے گا۔

(مسئلہ) بیوی سے ہم بستری سے پہلے شوہر نے طلاق دی، اس صورت میں اگر طلاق کے چھ ماہ سے کم عرصے میں بچہ پیدا ہو تو اس سے اس کا نسب مانا جائے گا، اس لیے کہ یقینی طور پر حمل طلاق سے پہلے کا ہے اور اگر طلاق کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو جائے تو اس سے اس کا نسب نہیں جوڑا جائے گا۔اس لیے کہ اس صورت میں طلاق کے بعد حمل ٹھہرنے کا امکان

---

(۱) قرآن کریم میں ہے، وحملہ وفصالہ ثلاثون شھراً (سورۂ احقاف:۱۵)۔یعنی حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہیں، اور دوسری جگہ قرآن میں دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بیان کی ہے: وفصالہ فی عامین (سورۂ لقمان:۱۴) یعنی بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال ہے، ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے، اور زیادہ سے زیادہ حمل کی مدت احناف کے نزدیک دو سال، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک چار سال، مالکیہ کے نزدیک پانچ سال، مصری اور شامی قانون میں ۳۶۵ دن یعنی ایک شمسی سال ہے۔

(۲) جمہور کے نزدیک عملی امکان ضروری ہے، احناف کے نزدیک عقلی امکان کافی ہے، یہ ایک علمی بحث ہے جس کی یہاں ضرورت نہیں۔

موجود ہے، اور طلاق سے پہلے حمل ہونے کا یقینی ثبوت نہیں۔

(مسئلہ) اسی طرح اگر طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت کے اندر بچہ پیدا ہو جائے تو اس سے اس کا نسب ثابت ہوگا، اور اگر زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل کے بعد بچہ ہو جائے تو اس سے نسب نہیں ثابت ہوگا (۱)۔

(مسئلہ) اگر جڑواں بچے اس طرح پیدا ہو جائیں کہ ان میں ایک بچے سے چھ ماہ پورا ہونے سے ایک دن پہلے پیدا ہو جائے، اور دوسرا بچہ چھ ماہ پورا ہونے کے بعد پیدا ہو تو دونوں میں کسی کا نسب ثابت نہیں ہوگا (۲)۔

(مسئلہ) اگر عدت ختم کر کے دوسرا نکاح کرنے کے بعد عورت کو پہلے شوہر سے حاملہ ہونے پر شک ہو جائے، پھر اس سے چھ ماہ کے اندر بچہ پیدا ہو جائے تو یہ دوسرا نکاح باطل ہوگا، اور بچہ پہلے شوہر کا مانا جائے گا۔ اور اگر اس دوسرے نکاح کے چھ ماہ کے بعد بچہ پیدا ہو جائے تو بچہ دوسرے شوہر کا مانا جائے گا، اس لیے کہ عورت اس کے نکاح میں ہے، اور پہلے سے حمل ہونے کا صرف شبہ ہے (۳)۔

دوسری صورت: اقرار

یعنی یہ اقرار کرے کہ یہ بچہ میرا ہے مگر اقرار سے نسب ثابت ہونے کے لیے متعدد شرطیں ہیں:

۱- جس کے نسب کے بارے میں اقرار کیا جا رہا ہے اس کا نسب معروف نہ ہو، اقرار کرنے والے کے علاوہ کسی دوسرے سے اس کا نسب معروف ہو تو اقرار نہیں مانا جائے گا۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے الفقہ الإسلامی وأدلتہ (۱۰/۷۲۵۶-۷۲۶۳)۔

(۲) فتاویٰ ہندیۃ ۱/۵۳۶، ۵۳۷۔

(۳) نہایۃ المحتاج للرملی (۷/۱۱۹)۔

۲- اقرار کرنے والا ایسی عمر میں ہو جس سے بچہ ہونا ممکن ہو۔

۳- اگر بچہ تصدیق کا اہل ہو(۱)۔

۴- یہ ظاہر نہ ہو کہ اقرار کرنے والا اقرار سے کوئی نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، یا اس اقرار سے کسی نقصان سے بچنا چاہتا ہے، مثلاً کوئی نوجوان بہت سا مال چھوڑ کر مر جائے اس کے بارے میں کوئی دعویٰ کرے کہ وہ میرا بیٹا ہے تو اس کی یہ بات نہیں مانی جائے گی (۲)۔

تیسری صورت: بینہ یعنی ثبوت

نسب ثابت ہونے کی تیسری صورت یہ ہے کہ اس پر بینہ یعنی ثبوت پیش کیا جائے، اور یہاں ثبوت اس طرح مانا جائے گا کہ دو ایسے مرد (۳) گواہی دیں جو گواہی دینے کے اہل ہوں کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے۔(۴)۔

چوتھی صورت: شہرت

نسب ثابت ہونے کی چوتھی صورت یہ ہے کہ اس بات کا عام شہرہ ہو، معاشرے میں عام لوگ اس کو جانتے ہوں، اور یہ بات اتنی مشہور ہو کہ اس کے انکار کی گنجائش نہ ہو (۵)۔

پانچویں صورت: قیافہ

نسب ثابت ہونے کی پانچویں صورت قیافہ ہے یعنی چہرہ بشرہ اور ظاہری علامتیں

(۱) جمہور کے نزدیک عاقل بالغ ہو اور حنفیہ کے نزدیک ممیز ہو۔ تو وہ اقرار کرنے والے کی تصدیق بھی کرے، تفصیل کے لیے دیکھیے الفقہ الاسلامی وأدلتہ (۱۰/ ۷۲۶۵-۷۲۶۷)۔

(۲) الفقہ المنہجی (۴/ ۲۱۶)۔

(۳) امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک مرد اور دو عورتیں بھی ہوں تو گواہی معتبر مانی جائے گی۔

(۴) دیکھیے الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۱۰/ ۷۲۷۱۔

(۵) المغنی ۹/ ۱۶۱، بدائع الصنائع ۶/ ۲۶۶، مغنی المحتاج ۴/ ۴۴۸، حاشیۃ الدسوقی ۴/ ۱۹۸ (۲۳۴۹)۔

دیکھ کر کوئی قیافہ شناس (چہرہ بشرہ اور علامتیں دیکھ کر پہچاننے والا) بتادے کہ یہ فلاں کا بچہ معلوم ہوتا ہے، اس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ایک سے زیادہ آدمی کسی بچے پر دعویٰ کریں، شہادت سے کسی ایک کے بارے میں فیصلہ نہ کیا جاسکتا ہوتو اس صورت میں قیافہ شناس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔

جمہور علماء کا یہی مسلک ہے(۱)۔اس کی دلیل وہ حدیث ہے کہ مجزز مدلجی نے حضرت زید بن حارثہ اور ان کے لڑکے اسامہ بن زید کو دیکھا وہ دونوں چادر میں سر ڈھانکے سو رہے تھے۔ پاؤں نظر آرہے تھے، پاؤں دیکھ کر مجزز نے کہا: یہ پاؤں تو ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اس سے نبی کریم ﷺ کو خوشی ہوئی، اور یہ بات آپ ﷺ کو پسند آئی (۲)۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں قیافہ شناس کی بات پر بچے کا نسب ثابت کرنے کی دلیل ہے، اس لیے کہ حق بات ہی پر رسول اللہ ﷺ خوشی کا اظہار کرتے تھے (۳)۔

حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے بھی اسی کے مطابق فیصلے کیے ہیں (۴)۔

---

(۱) مگر امام ابوحنیفہ اس کے قائل نہیں الولد للفراش والی حدیث کی بنیاد پر، (ابوداؤد (۲۲۶۷-۲۲۶۸) ترمذی (۲۱۳۰) نسائی (۳۴۹۳-۳۴۹۴) ابن ماجہ (۲۳۴۹)۔

(۲) بخاری (۳۵۵۵) ومسلم (۱۴۵۹) بات یہ ہے کہ حضرت زید کا رنگ گورا تھا اور اسامہ کا سیاہ، کچھ لوگ ان کی نسبت کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کو اس سے تکلیف ہوتی تھی، جب قیافہ شناس نے یہ کہا تو آپ ﷺ کو خوشی ہوئی۔

(۳) معالم السنن للخطابی (۳/۲۴۷)۔

(۴) اس سلسلے میں مزید دلائل اور تفصیل کے لیے دیکھیے نیل الأوطار (۵/۸۶-۸۷)۔

فصل سوم

ولدالزنا (حرامی) کا نسب

زنا سے جو اولاد پیدا ہوئی ہو اس کو ولدالزنا کہتے ہیں۔ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا، یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ ولد الزنا کا نسب زانی (زنا کرنے والے) سے ثابت نہیں ہوگا۔ پیچھے جو حدیث گزری ہے وہ پوری اس طرح "الولد للفراش وللعاهر الحجر" یعنی بچہ اس کا مانا جائے گا جس کے نکاح میں عورت ہے، اور زنا کار کو اولاد کیا ملے پتھر ملیں گے۔ یعنی زنا کی وجہ سے اس کو سنگسار کیا جائے گا۔

ولدالزنا کے بعض مسائل:

جب بچے کا نسب زانی سے نہیں جوڑا جائے گا تو اپنے بچے کے اعتبار سے اس پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوگی، اور نہ دونوں میں وراثت چلے گی، بلکہ اس کی ماں کا شوہر ہی شرعاً اس کا باپ سمجھا جائے گا، اور باپ پر اپنے بچے کی جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں وہ اس پر بھی ہوں گی، اور دونوں میں میراث کے احکام بھی نافذ ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص کسی عورت سے (خواہ آزاد ہو یا باندی) سے زنا کرے تو بچہ جو پیدا ہوگا زنا کی اولاد ہے نہ بچہ باپ کا وارث ہوگا اور نہ باپ کو اس کی میراث ملے گی (۱)۔

لیکن پردہ وغیرہ معاملات میں اس سے احتیاط کی جائے گی۔

حضرت سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد بن زمعہ رضی اللہ عنہ (أم

(۱) ترمذی (۲۱۱۳) وابن ماجہ (۲۷۴۵)۔

المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے بھائی) ایک بچے کا قضیہ (معاملہ) لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے۔ سعد نے کہا: یہ میرے بھائی عتبہ کا بیٹا ہے، انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ان کا بیٹا ہے۔ آپ اس کی شکل کو تو دیکھیے۔ عبد بن زمعہ نے کہا: یہ میرا بھائی ہے، میرے والد کے بستر پر ان کی باندی سے پیدا ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے بچے کی شکل دیکھی تو عتبہ سے واضح مشابہت نظر آئی، پھر آپ ﷺ نے عبد سے فرمایا: عبد! وہ تمھارا بھائی ہے، بچہ جس کے بستر پر پیدا ہوا ہے اس کا ہے، اور زانی کے لیے پتھر۔ اور سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: سودہ! تم اس سے پردہ کرو، پھر حضرت سودہ نے اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ (۱)۔

قابل غور ہے کہ شرعاً اور قانوناً یہ بچہ سودہ کا بھائی قرار پایا، مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے سودہ کو پردے کا حکم دیا، اس لیے کہ بچے میں زانی کی مشابہت تھی۔ ایک روایت میں یہاں تک ہے کہ سودہ! تم اس سے پردہ کرو! کیوں کہ یہ تمھارا بھائی نہیں ہے (۲)۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: جہاں تک میراث کا تعلق ہے تو بچہ اس کا حق دار ہے، (یعنی تم میں اور تمھارے خاندان اور اس بچے میں وراثت چلے گی) البتہ تم اس سے پردہ کرو، کیوں کہ وہ تمھارا بھائی نہیں ہے (۳)۔

اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے پردہ اور نکاح کے معلامات میں ولد الزنا زانی کا بیٹا سمجھا جائے گا۔ چناں چہ جمہور فقہاء کا یہ مسلک ہے کہ نکاح کی حرمت میں زنا کی وطی کا حکم حلال کی وطی کی طرح ہے (۴)۔ چناں چہ ولد الزنا اگر چہ شرعاً زانی کا بچہ

(۱) بخاری (۲۲۱۸) و مسلم (۱۴۵۷)۔

(۲) نسائی (۳۴۸۵)۔

(۳) مسند احمد (۵/۴)۔

(۴) فتح الباری (۱۵/۴۷۴) لیکن بھائی قرار دینے کے باوجود حضرت سودہ کو جو پردے کا حکم دیا اس کی توجیہ کے لیے بھی دیکھیے فتح الباری (۱۵/۴۷۲-۴۷۴)

قرار نہیں پاتا، مگر اس کا نکاح زانی کے محرم رشتہ داروں مثلاً اس کی ماں، بیٹی، پھوپھی، بھتیجی سے حرام ہے، اس طرح اس زانی کا نکاح اس ولد الزنا کی بیٹی وغیرہ سے جائز نہیں۔

مگر امام شافعی اور امام مالک وغیرہ کے نزدیک زنا کی وطی کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، بلکہ اس زانی کو جائز ہوگا کہ جس عورت کے ساتھ اس نے زنا کیا ہے اس کی ماں اور بیٹی سے نکاح کرے بلکہ زنا کے نتیجے میں اس سے جو بیٹی ہوئی ہے اس سے نکاح کرنا بھی جائز ہے(۱)۔

جمہور کا مسلک زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

(مسئلہ) ولد الزنا کی امامت کو بعض علماء نے مکروہ قرار دیا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مجاہد کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی مسئلہ یہی ہے۔ بعض شافعی فقہاء نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک اور امام لیث کا کہنا ہے کہ اس کو امام مقرر کرنا مکروہ ہے (یعنی کسی کسی کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے)۔

امام شافعی نے بھی اسی کی صراحت کی ہے کہ اس کو امام مقرر نہ کیا جائے یہ مکروہ ہے اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے (۲)۔ مگر جمہور کے نزدیک ولد الزنا کی امامت میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عائشہ، حسن بصری، عطاء، ابراہیم نخعی، امام اوزاعی، سفیان ثوری، امام احمد، اسحاق بن راہویہ، داؤد ظاہری اور ابن المنذر وغیرہ کا بھی یہی قول ہے(۳)۔

---

(۱) شرح مسلم للنووی ۲۸۲/۱۰ (۳۹/۱۰)۔

(۲) دیکھیے للأم ۱۶۶/۱۔

(۳) دیکھیے المجموع ۱۲۹/۴۔

باپ جس بیٹے کا انکار کرے اس کا نسب:

اگر شوہر نے اپنی بیوی پر الزام لگایا کہ اس نے زنا کیا ہے اور یہ بچہ میرا نہیں، زنا کا ہے، اور لعان (۱)۔ سے یہ بات قرار پائے کہ یہ اس کا بچہ نہیں ہے۔ اس صورت میں بچہ اس کی طرف منسوب ہوگا نہ اس کا وارث ہوگا۔ بلکہ اس کا نسب ماں سے جڑے گا، اور ماں سے وراثت چلے گی۔ اگر شوہر لعان سے رجوع کرے تو پھر اس سے نسب ثابت مانا جائے گا۔ یہ متفقہ مسئلہ ہے۔

اگر باپ اپنے بیٹے کا انکار کرے مگر لعان نہ پایا جائے تو اس صورت میں بچے کا نسب اسی سے جڑے گا، اور اس کو اپنی بیوی پر الزام لگانے کا مجرم قرار دیا جائے گا، اور اس کی سزا دی جائے گی، ائمہ اربعہ سمیت جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ (۲)۔

اگر دونوں طرف سے لعان نہ پایا جائے، صرف باپ کی طرف سے پایا جائے تو امام شافعی کے نزدیک اس کا نسب اس سے نہیں جڑے گا، مگر احناف وحنابلہ کے نزدیک اس کے لیے دونوں طرف سے لعان پایا جانا ضروری ہے (۳)۔

---

(۱) لعان کا مطلب یہ ہے کہ شوہر بیوی پر زنا کا الزام لگاتا ہے تو اس الزام کو صحیح ماننے کے لیے قرآن نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کو حاضر وناظر مان کر اس کی قسم کھا کر کہے کہ وہ اپنے اس الزام میں سچا ہے اور پانچویں دفعہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت۔ عورت اپنے سر سے الزام ختم کر کے سزا سے بچنا چاہتی ہے تو وہ بھی اس طرح چار دفعہ قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص (میرا شوہر) جھوٹا ہے، اور پانچویں دفعہ کہے اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب ہے (سورۃ النور: ۶-۹) اس کے بعد دونوں میں جدائی ضروری ہوتی ہے اور بچے کا نسب اس کی ماں کے ساتھ جڑے گا۔ (دیکھیے صحیح بخاری ۴۷۴۶، ۵۲۵۹، ۵۳۰۹، ۱۴۹۲)۔

(۲) المغنی (۱۱/۱۲۹)

(۳) أیضا (۱۱/۱۳۲)

فصل چہارم
لے پالک کے مسائل

کسی بچے کو گود لینا، اوراس کو پالنا پوسنا متفقہ طور پر جائز ہے، اس لیے کہ اس میں ایک جان کی حفاظت ہے جو مقصدِ شریعت کے عین مطابق ہے۔ مگراس کا نسب پالنے والے سے جوڑنا متفقہ طور پر حرام ہے۔ قرآن مین اس کی صراحت موجود ہے، اللہ فرماتا ہے: وما جعل أدعياء كم أبناء كم (الاحزاب:۴) اور اللہ نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا بیٹا نہیں بنایا۔ اور اگلی آیت میں فرمایا: ادعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله فإن لم تعلموا آباء هم فإخوانكم في الدين ومواليكم۔ (منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہی اللہ کے نزدیک پوری منصفانہ بات ہے، اگر تمھیں پتا نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں)۔

زمانۂ جاہلیت میں منہ بولی اولاد کو بالکل حقیقی اولاد کا درجہ دیا گیا تھا۔ میراث اور حرمتِ نکاح کے معاملے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا، خود رسول اللہ ﷺ نے نبوت سے پہلے زید بن حارثہ کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، یہاں تک کہ ان کو زید بن محمد کہا جاتا تھا۔ مگر یہ آیتیں نازل ہوئیں تو ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کیا گیا (۱)۔ لہٰذا اس کے احکام اجنبی کے ہوں گے۔ نہ حرمت نکاح ہوگی، نہ میراث آپس میں چلے گی، بلکہ اس کے حقیقی رشتہ دار ہی اس کے وارث ہوں گے اور یہ انھی کا وارث ہوگا۔ اور حرمتِ نکاح بھی انھی میں رہے گی۔ اگر اس کے رشتہ داروں کا پتا نہ ہو تو اس کی میراث بیت المال میں جمع ہوگی (۲)

(۱) بخاری (۴۷۸۲) و مسلم (۲۴۲۵)۔

(۲) دیکھیے مصنف عبدالرزاق ۷/۳۶۳ (۷/۴۵۳)۔

اگر بیت المال نہ ہو تو رفاہِ عام کے کاموں میں اس کو لگایا جائے جس کا فائدہ عام مسلمانوں کو پہنچے۔ واللہ اعلم

اگر رضاعت کی عمر میں (دو سال کے اندر) کسی بچے کو گود لیا ہے تو بہتر ہے کہ عورت اس کو دودھ پلائے تاکہ حرمتِ نکاح باقی رہے اور اولاد کی طرح اس گھر میں اس کا رہنا صحیح ہو۔

فصل پنجم

ٹیسٹ ٹیوب بے بی: اقسام واحکام

اولاد اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کے حصول کی خواہش ایک فطری بات ہے۔ اولاد حاصل کرنے کا تو ایک فطری طریقہ ہے یعنی شوہر کا نطفہ یا مادہ منویہ جنسی عمل کے ذریعے بیوی کے رحم میں پہنچ جائے۔ اس کے ممکن نہ ہونے یا اس ذریعے سے اولاد حاصل نہ ہونے کی صورت میں پہلے لوگ صرف یہ کر سکتے تھے اور کرتے تھے، کہ کسی بچے کو گود لے لیتے، اور اس کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے۔

اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے غیر فطری اور زیادہ صحیح الفاظ میں حصولِ اولاد کا غیر شرعی ذریعہ صرف زنا تھا، مگر اب نئے زمانے میں طبی ترقیوں نے اور غیر فطری راہیں کھول دی ہیں، جن میں سے کچھ شرعاً جائز اور اکثر حرام ہیں۔ معاصر فقہاء نے تفصیل سے ان پر کلام کیا ہے۔ عربی میں دسیوں مفصل ومختصر کتابیں ان پر اور ان کے مختلف پہلوؤں پر آ چکی ہیں۔ یہ طریقے جائز ہیں یا نہیں ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے(١)۔ اس سے قطع نظر اس طرح پیدا ہونے والے بچے کے نسب اور اس سے متعلق مسائل سے یہاں بحث ہے، مگر اس سے پہلے ان کا مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ان کے بنیادی طور پر دو طریقے ہیں:

١- اندرونی بار آوری (Intrauterine insemination) جس کو عربی میں

(١) اردو میں ان کے احکام کے لیے اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا کی شائع کردہ کتاب ''المجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمۃ کے فقہی فیصلے'' سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

التلقیح داخل الرحم کہتے ہیں، اس میں مرد کے نطفے کو عورت کے رحم میں انجکٹ کیا جاتا ہے۔اس کا دوسرا نام مصنوعی حمل کاری (Atrificial insemination) ہے جس کو عربی میں التلقیح الصناعی کہتے ہیں۔

۲- بیرونی بار آوری (In Vitro Fertilization/I.V.F) جس کو عربی میں الإخصاب خارج الجسم یاالإخصاب الصناعی کہتے ہیں۔جس میں مرد کے نطفے یا منی (semen) اور عورت کے بیضے یا انڈے (ovum) کو ملا کر ایک شیشے کی نلکی (test tube) میں کسی طبی لیبارٹری میں بار آوری کی جائے۔اس مصنوعی طریقے سے جو بچہ حاصل ہوتا ہے اس کو ٹیسٹ ٹیوب بے بی (Test tube baby) کہتے ہیں۔جس کا عربی نام طفل الأنابیب ہے۔(ا) یہ طریقے کیوں استعمال کیے جاتے ہیں اور ان کی کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں ان کے لیے مفصل معلومات www.Attabeeb.com, www.layyous.com, www.feedo.net, medicalencyclopedia, ChildrenHealth, In vitrofertilization.htm سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ چوں کہ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں اور ان کے شرعی احکام مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہم ان کو مختصراً ذیل میں بیان کرتے ہیں، تا کہ اس بچے کے نسب کے احکام واضح ہو جائیں۔اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں:

پہلی حالت یہ ہے کہ بیضہ اور رحم دونوں ایک ہی عورت کا ہو، اس کی کئی شکلیں ہوتی ہیں:

۱- اگر شوہر کی منی بیوی کے رحم میں انجکٹ کر دی جائے یا مصنوعی حمل کاری کے ذریعے شوہر کی منی اور بیوی کے بیضے کو بیوی ہی کے رحم میں داخل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ بچے کا نسب ماں باپ دونوں ہی سے جڑے گا۔اور وہ ان کا حقیقی بچہ قرار پائے گا۔اس لیے کہ باپ کے نطفے سے ماں کے بیضے سے ماں ہی کے پیٹ میں پیدا ہوا ہے، اور قانونی طور

پر اس کے ماں باپ نکاح کے ساتھ ہیں، پس اس بچے کا نسب ثابت نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اس کے تمام احکام دوسرے بچوں کی طرح ہوں گے۔

۲- ایک شکل تو یہ ہے کہ بیضہ اور رحم ایک ہی عورت کا ہو اور وہ اس شخص کی جس کی منی ہے بیوی ہو، لیکن مصنوعی حمل کاری کا کام شوہر سے الگ ہونے کے بعد کیا جائے یعنی شوہر کی وفات یا طلاق کے بعد اس کا اور اس کی بیوی کا مخلوط مادہ اس کے رحم میں داخل کیا جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ماں ایک ہی ہے اس سے تو نسب ثابت ہوگا، لیکن کیا اس شخص سے بھی اس کا نسب مانا جائے کا جس کی منی ہے۔ عہد حاضر کے فقہاء کے اس سلسلے میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ نسب اس شخص سے مانا جائے گا۔ دلیل یہ ہے کہ جب شوہر کے انتقال کے بعد حمل معلوم ہو یا طلاق یا وفات کے چھ مہینے کے اندر بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا نسب اس سے ثابت ہوگا، اسی طرح شوہر کے انتقال یا طلاق کے بعد مصنوعی حمل کاری سے نسب ثابت ہوگا۔

دوسرا قول جو اکثر فقہاء کا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے اس کا نسب ثابت نہیں مانا جائے گا۔ اس لیے کہ منی کے رحم میں پہنچتے وقت وہ اس کا شوہر نہیں تھا۔ اور نسب نکاح کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جو یہاں باقی نہیں ہے۔ یہ قول مشہور فقیہ شیخ مصطفیٰ زرقا وغیرہ کا ہے۔

ڈاکٹر محمد بن عبدالجواد حجازی النتشہ (قاضی اُردن) نے بعض فقہائے شافعیہ کے احکام پر تخریج کرتے ہوئے ایک تیسرا قول بیان کیا ہے، وہ یہ کہ اگر منی انزال کے وقت صحیح طریقے سے نکلی ہو یعنی عزل سے یا بیوی کے ہاتھ سے، تب اس صورت میں اس کا نسب اس شخص سے مانا جائے گا(۱)۔

---

(۱) دیکھیے المسائل الطبیۃ المستجدۃ فی ضوء القرآن والسنۃ (۱/۲۷۰) تالیف الدکتور محمد بن عبدالجواد حجازی النتشہ (القاضی الشرعی بالأردن)۔

۳- ایک شکل یہ ہے کہ جس عورت کا بیضہ ہے بچہ اسی کے رحم میں پرورش پائے، لیکن منی اس کے شوہر کی نہیں۔ بلکہ کسی اور شخص کی ہو، اس صورت میں بچے کا باپ کون ہوگا؟

اس سلسلے میں فقہاء کی تین رائیں ہیں:

ایک یہ کہ اس عورت کے شوہر سے اس بچے کا نسب جڑے گا اور وہ شخص جس کی منی سے بچہ ہوا ہے اس کا حکم زانی کی طرح ہوگا، جس طرح زانی سے نسب نہیں جڑتا اسی طرح اس سے نہیں جڑے گا۔ اس قول کی بنیاد الولد للفراش والی حدیث کے ساتھ بچے کو بلا نسب رکھ کر ضائع کرنے سے بچانا ہے، لیکن اگر شوہر اپنا بچہ ہونے سے انکار کرے تو لعان کرنا ضروری ہوگا، پھر یہ بچہ صرف ماں سے منسوب ہوگا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس صورت میں بچے کا کوئی قانونی باپ نہیں ہوگا۔ صرف ماں سے نسب جڑے گا، اس لیے کہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ بچہ اس عورت کے شوہر کا نہیں ہے۔ اس کو ادعوھم لآبائھم کے تحت اس کی نفی کرنا ضروری ہے، اور منی والے سے نسب نہیں جڑے گا، اس لیے کہ اس کا حکم زانی کی طرح ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس کا نسب جس کی منی ہے اس سے جڑے گا، اس لیے کہ زانی اگر اپنے سے بچے کا نسب ملائے اور کوئی اس کے مقابل میں نہیں تو نسب اس سے جڑ جائے گا (۱)۔

مگر یہ دلیل بہت کمزور ہے اس لیے کہ اگر بیوی کا شوہر دعوی کرے تو پھر کیا ہوگا؟ اور اس رائے کے حامیوں نے دوسرے دلائل بھی دیے ہیں جو کمزور ہیں، دوسرا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب وہ طریقے ہیں جن میں بیضے والی عورت ایک ہی ہوتی ہے۔ دوسرا طریقہ

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے المسائل الطبیہ المستجدۃ ۱/۲۷۰-۲۷۶۔

یہ ہے کہ بیضہ کسی عورت کا ہو اور رحم کسی عورت کا استعمال کیا جائے (۱)۔

اس کی کئی شکلیں ہوتی ہیں:

۱- ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ شوہر کی منی اور بیوی کا بیضہ بیرونی بارآوری یا مصنوعی حمل کاری کے بعد کسی دوسری عورت کے رحم میں داخل کیا جائے، اس صورت میں نسب کس سے جڑے گا اس سلسلے میں تین طرح کی آرا ہیں:

ایک یہ کہ جس مرد کی منی سے اور جس عورت کا بیضہ ہے، نسب اس سے جڑے گا، کیوں کہ نکاح صحیح میں ایک شوہر اور اس کی بیوی کے مادے کو ملا کر بارآر کیا گیا ہے، تو یہی شرعی طور پر اس کے ماں باپ ہوں گے، میراث اور حرمت کے احکام انھی سے متعلق ہوں گے۔ اور جس عورت کا رحم استعمال ہوا ہے، اس کی حیثیت رضاعی ماں کی ہوگی، یعنی کبھی اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، اور نہ میراث چلے گی، البتہ حرمتِ نکاح ہوگی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس بچے کا نسب جس عورت کے رحم میں پیدا ہوا ہے، اس سے اور اس کے شوہر سے جڑے گا۔ اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے، نساء کم حرث لکم (البقرۃ: ۳۰) یعنی تمھاری بیویاں تمھاری کھیتی ہیں، تو اس کی کھیتی میں پرورش ہوئی ہے، تو

---

(۱) اس دوسری عورت کو انگریزی میں (surrogate mother) یعنی کرائے کی ماں کہتے ہیں، جس کا عربی میں ترجمہ الأم المستأجرة ہوتا ہے، چناں چہ ایسی ماں کے لیے عربی میں یہ نام استعمال بھی ہوتا ہے، اس کے علاوہ عربی میں اس کو مختلف نام دیے گئے ہیں: الأم البديلة، الرحم المستأجر، الحاضنة، الأم بالوكالة، البطن المستأجر، الرحم الظئر، المضيفة، الأم الكاذبة، شتل الجنين، الرحم المستعار، الأم بالإنابة۔ لیکن الأم البديلة یا الرحم المستأجر زیادہ استعمال ہوتے ہیں، اور اس کو الرحم المستأجر یا الأم المستأجرة (surrogate mother) یعنی کرائے کی ماں اس لیے کہتے ہیں کہ عموماً اس کو بقیمت استعمال کیا جاتا ہے، اور اس کے لیے بڑی خطیر رقم ادا کی جاتی ہے، کبھی تو یہ رقم پچاس ہزار ڈالر سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، اب تو یورپ و امریکہ میں یہ مستقل کاروبار بن گیا ہے، دکانیں کھل گئی ہیں، یعنی باقاعدہ ایجنسیاں قائم ہیں، جس سے یہ ایجنسیاں خوب کما رہی ہیں

اس کی طرف منسوب ہوگا۔اور الولد للفراش کے تحت بھی بچے کی نسبت اسی کی طرف ہوگی۔

تیسرا قول شیخ یوسف القرضاوی کا ہے، وہ یہ کہ باپ تو اس کا وہی ہے جس کی منی سے وہ پیدا ہوا ہے، اور ماں وہ ہے جس کے پیٹ سے وہ پیدا ہوا ہے۔(۱)۔

۲- دوسری شکل: پہلی شکل کی طرح ہی ہے، مگر اس میں یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے مخلوط مادے (Frozen Embryo) کو دونوں کے انتقال کے بعد دوسری عورت کے رحم میں داخل کیا جائے۔

اس کے احکام بھی پہلی شکل کی طرح ہیں (۲)۔

لیکن کیا بچہ اپنے اصل ماں باپ (جواب مر چکے ہیں) کا وارث ہوگا؟ اس سلسلے میں تفصیل نظر سے گزری۔ آگے ہم نے پیٹ کے بچے کی وراثت کے سلسلے میں جو احکام بیان کیے ہیں اس میں یہ بات آئے گی کہ باپ کے انتقال کے وقت ماں کے پیٹ میں بچہ ہے تو اس کے وارث ہونے پر اجماع ہے، اب یہاں اس کی اصل ماں جس کے بیضے سے وہ پیدا ہوا ہے رہی نہیں، اور متبادل ماں کے رحم میں بھی وہ ہے نہیں، بلکہ باہر ہے، لیکن پہلی صورت میں بیان کیے ہوئے اختلاف کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس کا باپ وہ مانا جائے جس کے نطفہ سے وہ پیدا ہوا ہے، اور اس کی ماں اس کو قرار دیا جائے تو ان دونوں کا وہ وارث ہوگا۔ اور ان میں سے اگر مرد کو اس کا باپ قرار دیا جائے اور یہ عورت اس کی ماں نہ مانی جائے، جیسا کہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کہتے ہیں تو اس صورت میں وہ صرف باپ کا وارث ہوگا اور اس ماں کی وراثت اس کے لیے نہیں رکھی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

(۱) المسائل الطبیہ المستجدۃ (۱/۲۷۸-۲۸۲)۔

(۲) دراسات فقہیہ فی قضایا طبیہ معاصرۃ (۲/۸۱۶) مقالۃ الأم البدیلۃ (الرحم المستأجر) رؤیۃ إسلامیۃ للدکتور عارف علی عارف۔

۳- ایک صورت یہ ہے کہ ایک عورت کا بیضہ دوسرے مرد کے نطفے سے جو اس کا شوہر نہیں ہے، مصنوعی حمل کاری کے ذریعے دوسری عورت کے رحم میں داخل کیا جائے، اس صورت میں یہ زنا کی اولاد کی طرح ہوگا؛ اس لیے کہ ایک مرد کا نطفہ ایسی عورت کے پیٹ میں داخل کیا جارہا ہے جو اس کی بیوی نہیں ہے، اس لیے جس کے نطفے سے پیدا ہوا ہے وہ اس کا باپ نہیں ہوگا، اور کرایے کی ماں کا شوہر بھی اس کا باپ نہیں ہوگا اس لیے کہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ اس کے نطفے سے پیدا نہیں ہوا۔ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا بچہ ہونے کی نفی کرے(۱)۔

۴- ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ شوہر کی منی دوسری عورت کے بیضے کے ساتھ اس کی بیوی کے رحم میں داخل کی جائے، اس صورت میں دو قول ہیں:

ایک یہ کہ بچے کا نسب اس میاں بیوی سے جوڑا جائے گا جس کی منی اور جس کے رحم میں وہ پیدا ہوا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بچے کا نسب باپ سے نہیں جوڑا جائے گا، بلکہ اس ماں سے جوڑا جائے گا جس کے بیضے سے وہ پیدا ہوا ہے، اس لیے کہ ایک مرد کا نطفہ ایسی عورت کے بیضے سے ملا کر بار آور کیا گیا جو اس کی بیوی نہیں ہے، تو یہ بچہ ولد الزنا کے مشابہ ہوگا(۲)۔

۵- ایک شکل یہ ہے کہ ایک مرد کا نطفہ ایک عورت کے بیضے کے ساتھ جو اس کی بیوی نہیں ہے، بار آور کیا جائے۔ پھر کسی دوسری عورت کے رحم میں جو اس کی بیوی نہیں اس کو داخل کیا جائے گا۔ اس صورت میں متفقہ طور پر اس کا نسب اس شخص کے ساتھ نہیں جوڑا جائے گا بلکہ ماں کے ساتھ اس کا نسب جڑے گا(۳)۔

---

(۱) دراسات فقہیہ فی قضایا معاصرۃ ۲/ ۸۱۷۔ (۲) المسائل الطبیہ المستجدۃ ۱/ ۲۷۷۔

(۳) ایضاً

یہ سب شکلیں حرام ہیں، اسلام میں اس کی کوئی اجازت نہیں۔

۶- ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کی منی اس کی بیوی کے بیضے کے ساتھ ملائی جائے اور اس کو بارآور کر کے اسی شخص کی دوسری بیوی کے رحم میں داخل کی جائے۔ ضرورت پڑنے پر پوری احتیاط کے ساتھ یہ طریقہ جائز ہے جب کہ یہ یقین ہو کہ اس کی سوکن کا رحم جس میں بچہ پرورش پائے گا خالی ہو، تا کہ ماں کے نسب میں اختلاط نہ ہو جائے (۱)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مصنوعی حمل کاری میں اگر دو عورتیں استعمال ہوتی ہیں تو اس کے باپ کے نسب کے سلسلے میں دو قول ہیں:

۱- جس کے رحم میں پیدا ہوا ہے اس کا شوہر اس بچے کا باپ ہوگا، الولد للفراش اس کی دلیل ہے۔

۲- جس کا نطفہ ہے وہ اس کا باپ ہوگا، اس لیے کہ یہاں یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ اسی کے نطفے سے پیدا ہوا ہے۔

اور اس کی حقیقی ماں کے سلسلے میں بھی متعدد آرا ہیں:

۱- حقیقی ماں وہ ہے جس کا بیضہ ہے، اس لیے کہ یہی پیدائش کا مادہ ہے، اسی سے موروثی اثرات منتقل ہوتے ہیں۔ پس یہی وارث ہوگی، اور جس کے رحم میں پیدا ہوا ہے اس کی حیثیت رضاعی ماں کی ہے، تو اس کے لیے وہی احکام ہوں گے جو رضاعی ماں کے ہوتے ہیں۔

(۱) یہ بہت نازک مسئلہ ہے المجمع الفقہی لرابطۃ العالم الاسلامی نے اپنے ساتویں سمینار منعقدہ ۱۴۰۴ھ میں اس کی اس طرح مشروط اجازت دی تھی، مگر آٹھویں سمینار منعقدہ ۱۴۰۵ھ میں احتیاط کے پیش نظر اس کو ممنوع قرار دیا۔ ڈاکٹر عارف علی عارف نے دونوں فریقوں کے دلائل کا علمی محاکمہ کر کے احتیاط کے ساتھ اس کے جواز کو راجح قرار دیا ہے۔ (دیکھیے دراسات فقہیہ فی قضایا طبیہ معاصرۃ (۲/۸۱۸-۸۲۲)۔

۲-جس کے رحم میں پیدا ہوا ہے وہ حقیقی ماں ہے، اس لیے کہ حمل کا دکھ اسی نے جھیلا ہے اور ولادت کی مشقت اسی نے اٹھائی ہے اور جس کا بیضہ ہے اس کی حیثیت رضاعی ماں کی ہوگی (۱)۔

۳-ایک فریق کی رائے یہ ہے کہ جس کے رحم میں پیدا ہوا ہے وہی ماں ہوگی اور جس کا بیضہ ہے اس کو کچھ نہیں ملے گا یعنی اس کے بیضے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوگی۔

۴-ایک رائے یہ ہے دونوں میں سے کسی عورت کو ماں کا درجہ دیا نہیں جائے گا۔

۵-ایک رائے یہ ہے کہ دونوں کی حیثیت رضاعی ماں کی ہوگی (۲)۔

پس جو اس کا باپ قرار پائے گا اور جو ماں قرار پائے گی انھی میں میراث چلے گی، اور ان کے نسب کی وجہ سے ان کے رشتہ داروں میں میراث کا معاملہ ہوگا (۳)۔

تمام فریقوں کے دلائل کو سامنے رکھنے سے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے نسب اور اس سے متعلقہ احکام کے سلسلے میں جو بات راجح معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کے حقیقی ماں باپ وہی ہوں گے جن کے مادے سے یہ پیدا ہوا ہے۔ اس لیے کہ مرد کا نطفہ اور عورت کا بیضہ ہی اصل چیز ہے، جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو حرمت نکاح، نفقہ اور میراث کے معاملات انھی سے متعلق ہوں گے۔ اور جس کے رحم میں وہ پیدا ہوا ہے اس کی حیثیت رضاعی ماں کی ہوگی، یعنی صرف حرمت ثابت ہوگی، نفقہ اور میراث کے مسائل اس سے متعلق نہیں ہوں

(۱) دونوں فریقوں کے دلائل کی تفصیل کے لیے دیکھیے المسائل الطبیہ المستجدۃ ۱/۲۵۱-۲۶۶، نیز دراسات فقہیہ فی قضایا طبیہ معاصرۃ (۲/۸۲۷-۸۳۶)۔

(۲) ان تینوں آرا کے لیے دیکھیے (دراسات فقہیہ فی قضایا طبیہ معاصرۃ (۲/۸۴۰-۸۴۱)۔

(۳) یہ ایک اصولی بات ہے، مگر اس میں کچھ فرعی اختلاف بھی ہوا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے المسائل الطبیہ المستجدۃ (۱/۲۸۴-۲۹۱)۔

گے، مگر چوں کہ وہ رضاعی ماں سے بہت زیادہ مشقت اٹھاتی ہے اور بچے کی پیدائش میں بڑا کردار ادا کرتی ہے اس لیے حسن سلوک کے وجوب میں حقیقی ماں کے برابر اس کا درجہ ہونا چاہیے(۱)۔ واللہ اعلم۔

(۱) ایک خیال یہ ہوتا ہے کہ باپ تو وہی ہوگا جس کا نطفہ ہے اور دونوں عورتوں کو حقیقی ماؤں کا درجہ دیا جائے۔ حرمت نکاح، حسن سلوک کے وجوب، نفقہ اور میراث میں دونوں کا درجہ برابر ہو۔ میراث میں غالباً جدہ کو اس کی نظیر بنانا صحیح ہو کہ ایک ہو تو سدس اور دو ہوں تو دونوں سدس میں شریک۔ اسی طرح ماں کو جس حالت میں ثلث ملتا ہے تو یہاں دونوں ماؤں کو اس میں شریک کیا جائے اور جس حالت میں سدس اور جس حالت میں ثلث ماقی ملتا ہے دونوں اس میں شریک ہوں۔ اس لیے کہ غور کرنے سے دونوں مائیں اس کی مستحق معلوم ہوتی ہیں، جس کے بیضے سے پیدا ہوا ہے وہ تو اصل ہے اور جس کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اس نے ایک ماں ہونے کی تمام مشقتیں اٹھائی ہیں۔ اہل علم اس پر غور کریں۔ واللہ اعلم

دسواں باب

رضاعت یعنی بچے کو دودھ پلانے کے احکام

رضاعت کا حکم:

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دودھ پلانا کیا ماں کے لیے ضروری ہے، یا پلانے نہ پلانے کا اس کو حق حاصل ہے؟ ضروری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ماں تیار ہو نہ ہو بہر حال بچے کو دودھ پلانا ضروری ہے جب تک کہ کوئی شرعی عذر نہ ہو، اور حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اگر نہ پلائے تو اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا، باپ کی ذمے داری ہے کہ بچے کے لیے دودھ پلانے کا انتظام کرے۔

حنفی شافعی سمیت جمہور علماء کے نزدیک دودھ پلانا ماں کے لیے ضروری نہیں ہے، یعنی اس کو دودھ پلانے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا، خواہ ماں باپ کے نکاح میں ہو یا اس کو طلاق ہو چکی ہو، (۱) قرآن کریم کی آیات کے ظاہر سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے، سورۂ طلاق میں ہے "فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن وإن تعاسرتم فسترضع له اخرى" (آیت:۶) اگر تمھاری بیویاں تمھارے بچوں کو دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو (اگر وہ مطالبہ کریں) اور اگر تم ان کے مطالبے کے مطابق نہ دے سکو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی)۔

مسئلے کی وضاحت یہ ہے کہ اگر ماں کے لیے بچے کو دودھ پلانا ضروری ہوتا تو اجرت کے مطالبے کا اس کو حق نہ ہوتا، اور اس کے انکار پر دوسری عورت کے دودھ پلانے کا

---

(۱) اور طلاق کی صورت میں اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا دیکھیے المغنی لابن قدامہ (۱۱/۴۳۰) مگر شافعی فقہاء نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ بچے کی ولادت کے بعد جو دودھ چھاتی میں اترتا ہے اس کا پلانا ماں کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ عموماً بچے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ (دیکھیے نہایۃ المحتاج، ۷/۱۹۲) احناف کے نزدیک دیانتاً ماں کے لیے بچے کو دودھ پلانا ضروری ہے مگر قضاءً ضروری نہیں یعنی قاضی اس کے لیے اس پر جبر نہیں کر سکتا۔ (رد المحتار ۲/۴۳۳)۔

سوال نہ ہوتا، بلکہ جب تک شرعی عذر نہ ہو اس کو مجبور کیا جاتا، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شوہر کے لیے جائز نہیں کہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے بیوی کو مجبور کرے، اگر وہ مجبور کرے اور بیوی نہ مانے تو اس انکار پر عورت ناشزہ یعنی ایسی نافرمانی کرنے والی شمار نہیں ہوگی جس سے وہ نفقے سے محروم ہوتی ہے۔

مگر تین حالات میں تمام فقہاء کے نزدیک ماں کے لیے اپنے بچے کو دودھ پلانا ضروری ہے:۔

۱- دودھ پلانے کے قابل کوئی دوسری عورت نہ ملے۔

۲- بچہ کسی اور کا دودھ پینے کے لیے تیار نہ ہو۔

۳- باپ نہ ہو، اس لیے کہ پلانے کا انتظام کرنا اس کی ذمے داری ہے، اس کی غیر موجودگی میں ماں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، باپ موجود تو ہو مگر فقر اور ناداری کی وجہ سے دوسری دایہ کا انتظام نہ کر سکے، اسی طرح بچے کا بھی کوئی مال نہ ہو، جس سے انتظام کیا جاسکے ان تینوں صورتوں میں بچے کی زندگی کی خاطر ماں کو مجبور کیا جائے گا، اور اس کو انکار کرنے کا حق نہیں ہوگا (۱)۔

رضاعت کی اجرت:

سورۂ طلاق کی مذکورہ آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بیوی کو دودھ پلانے کی اجرت مانگنے کا حق ہے، پس وہ معقول اجرت کا مطالبہ کرے تو شوہر کے لیے دینا ضروری ہے، خواہ بچے کے باپ کے نکاح میں ہو یا طلاق ہو چکی ہو۔ اور اگر مطالبہ نہ کرے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے تو شوہر کے لیے ضروری نہیں۔ اگر اپنے طور پر دودھ پلا رہی ہو اور اجرت کی

(۱) دیکھیے الفقہ الاسلامی وأدلتہ (۱۰/۷۲۷۶)۔

خواہش کا اظہار نہ کرے تو بعد میں مطالبے کا حق نہیں رہے گا۔ اور اگر حق سے زیادہ مطالبہ کرے تو شوہر کے لیے اس کا مطالبہ پورا کرنا ضروری نہیں، وہ کہیں اور سے دودھ پلانے کا انتظام کرے گا(۱)۔

لیکن احناف کے نزدیک اگر بچے کی ماں اس کے باپ کے نکاح میں یا اس کی عدت میں ہو تو اس کو رضاعت کی اجرت مانگنے کا حق نہیں اس لیے کہ اللہ نے شوہر پر اس کا نان نفقہ واجب ہونے کی قید کے ساتھ دیانتاً اس پر رضاعت کو واجب قرار دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ رضاعت کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے: **وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف** (البقرة/۲۳۳) یعنی بچے کے باپ پر قاعدے کے مطابق ان کو کھلانا اور پہنانا واجب ہے)۔

اور اس کا نان نفقہ شوہر پر نکاح کی صورت میں اور عدت کی حالت میں واجب ہوتا ہے، تو رضاعت کی وجہ سے الگ سے کچھ واجب نہیں ہوگا۔ ہاں اگر وہ اس سے الگ ہو چکی ہو اور عدت میں نہ ہو تو اس کو اس صورت میں چوں کہ نفقہ نہیں ملتا اس لیے اجرت کا حق ہے، لیکن اگر وہ اجرتِ مثل سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور باپ کو کوئی دوسری عورت مل رہی ہو جو مفت میں یا اجرتِ مثل پر دودھ پلانے کے لیے تیار ہو تو باپ کو حق ہے کہ ماں سے بچے کو لے، اس لیے کہ زیادہ اجرت کا مطالبہ کر کے اس نے اپنا حق ختم کر لیا۔ **وإن تعاسرتم فسترضع له أخرى** (اگر اس کا مطالبہ پورا کرنے میں تمھارے لیے دشواری ہو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی) سے یہ بات معلوم ہوتی ہے(۲)۔ اگر باپ کو کوئی دوسری عورت نہ ملے جو ماں کے مطالبے سے کم پر پلانے کے لیے تیار ہو تو باپ کے لیے

(۱) المغنی لابن قدامہ (۱۱/۴۳۱) ونہایۃ المحتاج للرملی ۷/۱۹۳، نیز دیکھیے الفقہ المنہجی ۴/۲۰۶۔

(۲) ردالمحتار لابن عابدین ۲/۳۳۷-۳۴۴، نیز دیکھیے احکام القرآن للجصاص ۳/۴۶۳۔

جائز نہیں کہ ماں کو اس کے دودھ پلانے کے حق سے محروم کرے، بلکہ ماں ہی کو ترجیح دینا ضروری ہے، اس لیے کہ فطری طور پر بچے پر اس کی شفقت دوسری عورت سے زیادہ ہوتی ہے اور اس کا دودھ بھی دوسری عورت کے مقابلے میں بچے کے لیے زیادہ مفید ہوگا (۱) یہ لا تضار والدة بولدها (بقرہ:۲۳۳) یعنی کسی ماں کو اس کے بچے کے بارے میں تکلیف میں نہیں ڈالا جائے گا) کے خلاف بھی ہے اور بچے کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔

ماں کا دودھ اور اس کے فوائد:

ہر ماں کو چاہیے کے بچے کو اپنا دودھ پلائے۔ اس میں ہر لحاظ سے فائدہ ہے، بچے کی پرورش کے لحاظ سے بھی، ماں کی صحت کے لحاظ سے بھی اور اقتصادی لحاظ سے بھی۔ آج کل تو آئے دن اخبارات وغیرہ میں روز اس طرح کی خبریں اور رپورٹیں آتی ہیں کہ ماں کے دودھ میں یہ یہ فائدے ہیں۔

سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ماں کے پیٹ اور شیر خوار گی میں ہی انسان کی صحت وتندرستی، کمزوری یا بیماری کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ بچے کی صحت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ اس کی غذا کا ہے اس سے غفلت اس کی ساری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ماں کے دودھ کے بہت سے فوائد ہیں:

۱- اس میں ذرا شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ دودھ پلانے والے ہر جان دار کے دودھ میں اس کے بچوں کے نشو نما کے لیے تمام ضروری اور مفید اجزا حیاتین وغیرہ نہایت مناسب مقدار میں پائے جاتے ہیں، اور ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں ان کے لیے ان کی ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح انسان کے بچے کے لیے اس کی

(۱) المغنی ۱۱/۴۳۲۔

اپنی ماں کے دودھ میں اس کے مناسب حال جو غذائیت، صلاحیت، تاثیر اور طاقت موجود ہوتی ہے وہ کسی اور دودھ میں خواہ کسی اور عورت کا ہی کیوں نہ ہو، نہیں پائی جاتی۔ خود ماں کی چھاتی میں دودھ کا پیدا ہونا بھی اللہ کے اسی انتظام کو بتاتا ہے کہ بچے کے لیے اس سے مفید اور بہتر کوئی دوسری چیز خواہ دوسرا دودھ ہی کیوں نہ ہو، نہیں ہو سکتی۔

۲- یہ بات بھی مُسلَّم ہے کہ ماں کا دودھ سب سے زیادہ صاف ہوتا ہے۔ دوسرا دودھ کتنا بھی حفاظت سے رکھا جائے وہ اتنا صاف ہو ہی نہیں سکتا۔ ماہرین حفظان صحت بتاتے ہیں کہ دودھ تھنوں سے نکلتے ہی بیرونی فضا سے متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک مکعب انچ میں چھ لاکھ جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو اسے ابالنے سے ختم ہو جاتے ہیں؛ مگر اس کے ٹھنڈا ہوتے ہی پھر پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ماں کا دودھ پلانے سے بچہ ان جراثیم سے محفوظ رہتا ہے اور اس کی صحت اچھی ہوتی ہے۔

۳- ماں کا دودھ معتدل مزاج کا ہوتا ہے، نہ سرد نہ گرم۔ یہ بچے کے معدے کے بالکل مناسب ہوتا ہے۔ بچے کو دوسری غذا یا دوسرا دودھ دینا بھی اس کی صحت اور نشو نما پر اثر ڈالتا ہے۔

۴- ماں کا دودھ بیماریاں لانے والے جراثیم کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرتا ہے، ماں کے دودھ پر پلنے والے بچے اگر میانہ روی کی زندگی بسر کرتے رہیں، تو دوسرے دودھ پر پلنے والے بچوں کی نسبت سل اور دق وغیرہ جیسے مہلک امراض کا بہت کم شکار ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ ان کے جسم میں مختلف امراض کا مقابلہ کرنے کی قوت موجود رہتی ہے۔

۵- ماں کا دودھ نہ پینے سے دانت بھی کمزور پیدا ہوتے ہیں اور ایسا انسان

دانتوں کے بہت سے امراض کا شکار ہوتا ہے اور دانتوں کی بیماریاں مزید بیماریوں کے پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔

۶- ماں کا دودھ ترک کرنے سے بڑا اقتصادی نقصان بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ جانور یا ڈبے کے دودھ کے لیے بہت پیسے خرچ ہوتے ہیں جو درحقیقت ایک زائد بار ہے جو بچے کے باپ پر پڑتا ہے۔

۷- دوسرا دودھ استعمال کرنے سے بچے کی صحت بھی خطرے میں پڑتی ہے۔ اس لیے کہ اس دودھ میں صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا، اگر ہم ذاتی طور پر اس کی صفائی کی فکر کر بھی لیں تو دودھ کی شیشی کی چوسنی (nipple) میں جو جراثیم ہوتے ہیں وہ اپنے مضر اثرات بہر حال ڈالتے ہیں۔ پھر وقت پر دودھ نہ ملنے پر ذہنی طور پر الجھن بڑھ جاتی ہے، اور دودھ سنبھال کر رکھنے کا دردِ سر مول لینا پڑتا ہے۔

۸- ماہرینِ نفسیات کے مطابق ماں جب بچہ کو دودھ پلاتی ہے تو غیر محسوس لہریں دودھ کے ساتھ منتقل ہوتی رہتی ہیں، اور یہی لہریں بچے اور ماں کے درمیان محبت، خلوص و احترام کا باعث بنتی ہیں۔ اور جو ماں بچے کو دودھ نہیں پلاتی، بچے کا اس سے لگاؤ کم ہوتا ہے، اور وہ ماں باپ کے عادات واطوار سے کم حصہ پاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی سلسلے میں کہا تھا:

طفل میں بو آئے کیوں ماں باپ کے اطوار کی　　　دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

۹- براہِ راست ماں کی چھاتی سے دودھ پینے سے بچہ موٹاپے اور بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے، جب ماں بچے کو بوتل سے دودھ پلاتی ہے تو عموماً اس کی یہ فکر اور کوشش ہوتی ہے کہ بچہ پوری بوتل دودھ پی لے، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پورا دودھ اس کے پیٹ میں

انڈیلنے کی کوشش کرتی ہے، جس سے متعدد بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، نیز زیادہ دودھ سے زیادہ چربی پیدا ہوگی، اور بچے کے موٹاپے میں اضافہ کرے گی۔

۱۰- اس سے ماں بھی موٹاپے سے محفوظ رہتی ہے، اس لیے کہ جب ماں حمل سے ہوتی ہے تو اس کا وزن زیادہ ہوتا ہے، وزن کی زیادتی کا ایک سبب اس کے جسم میں چربی کا پیدا ہونا ہے، جب ماں بچے کو اپنا دودھ پلانے میں محنت کرتی ہے، اور اپنی طاقت صرف کرتی ہے تو یہ چربی پگھل جاتی ہے، ورنہ یہ چربی جسم میں جمع ہوتی ہے، اور موٹاپے کا سبب ہوتی ہے، اسی وجہ سے دودھ پلانے والی مائیں عموماً صحت مند ہوتی ہیں اور لمبی عمر پاتی ہیں۔ بہت سی بے حیا عورتیں نسوانی حسن کے زوال کے ڈر سے دودھ نہیں پلاتیں؛ جب کہ ڈاکٹر قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ بچے کو دودھ پلانے سے عورت کے سینے کا حسن قطعاً خراب نہیں ہوتا، مگر اس خبط میں دودھ نہ پلا کر وہ معصوم بچے پر ظلم کرتی ہیں۔ اور اس ظلم پر اللہ کی طرف سے انھیں سخت سزا ملتی ہے، جو عورتیں دودھ ہوتے ہوئے نہیں پلاتیں وہ سینے کے کینسر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اللہ محفوظ رکھے۔ (۱)

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر دودھ پلانے سے ماں کی چھاتیوں میں تکلیف بھی ہو جائے تب بھی دودھ پلانا بند نہ کرنا چاہیے، البتہ دو تین دن جب تک تکلیف رفع نہ ہو دودھ نہ دیں ،لیکن جیسے ہی تکلیف دور ہو جائے بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیں۔ (۲)

تین طرح کے بچوں کو ماں کے دودھ (یا انسانی دودھ) کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی ضرورت کہ اس کے بغیر ان کی صحت اور زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا

---

(۱) سنت نبوی اور جدید سائنس اول، ص ۳۷۶۔ ۳۸۶، اور تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ اهتمام الإسلام بتغذية الطفل للدكتور فاروق مساهل، مجلة الأمة (القطرية)، جلد ۵، شمارہ: ۵۰، صفر ۱۴۰۵ھ مطابق نومبر ۱۹۸۴ء۔

(۲) بچے کی صحت از ڈاکٹر مس سیتہ گیتا، ص:۱۱

ہے:

۱-وہ بچے جونو مہینے کی مدت پوری ہونے سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔

۲-وہ بچے جن کا وزن نو مہینے کے بعد پیدا ہونے کے باوجود کم رہتا ہے۔

۳-وہ بچے جو معدے کی سوزش کا شکار ہوتے ہیں(۱)۔

مصنوعی دودھ اور اس کے نقصانات:

اس کے برخلاف جو دودھ مصنوعی طور پر تیار ہوتا ہے وہ طرح طرح کے مضر اثرات اپنے اندر رکھتا ہے، اس میں فاسفیٹ، سوڈا اور دوسری قسم کے نمک کی خاصی مقدار پائی جاتی ہے، جو بچے کے جسم کے اندر خشکی پیدا کرتی ہے، اور اس سے گردے کا نظام متاثر ہوتا ہے، پیشاب میں موجود نمک کو چھوٹا سا یہ گردہ خارج کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو یہ نمک خون میں پہنچ جاتا ہے، نتیجے میں بچوں کے درجۂ حرارت میں بہت اضافہ ہوتا ہے، یا سانس کی بیماری پیدا ہوتی ہے، یا اسہال ہونے لگتا ہے، اور کبھی تو یہ ساری بیماریاں بیک وقت حملہ ور ہوتی ہیں۔ امریکی ادارۂ اطفال کے ماتحت چلنے والے غذائی کمیشن نے مصنوعی دودھ میں پائی جانے والی نمک کی بڑی مقدار اور اس کے نتیجے میں بچے مستقبل میں خون کے دباؤ کے امراض کا جو شکار ہو سکتے ہیں، اس سے خبردار کیا ہے۔ اور ان کے علاوہ اس میں متعدد نقصانات پائے جاتے ہیں۔ برطانوی وزارتِ صحت کے مطابق ہر سال ۳ ہزار بچے مصنوعی خشک دودھ استعمال کرنے کے نتیجے میں موت کا شکار ہوتے ہیں۔(۲)

معتبر رضاعت:

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتنی دفع دودھ پلانے سے شرعی رضاعت ثابت

(۱) المسائل الطبیۃ المستجدۃ فی ضوء الشریعۃ الاسلامیۃ (۲/۴۰۵)

(۲) دیکھیے ایضاً: ۲/۳۹۸-۴۰۰)

ہوگی؟اس میں علماء کا اختلاف ہے:

۱۔ایک قول یہ ہے کہ تھوڑا سا پلائے یا زیادہ پلائے،حرمت رضاعت دونوں سے ثابت ہوگی،اس لیے کہ آیت میں مطلق دودھ پلانے کا ذکر ہے،تعداد کا ذکر نہیں،اسی طرح ایک حدیث ہے جس میں عقبہ بن حارثؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے شادی کی،ایک دوسری عورت نے آکر کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے،یہ سن کر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا،اور یہ بات آپ ﷺ سے عرض کی،حضور ﷺ نے فرمایا کیسے تمھارا اس سے نکاح ہوسکتا ہے جب کہ ایسا کہا جارہا ہے؟لہذا اس کو چھوڑ دو،عقبہؓ نے اس سے علاحدگی اختیار کی اور دوسری عورت سے شادی کی(۱)۔

یہاں رسول اللہ ﷺ نے دریافت نہیں کیا کہ کتنی مرتبہ دودھ پلایا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ تھوڑا سا اور ایک مرتبہ دودھ پلانے سے بھی حرمت ثابت ہوگی۔

یہ قول صحابہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور تابعین میں سے حسن بصریؒ،سعید بن المسیبؒ،زہریؒ وغیرہ کا ہے اور ائمہ میں سے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے۔

۲۔دوسرا قول یہ ہے کہ کم سے کم پانچ مرتبہ الگ الگ موقوں پر دودھ پلانا ضروری ہے۔اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشہور حدیث ہے کہ پہلے یہ حکم تھا کہ دس مرتبہ دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہوگی پھر یہ حکم منسوخ ہوا اور پانچ مرتبہ دودھ پلانے پر حرمتِ رضاعت کا حکم آیا۔(۲)

یہ صریح اور صحیح روایت ہے اس لیے اکثر محدثین نے اس کو اختیار کیا ہے،صحابہ

---

(۱) بخاری(۸۸،۲۰۵۲،۲۶۴۰)

(۲) صحیح مسلم ۱۴۵۲۔

میں عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے۔ اور تابعین میں عطاءؒ اور طاؤسؒ اس کے قائل ہیں۔ اور ائمہ فقہ میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مفتی بہ قول یہی ہے، امام ابن حزم ظاہری کا بھی یہی مسلک ہے۔

۳۔ بعض علماء کا مذہب یہ ہے تین دفعہ دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہوگی، اس لیے کہ روایت ہے کہ ایک دفعہ یا دو دفعہ پلانے سے حرمت نہیں ہوتی۔(۱) گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہا گیا کہ تین دفعہ میں حرمت ثابت ہوگی۔

مشہور اور بڑے علمائے فقہ میں ابو عبیدؒ، ابو ثورؒ، داؤد ظاہریؒ اور ابن المنذرؒ کا یہ قول ہے۔(۲)

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح پلانے سے حرمت ثابت ہوگی؟ جمہور فقہاء کے نزدیک ماں کی چھاتی سے براہِ راست پینا شرط نہیں ہے، بلکہ کہیں سے بھی اور کسی طرح بچے کے پیٹ کے اندر دودھ پہنچ جائے جس سے وہ اس کی غذا کا کام دے، خواہ دودھ الگ نکال کر حلق میں ٹپکایا جائے یا ناک کے راستے سے دماغ میں پہنچایا جائے (اس لیے کہ وہاں سے پیٹ تک اس کا اثر پہنچتا ہے)(۳)۔

ان حضرات کی دلیل حضرت ابن مسعود کی روایت ہے جس کے الفاظ ہیں: لا رضاع إلا ما أنشز (وفي رواية:شد)العظم وأنبت اللحم (۴)۔ یعنی اس رضاعت کا

(۱) مسلم ۱۴۵۰، ۱۴۵۱۔ (۲) تفصیل کے لیے دیکھیے المغنی ۱۱/۳۱۰-۳۱۱۔

(۳) دیکھیے البحر الرائق (۳/۲۲۱) ورد المحتار مع الدر (۳/۲۰۹) ومواہب الجلیل ۳/۲۲۴، (۲/۴۱۹) ومغنی المحتاج (۳/۴۱۴) ونہایۃ المحتاج (۷/۱۵۱-۱۵۲) وکشاف القناع (۵/۴۴۲) والمغنی (۱۱/۳۱۳)۔

(۴) یہ حدیث مرفوعاً وموقوفاً دونوں طرح سے مروی ہے، موقوف کے لیے دیکھیے ابو داؤد (۲۰۵۹) ومصنف عبدالرزاق ۷/۳۱۷/۷) (۴۶۳) وسنن البیہقی (۷/۴۶۱) اور مرفوع کے لیے دیکھیے احمد (۱/۴۳۲) وابو داؤد (۲۰۶۰) وسنن الدار قطنی (رقم: ۴۳۱۵) وسنن بیہقی (۷/۴۶۰-۴۶۱)۔ محدثین نے موقوف کو صحیح قرار دیا ہے)

اعتبار ہے جس سے ہڈی کو طاقت ملے اور گوشت پیدا ہو، بالفاظِ دیگر جو غذا کا کام دے، اور دلیل اس طرح ہے کہ خواہ براہ راست چھاتی سے پیے یا حلق میں یا ناک میں ٹپکایا جائے وہ بھی اس کی غذا کے کام آتا ہے۔ اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ناک میں دوا ڈالنے سے جس طرح روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح اس سے رضاعت بھی ثابت ہوتی ہے، مگر امام لیث کا کہنا ہے کہ اسی رضاعت کا اعتبار ہے جو براہِ راست بچہ چھاتی سے پیے، اہل ظاہر کا مسلک بھی یہی ہے(۱)۔

دودھ بینک سے رضاعت کا مسئلہ:

مصنوعی دودھ کی خرابیاں اور اس کے مضر اثرات جب سامنے آئے تو عالمی ادارۂ صحت اور اقوامِ متحدہ کے فنڈ برائے اطفال نے اس کا بدل تلاش کرنا شروع کیا، نتیجے میں بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں مغرب میں دودھ بینک وجود میں آئے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ عورتوں کا دودھ جمع کیا جاتا ہے، عورتیں یا تو رضا کارانہ طور پر اپنا دودھ جمع کرتی ہیں یا بینک بقیمت اس کو خریدتا ہے۔ اس کے دو طریقے ہوتے ہیں: یا تو عورتیں اپنے طور پر گھروں میں خاص قسم کے برتنوں میں جو اس کے لیے مقرر ہیں جمع کرتی ہیں، یا وہ خود بینک جاتی ہیں، جہاں خصوصی ماہرین (specialists) کی نگرانی میں خاص پریشر سے ان کا دودھ حاصل کیا جاتا ہے، پھر بینک اس دودھ کو ریفری جریٹر (refrigerator) میں محفوظ رکھتا ہے، اور اس سے ان ماؤں کی مدد کی جاتی ہے جو اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاسکتیں، جب کہ ان بچوں کو انسانی دودھ کی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے۔

جب یہ بینک اسلامی ممالک کے دروازوں پر دستک دینے لگے تو علماء کو اسلامی

(۱) المحلی (۱۰/۱۸۶) دار الکتب العلمیة (۱۴۰۸ھ) حنابلہ اور شافعیہ کے یہاں بھی ایک مرجوح قول اس طرح کا پایا جاتا ہے۔

نقطۂ نظر سے اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس لیے کہ بچوں کی رضاعت کا مسئلہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس سے بہت سے احکام متعلق ہوتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی خاص عورت کا دودھ بچے کو دیا جاتا ہے تو جمہور کے نزدیک وہ اس بچے کی رضاعی ماں ہوگی، اس لیے کہ حرمتِ رضاعت ثابت ہونے کے لیے ان کے نزدیک بچے کا براہِ راست چھاتی سے دودھ پینا ضروری نہیں۔ اور یہاں عموماً پتا نہیں ہوتا کہ کس عورت کا دودھ ہے، تو خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی اپنی رضاعی بہن، رضاعی خالہ، رضاعی پھوپھی، بلکہ رضاعی ماں تک سے نکاح نہ کر بیٹھے۔

ان بینکوں میں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعدد ماؤوں کا دودھ جمع کر کے ملایا جاتا ہے، پھر ضرورت مند بچوں کو وہ دودھ دیا جاتا ہے، اس سے تو اور مسائل پیدا ہوں گے، متعدد رضاعی مائیں ہوں گی جن کا اس کو پتا ہی نہیں ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی رضاعی محرم عورت سے وہ شادی کر لے گا۔

جب یہ صورتِ حال سامنے آئی تو عصر حاضر کے اکثر علماء نے اس طرح کے بینک قائم کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کو ممنوع قرار دیا، اس لیے کہ اس سے رضاعی رشتوں میں گڈ مڈ ہونے کی وجہ سے بہت سے مفاسد پیدا ہوسکتے ہیں، اور حرمتیں پامال ہوسکتی ہیں۔ تنظیمِ اسلامی کانفرنس کے زیر انتظام مجمع الفقہ الإسلامی (اسلامک فقہ اکیڈمی) نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا۔

لیکن علامہ یوسف القرضاوی اور دیگر بعض علماء نے اس کی اجازت دی۔ انھوں نے اس سلسلے میں امام لیث اور ظاہریہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے فتوی دیا کہ اس سے رضاعت ثابت ہی نہیں ہوگی، اس لیے کہ ان کے نزدیک عورت کی چھاتی سے براہِ راست

دودھ پینا اس کے لیے ضروری ہے۔

ان بینکوں سے حاصل ہونے والا دودھ پلانے کی بچے کی صحت کی خاطر کبھی سخت ضرورت پڑسکتی ہے، اس لیے بعض علماء نے اس کی یہ تجویز رکھی کہ اس کو اسلامیایا جائے، یعنی اسلامی اصولوں اور تعلیمات کی روشنی میں ان کا انتظام کیا جائے:

۱- کن کن عورتوں سے دودھ حاصل کیا گیا ہے، ان کا پورا ریکارڈ تیار رکھا جائے، اور یہ دودھ نہ ملایا جائے، اور شیشی یا ڈبے پر نام لکھا جائے کہ یہ فلاں عورت کا دودھ ہے۔

۲- کسی کھانے کی چیز میں اس کو اس طرح شامل کیا جائے کہ فطری دودھ کی صفت ختم ہو جائے، یعنی وہ دودھ دودھ نہ رہے مگر اس کے فوائد باقی رہیں۔

اس طرح احتیاط کے ساتھ ایسے بینک قائم کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔(۱)

رضاعت کی عمر:

یعنی کس عمر میں دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہوگی۔

جمہور علماء کے نزدیک دوسال کے اندر دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہوگی، اس لیے کہ قرآن میں ہے" والوالدات یرضعن أولادهن حولین کاملین لمن أراد أن یتم الرضاعة" (بقرة:۲۳۳) (یعنی جو باپ رضاعت کی مدت پوری کرنا چاہے اس کے لیے ماؤں کو چاہیے کہ پورے دوسال دودھ پلائیں) اس سے معلوم ہوا کہ رضاعت کی مدت دوسال ہے، صرف امام ابوحنیفہ کے نزدیک مدتِ رضاعت ڈھائی سال ہے، اور احناف میں بھی صاحبین یعنی امام ابویوسف اور امام محمد کا قول بھی دوسرے علماء کی طرح

(۱) اس پوری تفصیل، ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے دلائل اور ان کے محاکے اور دوسروں کے دلائل، اور اس سلسلے کی جملہ تفصیلات کے لیے دیکھیے المسائل الطبیة المستجدة فی ضوء الشریعة الاسلامیة (۲/۳۹۷-۴۳۹)۔

دو سال کا ہے۔ بہر حال، رضاعت کے معاملے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے، جس نے کسی کا بھی دودھ پیا ہو، ہمیشہ اس کو یاد رکھنا چاہیے؛ تا کہ نکاح کے معاملے میں حلال وحرام واضح رہے۔ اصلاً تو یہ عمر ہے شرعی رضاعت کی، مگر اس سے پہلے بھی دودھ چھڑایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد بھی پلایا جا سکتا ہے، لیکن کوئی عذر نہ ہو تو دو سال سے پہلے نہیں چھڑانا چاہیے، اور اچانک نہیں چھڑانا چاہیے، آہستہ آہستہ کم کرتے ہوئے چھڑانا چاہیے۔

بچے کی صحت کی خاطر دودھ چھڑانے کا بہترین وقت وہ ہے جب موسم معتدل ہو، نہ زیادہ سردی ہو نہ زیادہ گرمی، جب دانت نکل چکے ہوں، اور وہ دوسری غذا کھا سکتا ہو، معتدل موسم خزاں (پت جھڑ) دودھ چھڑانے کے لیے معتدل موسم بہار سے بہتر ہے، اس لیے کہ اس وقت جاڑے کی آمد آمد ہوتی ہے اور ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے، بچے کی اندرونی حرارت اس میں بڑھتی ہے، اور ہاضمے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری غذا کھانے کی خواہش بھی اس کی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے(۱)۔

حرمتِ رضاعت:

اگر کوئی عورت کسی بچے کو دودھ پلائے اور شرعی طور پر رضاعت ثابت ہو جائے تو وہ اس کی رضاعی ماں بن جاتی ہے اور اس عورت کی بیٹی اس کی رضاعی بہن ہو جاتی ہے، اور اس کے لیے ان کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہو جاتا ہے، اسی طرح رضاعت کی بنیاد پر وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی بنیاد پر حرام ہوتے ہیں (۲)۔

پس اس لڑکے پر مندرجۂ ذیل رشتے حرام ہوں گے:

---

(۱) تحفۃ المودود ص ۱۹۰۔

(۲) بخاری (۲۶۴۷) مسلم (۱۴۴۴)۔

۱-رضاعی ماں ۲-رضاعی نانی ۳-رضاعی دادی ۴-رضاعی خالہ

۵-رضاعی پھوپی ۶-رضاعی بہن ۷-رضاعی بھانجیاں اور بھتیجیاں

جس طرح ان عورتوں کے لیے اس کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے، اسی طرح اس کی اولاد کے ساتھ نکاح کرنا بھی حرام ہے؛ اس لیے کہ اگر ان رشتوں کی حیثیت نسبی رشتے کی ہوتی تو اس کی اولاد ان کے لیے حرام ہوتی، مثلاً بہن کے لیے جس طرح بھائی کے بچوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اس کے بھتیجے ہوتے ہیں، ویسے ہی رضاعی بھائی کے بچے بھی اس کے بھتیجے ہوئے، ان کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ اسی طرح دوسرے رشتوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بچے کے بھائی یا اس کے باپ یا چچا کے لیے ان عورتوں کا نکاح جائز ہوگا۔ اس لیے یہ ان کے لیے اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حالتِ رضاعت میں بیوی کے ساتھ صحبت کرنا:۔

جب عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہو تو اس کے شوہر کو اس کے ساتھ مباشرت یعنی ہم بستری کرنا کیسا ہے؟

اس سلسلے میں دو طرح کی روایتیں وارد ہوئی ہیں:

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دودھ پلانے کے زمانے میں بیوی کے ساتھ ہم بستری کر کے اپنے بچوں کو خفیہ طور پر مار نہ ڈالو، اس سے دودھ پینے والا بچہ کمزور ہوتا ہے(۱)۔

اور ایک حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ حالتِ

---

(۱) ابوداؤد (۳۸۸۱) ابن ماجہ (۲۰۱۲) مسند احمد ۶/۴۵۳، ۴۵۷، ۴۵۸۔ حدیث کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: اس طرح کرنا شہسوار کو گھوڑے سے گراتا ہے، مطلب وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی اس سے بچے میں کمزوری ہوئی ہے پھر وہ بڑا ہو کر گھوڑے کی پشت پر جم کر بیٹھ نہیں سکتا۔

رضاعت میں بیوی کے ساتھ مباشرت کرنے سے منع کر دوں، پھر میں نے دیکھا کہ روم وایران والے ایسا کرتے ہیں، مگر ان کے بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا(۱) اور ایک روایت میں ہے کہ اگر اس سے نقصان پہنچتا تو روم وایران والوں کو نقصان پہنچتا(۲)۔

بظاہر یہ روایتیں ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ عرب اس کو برا سمجھتے تھے اور اس سے بچتے تھے، پہلی حدیث میں آپ نے جو منع فرمایا وہ اسی بنیاد پر تھا اور مشورے کے طور پر تھا، اور ممنوع نہ ہونے کی علت خود آپ نے بیان کی کہ اس سے نقصان نہیں ہوتا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جب عورت اس حال میں حاملہ ہوتی ہے تو اچھا خون پیٹ میں پرورش پانے والے بچے کی غذا کا کام کرتا ہے، اور خون اس کا کم ہو کر بگڑ جاتا ہے، اس لیے اچھا دودھ پیدا نہیں ہوتا، تو جو بچہ اس دودھ کو پیے گا اس پر اس کا اثر ہوسکتا ہے، اس وجہ سے وہ کمزور ہوسکتا ہے، لیکن ایسا نقصان بہت کم بچوں کو پہنچتا ہے، اس لیے اکثر لوگ تو حالتِ رضاعت میں اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے ہیں اور ان کے بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ علامہ ابن قیمؒ اس کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: لیکن بہر حال احتیاط اسی میں ہے کہ جب دودھ پلاتے ہوئے وہ حاملہ ہو جائے تو بچے کو اس کا دودھ نہ پلایا جائے (۳)۔

بچوں کے حلق کی بیماری اور اس کا نبوی علاج:

کسی خاص وجہ سے بچے کو کوئی بیماری لاحق نہ ہوئی ہو تو عموماً بچوں کی صحت و بیماری کا تعلق ماں کی صحت و بیماری سے ہوتا ہے، ماں کے استعمال کرنے والی غذاؤں اور

---

(۱) مسلم (۱۴۴۲)۔

(۲) مسلم (۱۴۴۳)۔

(۳) تحفۃ المودود ص ۱۹۳-۱۹۴۔

دواؤں کا پیٹ کے بچے اور دودھ پیتے بچے پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

تاہم بعض بیماریاں بچوں کی ایسی ہوتی ہیں جو خارجی اثرات سے لاحق ہوتی ہیں، انھی میں حلق کی سوزش کی بیماری ہے جو بہت سے بچوں کو ہوتی ہے۔

پہلے عورتیں بچوں کے حلق میں انگلی ڈال کر اس کو دباتی تھیں، جس سے علاج تو ہو جاتا تھا، مگر بچے کو بہت تکلیف ہوتی تھی، حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا، اور اس بیماری کا بہترین علاج تجویز فرمایا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے بچوں کو حلق کی بیماری میں گلا دبا کر تکلیف نہ دو، قُسط سے علاج کرو(۱)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک بچہ تھا جس کے نتھنوں سے (ناک سے) خون بہہ رہا تھا، حضور ﷺ نے پوچھا کیا ہوا اس بچے کو؟ انھوں نے کہا اس کے گلے میں سوزش ہے، حضور ﷺ نے غصے میں فرمایا یہ کیوں تم اپنے بچوں کو مار ڈالتی ہو؟، جس کے بچے کے گلے میں سوزش ہو یا سر میں درد ہو، اس کو چاہیے کہ قسطِ ہندی کو رگڑ کر بچے کو چٹا دے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کیا تو بچہ تندرست ہو گیا۔(۲)

قسط ایک پودہ ہے، (۳) انگریزی میں اسے costus، اور اردو اور ہندی میں قسط کُست، یا میٹھی کوٹھ کہتے ہیں، اس پودے کی جڑیں دواؤں میں استعمال ہوتی ہیں، ڈاکٹر خالد غزنوی اس سلسلے میں تفصیلات لکھنے کے بعد تحریر کرتے ہیں: ''قدرت نے زبان کے

---

(۱) بخاری (۵۶۹۲) مسلم (۱۵۷۷)۔

(۲) مستدرک حاکم ۴/ ۲۰۵، نیز دیکھیے مسند احمد ۳/ ۳۱۵، ومسند ابی یعلی، رقم ۱۹۰۷۔

(۳) جس کا متعدد ناموں سے حدیث شریف میں ذکر آیا ہے: کست، القسط الھندی، القسط البحری، العود الھندی۔

آخر میں گلے کے اندر دو سپاہی لوزتین کی صورت میں نصب کیے ہیں، جراثیم اگر منہ کے اندر داخل ہو جائیں تو یہ لوزتین ان کو روک دیتے ہیں، اس کوشش کے دوران وہ خود متورم ہو جاتے ہیں۔ گلے کی یہ سوزش بچوں مین بڑی عام ہے، کیونکہ ماں کا دودھ پینے کے دوران ماں کی جلد کے جراثیم ان کے منہ میں داخل ہوتے ہیں، پھر بازار کا دودھ پییں تو فیڈر (دودھ کی شیشی) اور نپل کے جراثیم، بچے کو چپ کروانے والی چوسنی، بچوں کا انگوٹھا چوسنا اور آخر میں بڑوں کی محبت کی سزا۔ بچے کو پیار کرنے والے اکثر ان کے منہ میں اپنی گندی انگلیاں ڈالتے ہیں جس سے گلے میں درد، بخار اور کھانسی ہوتے ہیں۔ بار بار کی سوزش کے بعد لوزتین میں پیپ پڑ جاتی ہے، اب بچہ مسلسل بیمار رہنے لگتا ہے، پرانی عورتیں ان بچوں کے گلوں کے اندر انگوٹھا ڈال کر لوزتین کو زور سے دباتی تھیں، جس سے خون اور پیپ نکل کر گلا ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ان پر توے کی سیاہی یا کوئی ''گھٹی'' لگا دی جاتی تھی، طب جدید میں وہ گلا جو سال بھر سے زیادہ عرصے سے خراب ہو اور بچے کو تین بار سے زیادہ بخار ہو چکا ہو، اس کا علاج یہ ہے کہ اپریشن کر کے لوزتین نکال دیے جائیں۔

جب لوزتین نکل جاتے ہیں تو گلے میں جراثیم کے خلاف رکاوٹ ختم ہو گئی۔ اس اپریشن کے بعد یہ بچہ آخر عمر تک ہمیشہ گلے کی خرابیوں اور کھانسی کا شکار رہتا ہے، کیونکہ اب جراثیم کو براہِ راست سانس کی نالیوں تک چلے جانے کی چھٹی مل گئی، غالباً یہ وہ صورتِ حال تھی جب اذیت میں مبتلا بچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس دیکھا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کی کیفیت اور بعد کے مسائل کو توجہ میں لاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بچوں کے ایسے تکلیف دہ علاج نہ کیے جائیں جب کہ قسط موجود ہے۔

اس بیماری میں مبتلا ہزاروں بچوں کو قسط کا سفوف صبح شام کھانے کے بعد دیا گیا۔

عام طور پر یہ بچے پندرہ دن میں بہتر ہونے لگتے ہیں، اور چھ ہفتوں میں مکمل شفایاب ہو جاتے ہیں، چند بچوں میں دیکھا گیا کہ بہتری کا سلسلہ ایک جگہ پر آ کر رک گیا۔ اس کا حل ایک حدیث سے یوں سمجھ میں آیا کہ ان کو ورس (۱) اور قسط یا درس یا قسط دی جائیں، چناں چہ جب قسط کے ساتھ ورس کی تھوڑی سی مقدار شامل کی گئی تو ہر بچہ تندرست ہو گیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی پر توجہ دی جائے تو اس سے ایک چیز واضح نظر آتی ہے، کہ لوزتین کو نہ نکلوایا جائے۔ انھوں نے اس باب میں جس اعتماد کے ساتھ قسط کا ذکر فرمایا ہے وہ اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ یہ دوائی بہر حال مفید اور مؤثر ہوگی اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔ (۲)۔

---

(۱) یہ ایک پودا ہے جو زیادہ تر یمن میں پایا جاتا ہے، ہندوستان میں بھی ہوتا ہے، اس کی تفصیل اور فوائد کے لیے دیکھیے طب نبوی اور جدید سائنس، حصہ اول، ص: ۳۶۲-۳۶۸۔ اس کی ایک قسم سرخ زعفران کی طرح ہوتی ہے، اور ایک ہلدی کی طرح زرد یہ دونوں قسمیں عرب میں دستیاب ہیں۔

(۲) طب نبوی اور جدید سائنس، حصہ اول، ص: ۲۳۶-۲۳۷۔

گیارہواں باب

بچے کی حضانت اور پرورش کے احکام

حضانت (یعنی بچے کی دیکھ بھال، حفاظت اور پرورش) واجب ہے؛ اس لیے کہ اس کے بغیر بچہ زندہ نہیں رہ سکتا، اور بچے کو ضائع ہونے سے بچانا ضروری ہے۔ حضانت کی سب سے زیادہ حق دار ماں ہے۔ جب اس کے اندر حضانت کے شرائط پائے جائیں، تو اس سے بچے کو چھیننے کا کسی کو حق نہیں؛ بلکہ اگر میاں بیوی کے درمیان علاحدگی بھی ہوجائے تب بھی بچے کی حضانت کا حق ماں ہی کا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرا یہ بیٹا جس کے لیے میرا پیٹ ظرف، میری چھاتی مشک اور میری گود جس کے لیے پناہ تھی (میرے پیٹ میں وہ پیدا ہوا، میری چھاتی سے اس نے دودھ پیا، اور میری گود میں وہ پروان چڑھا) اس کے والد نے مجھے طلاق دی ہے، اور چاہتے ہیں کہ اس کو مجھ سے چھین لیں، حضور ﷺ نے اس عورت سے فرمایا: تجھے اس کو لینے کا زیادہ حق ہے جب کہ تو دوسرا نکاح نہ کرلے(۱)۔

اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ میاں بیوی کی جدائی کے وقت بچہ ہے تو اس کی پرورش ماں کا حق ہے جب تک کہ دوسرا نکاح نہ کرلے(۲)۔

اور یہ بالکل معقول اور فطری بات ہے؛ اس لیے کہ ماں، بچے کے حق میں سب سے زیادہ مشفق ہوتی ہے اور تربیتی معاملات میں مرد سے زیادہ واقف ہوتی ہے، اور باپ سے زیادہ اس میں برداشت کا مادہ ہوتا ہے اور اس کے لیے وقت بھی وہی زیادہ دے سکتی ہے، اور یہ سب چیزیں بچے کے حق میں مفید اور اس کے لیے ضروری ہیں؛ اس لیے شریعت نے اسی کو حق دیا۔

(۱) احمد (۱۸۲/۲) ابوداؤد (۲۲۷۶)۔

(۲) الاجماع لابن المنذر ص ۴۳۔

حضانت کے شرائط:

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضانت کے شرائط کا تذکرہ کیا جائے:

۱۔عقل ہو، کسی پاگل، کم عقل کو حضانت کا حق نہیں، اس لیے کہ ایسا شخص بچے کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتا۔

۲۔بالغ ہو، کسی نابالغ کو بھی حضانت کا حق نہیں، اس لیے کہ وہی شرعاً کسی کی پرورش میں ہوتا ہے۔

۳۔ بچے کی نگہداشت اور پرورش کی صلاحیت ہو، اور اس پر قدرت ہو، چناں چہ نابینا، شدید مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے معذور کو حضانت کا حق نہیں، سفر پر رہنے کی وجہ سے دشواری پیش آ رہی ہو تو اس کو بھی حق نہیں ہوگا۔

۴۔اخلاق وعادات اچھے ہوں، فاسق و فاجر کو حضانت کا حق نہیں، اس لیے کہ اس سے بچے کے بگڑنے اور بددین ہونے کا خطرہ ہے۔

۵۔مسلمان ہو، کسی کافر رشتہ دار کو مسلمان بچے کی حضانت کا حق حاصل نہیں، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے: ”ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا“ (نساء:۱۴۱) (اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنوں پر کافروں کا اللہ نے کوئی حق نہیں رکھا، اور اس سے بچے کے ایمان کا خطرہ ہے۔

۶۔حضانت کا حق رکھنے والی عورت کی شادی کسی ایسے شخص سے نہ ہوئی ہو جو بچے کے لیے اجنبی ہو، اس لیے کہ اس سے بچے کا حق ادا نہ ہونے کا خطرہ موجود رہتا ہے، اگر اس کی شادی بچے کے کسی قریبی رشتہ دار سے ہوئی ہے، مثلاً بچے کے چچا کے ساتھ، اس صورت

میں حضانت کا اس کا حق باقی رہے گا(۱)۔

(مسئلہ) اگر حضانت کا حق رکھنے والی عورت کسی ایسے مرد سے شادی کرے جس کا بچے سے رشتہ نہ ہو، لیکن بچے کا باپ اس عورت کے شوہر کے گھر بچے کے ہونے سے راضی ہو تو اس عورت کا حق باقی رہے گا۔

(مسئلہ) کوئی عورت مرتد ہو جائے اور اس کا چھوٹا بچہ اس کے ساتھ ہو، تو بچے کو اس سے چھینا جائے گا۔

(مسئلہ) کوئی مسلمان بچہ کسی غیر مسلم کے ہاتھ لگے اور وہ اس کی پرورش کرنے پر راضی ہو تب بھی بچے کو اس کے پاس چھوڑا نہیں جائے گا، زبردستی چھینا جائے گا، اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کے سربرآوردہ اور ذمے دار لوگوں کی یہ ذمے داری ہے کہ بچے کو اس غیر مسلم سے واپس لے کر مسلمان ماں باپ تک پہنچائیں۔(۲)۔

---

(۱) یہ سب شرائط تقریبا متفقہ ہیں، ابن قیم نے شرط ۴ کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر اس شرط کو مانا جائے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے اور ملت مصیبت میں پڑ جائے، فاسق وفاجر اور گناہوں کے مرتکب لوگوں کے بچوں کو ان سے چھیننا ضروری ہو جائے جب کہ ایسا کبھی نہیں ہوا (تفصیل کے لیے دیکھیے زادالمعاد ۵/۴۶۱) لیکن ابن عابدین نے جو بیچ کی راہ اختیار کی ہے وہ سب سے بہتر معلوم ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ایسا فسق نہ ہو جس سے بچے کے بگڑنے کا خطرہ ہو، یعنی اگر عورت فسق وفجور میں مبتلا ہے لیکن بچہ اتنا چھوٹا ہے کہ وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا تو عورت کو حضانت کا حق رہے گا، لیکن اگر اس میں اتنا شعور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کی باتوں کا احساس رکھتا ہے تو بچے کو اس کے دین واخلاق کی حفاظت کی خاطر اس عورت سے لیا جائے گا) رد المحتار (۵/۲۵۴)۔ اور احناف نے (اور یہی قول مالکیہ میں سے ابن قاسم اور شافعیہ میں سے ابوثور کا ہے) مسلمان ہونے کی شرط سے اختلاف کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ حضانت میں بچے کو کھلانا پلانا، اور اس کی دیکھ بھال کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ کام کافر عورت بھی کر سکتی ہے لیکن احناف کے یہاں بھی یہ شرط ہے کہ وہ مرتد نہ ہو(۱) (رد المحتار ۵/۲۵۳)

(۲) ۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات کے دوران میں ایک دو سالہ مسلم بچہ مظفر ایک غیر مسلم عورت کے ہاتھ لگا، وہ اب اس کی پرورش کر رہی ہے بچے کے والدین اس کو واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں، معاملہ کورٹ میں زیر سماعت ہے، مسلمانوں ==

(مسئلہ) اگر حضانت کا حق رکھنے والی کسی عورت نے شادی کی ہو، اور بچے کا باپ بچے کو اس کی حضانت میں رکھنے پر تیار ہو تو اس عورت کا حق حضانت باقی رہے گا، منتقل نہیں ہوگا۔

حضانت کا حق رکھنے والی عورتوں کی ترتیب:

اس پر تو اجماع ہے کہ سب سے زیادہ حضانت کا حق ماں کو ہے، اگر اس کا انتقال ہو جائے، یا حضانت کے شرائط میں سے کسی شرط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس کا حق باقی نہ رہے، تو حضانت کا حق رکھنے والی عورتوں کی ترتیب کیا ہوگی، اس کی تفصیل میں فقہاء کے یہاں کچھ اختلاف ہے جو مندرجۂ ذیل بیان سے واضح ہوگا:

فقہ حنفی کے مطابق: ماں، پھر نانی، پھر دادی، پھر حقیقی بہن، پھر اخیافی بہن یعنی ماں شریک بہن، پھر علاتی بہن یعنی باپ شریک بہن، پھر حقیقی خالہ، پھر اخیافی خالہ (ماں کی ماں شریک بہن) پھر علاتی خالہ (ماں کی باپ شریک بہن)، پھر بھانجی، پھر بھتیجی، پھر حقیقی پھوپھی، پھر اخیافی پھوپھی، پھر علاتی پھوپھی، پھر وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ (۱)۔

شافعی فقہ کے مطابق: ماں، پھر نانی، پھر دادی، پھر حقیقی بہن، پھر علاتی بہن، پھر اخیافی بہن، پھر حقیقی خالہ، پھر علاتی خالہ، پھر اخیافی خالہ، پھر بھانجی، پھر بھتیجی، پھر حقیقی پھوپھی، پھر علاتی پھوپھی، پھر اخیافی پھوپھی، پھر وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ (۲)۔

مالکی فقہ کے مطابق: ماں، پھر نانی، پھر حقیقی خالہ، پھر اخیافی خالہ، پھر علاتی خالہ، پھر دادی، پھر حقیقی بہن، پھر اخیافی بہن، پھر علاتی بہن، پھر پھوپھی، پھر بھانجی، پھر جس کو وصیت کی

== کے ذمے داروں پر ضروری ہے کہ مظفر کو اس کے والدین تک پہنچانے کے لیے پوری کوشش کریں، کہ یہ بچے کے دین وایمان کا مسئلہ ہے۔

(۱) بدائع ۳/ ۴۵۷-۴۵۸۔ والدر المختار مع الرد ۵/ ۲۶۲۔

(۲) المھذب ۲/ ۱۷۰-۱۷۱، مغنی المحتاج ۳/ ۴۵۲۔

جائے، پھر عصبہ وراثت کی ترتیب کے مطابق (۱)۔

حنبلی فقہ کے مطابق: ماں، پھر نانی اور اس کے بعد اس کی مائیں، پھر باپ، پھر دادی، اس کے بعد اس کی مائیں، پھر دادا، پھر اسی طرح اس کی مائیں، پھر حقیقی بہن، پھر اخیافی بہن ، پھر علاتی بہن، پھر حقیقی خالہ (۲) پھر اخیافی خالہ، پھر علاتی خالہ، پھر حقیقی پھوپھی، پھر اخیافی پھوپھی، پھر علاتی پھوپھی، پھر اسی ترتیب پر ماں کی خالائیں، پھر اسی ترتیب پر باپ کی خالائیں، پھر باپ کی پھوپھیاں، اسی ترتیب پر پھر بھانجیاں اور پھر بھتیجیاں، پھر چچازاد بہن ، پھر پھوپھی زاد بہن اسی تفصیل کے مطابق، پھر وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ (۳)۔

حضانت کا حق رکھنے والے مردوں کی ترتیب:

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق اگر کوئی عورت بچے کی حضانت کے لیے نہ ملے تو پھر جیسا کہ گذرا وراثت میں جو بطورِ عصبہ کے وارث ہوتے ہیں ان کو اسی ترتیب سے حضانت کا حق ہوگا: باپ، دادا (پردادا اور اوپر تک)، پھر بھائی، پھر بھائی کی اولاد (اور ان کی اولاد کی اولاد نیچے تک) پھر چچا، پھر چچا کی اولاد۔ لیکن کوئی بچی جو اس عمر کو پہنچی ہو جس سے شہوت پیدا ہوسکتی ہے تو ایسی بچی نامحرم وارث کے حوالے نہیں کی جائے گی، جیسے اس طرح کی بچی چچازاد بھائی کے حوالے نہیں کی جائے گی، تاکہ فتنہ اور گناہ سے محفوظ رہے، یہ متفقہ مسئلہ ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، لیکن ہاں چھوٹی بچی کا حقِ حضانت اس کو حاصل ہوگا (۴)۔

(۱) القوانین الفقہیۃ (ص:۲۲۳)، الشرح الصغیر ۲/۷۶۴ و بعد

(۲) اور امام احمد کا ایک قول یہ ہے کہ خالہ بہن سے پہلے ہوگی۔

(۳) کشاف القناع ۵/۴۹۶-۴۹۷، المغنی ۱۱/۴۲۵-۴۲۶۔ (۴) الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۱۰/۷۳۰۱۔

(مسئلہ) اگر حضانت کا حق کسی شرط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے ختم ہوجائے، پھر اگر وہ رکاوٹ ختم ہوجائے تو حضانت کا حق واپس ملے گا۔

حضانت کی اجرت:

جمہور فقہاء کے نزدیک پرورش کرنے والی کو پرورش کی اجرت نہیں ملے گی، اس لیے کہ اگر وہ ماں ہے تو اس کے باپ کی بیوی ہونے کی وجہ سے اس کو نفقہ دینا ہی پڑے گا اور اگر اس کی بیوی نہیں ہے تو اس کے باپ یا شوہر یا کسی اور ولی کے ذمے اس کا نفقہ ہوگا، اور اگر بچے کی ضرورت کی وجہ سے اجرت کی ضرورت پڑ رہی ہو مثلاً بچے کے کپڑے دھونے کی اجرت ادا کرنی پڑ رہی ہے، تو بچے کے حق کی وجہ سے یہ اجرت لازم ہوگی، اور اس کا شمار بچے کے نفقے میں ہوگا۔

احناف کے نزدیک اگر وہ ماں ہے اور اس کے باپ کے نکاح میں یا اس کی عدت میں ہے تو اجرت نہیں ملے گی اور عدت گذرنے کے بعد اجرت کی مستحق ہوگی، اور اگر یہ بچے کی ماں نہیں ہے تو اجرت ملے گی، جیسے کسی کام پر اجرت ملتی ہے، اور رضاعت کی اجرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا یہ مستقل اجرت ہوگی (۱)۔

حضانت کا خرچ:

اگر پرورش کرنے والی کا یا اس بچے کا کوئی مکان نہ ہو اور بچے کی پرورش کسی مکان میں ہو رہی ہو تو اس مکان کی اجرت واجب ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق دراصل بچے کے نفقے سے ہے، تو جس پر اس کا نفقہ واجب ہے اس پر یہ اجرت بھی واجب ہے، اسی طرح بچے کے دیگر کام کاج کے لیے کسی خادم اور نوکر کی ضرورت ہو تو اس کی اجرت بھی واجب

---

(۱) الدر المختار مع الرد ۵/ ۲۵۹ وبعد، الفتاوی الہندیہ ۱/ ۵۴۳

ہوگی اس میں فقہاء کا کوئی اختلاف نظر نہیں آیا۔

جمہور فقہاء کے نزدیک حضانت کا خرچ بچے کے مال میں واجب ہوگا اور اگر بچے کا مال نہیں ہے تو اس کے باپ یا جس پر بچے کا نفقہ واجب ہے اس پر یہ خرچ واجب ہوگا، اس لیے کہ نفقے کا واجب ہونا اس کو ہلاکت سے بچانے کے لیے ہے، تو حضانت اور پرورش بھی اسی وجہ سے واجب ہے، اس لیے حضانت پر جو خرچ آئے گا وہ صاحبِ نفقہ (جس پر نفقہ واجب ہو) پر واجب ہوگا۔ اور جب اجرت واجب ہوگی تو اس کی حیثیت واجب الادا قرض کی ہوگی، یعنی مدت کے گذرنے یا صاحبِ نفقہ کے مرنے یا بچے یا پرورش کرنے والی عورت کے انتقال سے یہ اجرت ساقط نہیں ہوگی (۱)۔

حضانت کی جگہ اور اس دوران میں بچے کو سفر پر لے جانے کا حکم:

اگر بچے کے ماں باپ کے درمیان زوجیت کا رشتہ قائم ہے تو بچے کی پرورش اسی مکان میں ہوگی جہاں شوہر کے ساتھ وہ مقیم ہے۔ حنفیہ نے جو تفصیل بیان کی ہے وہ اس طرح ہے: اگر بچہ ماں کی پرورش میں ہے اور اس کی ماں اس کے باپ کے نکاح میں ہو یا اس کی عدت (عدتِ طلاق یا عدتِ وفات) میں ہو تو حضانت اسی جگہ کرے گی جہاں وہ شوہر کے ساتھ مقیم ہے، اور شوہر کے اجازت کے بغیر بچے کو لے کر کہیں نہیں جاسکتی اور نہ شوہر بچے کو لے کر دوسری جگہ جاسکتا ہے۔

اگر عدت کے بعد اس نے دوسری شادی کر لی ہے، یا اس کا وطن دوسرے شہر میں ہے تو ماں، بچے کو اپنے ساتھ لے کر جاسکتی ہے، لیکن ضروری ہے کہ وہ جگہ اتنی دور نہ ہو جس کی وجہ سے باپ کے لیے بچہ کو روزانہ دیکھنا مشکل ہو۔

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۱۵-۷۳۱۶۔

اگر پرورش کرنے والی عورت ماں کے علاوہ کوئی اور ہے تو اس کو بچے کے باپ کی اجازت کے بغیر اس کو لے کر سفر کرنا جائز نہیں ہے، اگر باپ کی اجازت کے بغیر دوسرے شہر میں جائے گی تو اس کا حقِ حضانت ختم ہو جائے گا(۱)۔

اور شافعی مذہب یہ ہے: میاں بیوی کی علاحدگی کی صورت میں اگر ان میں سے کوئی بچے کے ساتھ سفر کرنا چاہے، اگر سفر مسافت قصر سے کم کا ہے تو بچے کو اختیار دیا جائے گا اور اگر سفر مسافتِ شرعی (حدِ قصر) سے زیادہ کا ہے، اور حج، تجارت یا اس طرح کی کسی ضرورت کی بنا پر سفر ہو رہا ہے تو والدین میں سے جو مقیم ہو بچہ اس کے پاس رہے گا، اور اگر سفر نقل مکان کے لیے ہے تو بچہ باپ کے پاس رہے گا، تاکہ اس کا نسب محفوظ رہے اور اس کی تعلیم وتربیت کا صحیح نظام ہو سکے(۲)۔ حنبلی مذہب بھی یہی ہے(۳)۔

حضانت کی مدت کے دوران میں بچے کو دیکھنے کا حکم:

میاں بیوی کے درمیان علاحدگی کی صورت میں بچہ جس کی پرورش میں ہو (اصلاً تو ماں کی پرورش ہی میں ہوگا، لیکن کسی رکاوٹ کی وجہ سے مذکورہ ترتیب کے مطابق باپ کی پرورش میں یا اس کی کسی رشتہ دار خاتون کی پرورش میں آگیا ہو) تو دونوں کو بچے کو دیکھنے کا حق ہے، کسی کے لیے روکنے کی اجازت نہیں، ایک کے پاس ہے تو دوسرے کے پاس جانے کے لیے مجبور بھی نہیں کیا جائے گا، ہر دن دیکھنا چاہے تو اس کا انتظام کرنا پڑے گا،

---

(۱) الفتاوی الہندیۃ ۱/۴۸۴، فتح القدیر ۴/۱۹۰ وبعدھا، الدر المختار مع الرد ۵/۲۷۴ وبعد۔

(۲) المھذب ۲/۱۷۳، مغنی المحتاج ۳/ ۴۵۸

(۲) کشاف القناع ۵/۵۰۰، المغنی ۱۱/ ۴۱۹--۴۲۰ امام مالک کے نزدیک اس کو نقلِ مکان کے لیے سفر کی اجازت نہیں، اگر چھ بُرد (۱۳۳ کلومیٹر) سے زیادہ کا سفر ہے تو اس کا حق حضانت ختم ہو جائے گا اور اگر سفر، حج تجارت وغیرہ کے لیے ہے تو حق ختم نہیں ہوگا۔ (الشرح الصغیر ۳/۶۴۴) نیز الفقہ الاسلامی وأدلتہ (۱۰/ ۷۳۱۸)

لیکن امام شافعی کے نزدیک سنِ تمیز کے بعد (جس کا بیان آگے آ رہا ہے) اگر بچی نے باپ کو اختیار کیا ہے تو وہ اس کی عزت وآبرو اور جان کی حفاظت کی خاطر اس کو ماں کے پاس جانے سے روک سکتا ہے لیکن ماں خود اس کو دیکھنے کے لیے آتی ہے تو روکنے کا حق نہیں(۱)۔

سن شعور کے بعد بچے کی پرورش:

اس میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ حضانت کی مدت، ولادت سے سن تمیز تک ہے، اور سن تمیز سے مراد یہ ہے کہ بچہ پاکی یا ناپاکی کو سمجھ سکے، خود سے استنجا کر سکے، خود سے کھا پی سکے اور خود سے کپڑا پہن سکے جس کو عموماً سات سال کے ساتھ مقید کیا گیا ہے(۲)۔ اس لیے کہ سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دینے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد کیا حکم ہوگا، پرورش کا حق دار کون ہوگا؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک بچے کو اس کے باپ اور ماں کے درمیان اختیار دیا کہ جس کے ساتھ چاہے چلا جائے (۳)۔

ایک روایت میں اس کی تفصیل آئی ہے کہ ایک عورت نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے شوہر چاہتے ہیں کہ میرے بچے کو لے جائیں (مجھ سے چھین کر اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں) جب کہ ابو عِنبہ کے کنوئیں سے اس نے مجھے پانی پلایا ہے اور مجھے نفع

(۱) مسئلے کی وضاحت کے لیے دیکھیے الدر المختار مع الرد (۵/۲۷۵)، مغنی المحتاج ۳/۴۵۷-۴۵۸، کشاف القناع ۵/۵۰۱-۵۰۲، المغنی ۱۱/۴۱۸-۴۱۹۔

(۲) اصل یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی خاص عمر مقرر نہ کی جائے، بلکہ تمیز کی صلاحیت پیدا ہو جانے کا اعتبار کیا جائے، اور جب سن تمیز میں اختلاف ہو جائے تو قاضی کے فیصلے کو مانا جائے (فقہ السنہ سید سابق ۳/۹۹-۱۰۰)۔

(۳) ترمذی (۱۳۵۷)۔

پہنچایا ہے(۱) رسول اللہ ﷺ نے کہا چلو دونوں اس کے لیے قرعہ اندازی کرو، اس کے شوہر نے کہا میرے بچے کے بارے میں کون میرا حق چھین سکتا ہے اور مجھ سے لڑ سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے بچے سے کہا کہ دیکھو یہ تمھارے باپ ہیں اور یہ تمھاری ماں، تو جس کا چاہے تم ہاتھ پکڑ لو (جس کے ساتھ جانا چاہو جاؤ) تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا، تو ماں اس کو لے کر چلی گئی (۲)۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدتِ حضانت کے ختم ہونے کے بعد اگر بچے کو کسی ایک کے پاس رکھنے پر اتفاق ہو جائے تو اس پر عمل کیا جائے، اختلاف کی صورت میں بچے کو اختیار دیا جائے گا۔

تو امام شافعی فرماتے ہیں کہ بچے کو اس عمر میں اختیار دیا جائے گا، چاہے باپ کو اختیار کرے یا ماں کو اختیار کرے (۳)۔ امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے (۴)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (۵) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (۶) نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں باپ پرورش کا حق دار ہوگا، بچے کو اختیار نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ اس کے قول کا کوئی اعتبار نہیں، (۷) نہ اس کی حقیقی خواہش اور مرضی کا پتا چل سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ جہاں اس کو کھیل کی آزادی ہو، زیادہ ڈانٹا ڈپٹا نہ جائے، اس کو وہ

---

(۱) بئر ابی عنبہ (ابو عنبہ کا کنواں) مدینہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ بڑا ہو گیا تھا اور اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا، دوسرے لفظوں میں وہ سنِ تمیز کو پہنچ چکا تھا۔

(۲) احمد (۲/ ۴۴۷) ابوداود (۲۲۷۷) نسائی (۳۵۲۶)۔

(۳) الأم (۵/ ۹۲) (۴) المغنی ۱۱/ ۴۱۵ وبعد۔

(۵) السنن الکبری للبیہقی ۸/ ۷ (۸/ ۴) (۶) والسنن الکبری ۸/ ۶ (۸/ ۴)

(۷) القوانین الفقھیۃ ص: ۲۲۴، الشرح الصغیر ۳/ ۶۳۲، بدائع ۴/ ۴۳، والدر المختار۔

اختیار کرے جو نتیجے میں اس کے بگاڑ کا باعث بنے، اور پھر یہ کہ اس کو جو باتیں سیکھنا ہے اور بلوغ وغیرہ کے جو احکام معلوم کرنا ہے وہ باپ اچھی طرح سکھا سکتا ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بلوغ تک ماں کے پاس رہے گا۔

یہ سب احکام اس صورت میں ہیں جب یہ لڑکا ہو، اور اگر لڑکی ہے تو امام شافعی کے نزدیک لڑکی کا بھی وہی حکم ہوگا جو لڑکے کا ہے، یعنی سن تمیز کے بعد اختیار دیا جائے گا۔ اس لیے کہ حدیث میں اگر چہ لڑکے کا بیان ہے مگر سن تمیز کو پہنچنے والی جو بات بیان کی گئی ہے وہ لڑکا اور لڑکی دونوں میں مشترک پائی جاتی ہے(۱)۔

اور امام شافعی نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ بچہ ماں یا باپ جس کو اختیار کرے اس کے پاس ہوگا، تو اگر ماں کو اختیار کرے تو نفقہ تو باپ پر ہی ہوگا اور اس کی تادیب سے اس کو منع نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں لڑکا اور لڑکی برابر ہیں اور بچہ مکتب جائے گا اور کوئی صنعت اس کے خاندان میں ہے تو اس کو سیکھنے کے لیے جائے گا اور اپنی ماں کے پاس رات گزارے گا، اور نفقہ باپ پر ہوگا، اور اگر باپ کو اختیار کرے تو اس کو حق نہیں ہے کہ ماں کے پاس جانے سے روکے اور ماں بھی دن میں اس کے پاس آسکتی ہے (یعنی اس کو نہیں روکا جاسکتا) اور اگر لڑکی ہے تو ماں اس کے پاس آنے سے نہیں روکا جائے گا اور باپ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کو ماں کے پاس بھیجے، سوائے اس کے کہ وہ بیمار ہو جائے، تو اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کو ماں کے پاس بھیجنے کا حکم دیا جائے گا (اس لیے کہ وہی اس کی صحیح نگہداشت کرسکتی ہے) لیکن اچھی ہونے کے بعد وہ واپس آئے گی۔ اور اگر لڑکی کا انتقال ہو جائے تو ماں کو اس کے کفن دفن سے نہیں روکا جائے گا اور لڑکی کی بیماری پر وہ شوہر کے گھر

(۱) امام شوکانی لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں وارد احادیث کے ظاہری الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد بچے کو اختیار دیا جائے اور لڑکے اور لڑکی میں فرق نہ کیا جائے (نیل الأوطار ۵/۱۵۰)

میں آکر تیمارداری کرنا چاہے تو اس سے بھی روکنے کا حق نہیں ہے۔(۱)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک لڑکی، ماں یا نانی کی پرورش میں ہے تو بلوغ تک اسی کے پاس رہے گی، اس لیے کہ سن شعور کے بعد اس کو عورتوں کے مسائل سیکھنے کی ضرورت ہے اور باپ کے مقابلے میں ماں یا نانی ہی اس کو بہتر طریقے پر سکھا سکتی ہے۔ اور بلوغ کے بعد باپ کے پاس جائے گی، اس لیے کہ اس وقت اس کی حفاظت اور صحیح نگرانی کی ضرورت ہے، اور باپ یہ کام بہتر طریقے پر انجام دے سکتا ہے(۲)۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ لڑکی شادی ہونے اور شوہر کے اس کے ساتھ ملنے تک ماں کے پاس رہے گی(۳)۔

اور امام احمدؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ سات سال تک ماں کے پاس ہی رہے گی، اختیار نہیں ہوگا اور جب سات سال کو پہنچ جائے تو باپ کے پاس جائے گی، اختیار نہیں ہوگا(۴)۔

اور یہ اختیار اس صورت میں ہے جب بچہ عقل والا ہو، اور اگر یہ بچہ کم عقل، ناسمجھ اور بے شعور ہے تو اس کا حکم چھوٹے غیر ممیّز بچے کی طرح ہوگا، یعنی وہ ماں کے پاس ہی رہے گا، اختیار نہیں دیا جائے گا، اس لیے اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں اور ماں ہی ایسے بچوں کی صحیح خدمت کر سکتی ہے اور ان کو آرام پہنچا سکتی ہے۔

بچے کا نفقہ:

بچہ کا نفقہ یعنی اس کے کھانے کپڑے وغیرہ کا خرچ باپ کے ذمے لازم ہے، اس

(۱) الأم ۹۲/۵، نیز دیکھیے مغنی المحتاج (۴۵۶/۳)۔ (۲) بدائع (۴۲/۴-۴۳)۔

(۳) الشرح الصغیر ۷۳۳/۳، القوانین الفقهیة ص: ۲۲۴۔

(۴) المغنی ۴۱۸/۱۱، کشاف القناع ۵۰۲/۵، نیز دیکھیے زاد المعاد۔

کی دلیل وہ حدیث ہے کہ جب ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے شوہر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی شکایت کی کہ وہ بخل سے کام لیتے ہیں اور مجھے اتنا نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچوں کو کافی ہوجائے، مگر میں ان کے علم کے بغیر ان سے لے لیتی ہوں؟ حضور ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: جو تمھیں اور تمھارے بچوں کو کافی ہو جائے، قاعدے کے مطابق اتنا لے لو(۱)۔

اس حدیث سے بچوں پر خرچ کرنے کا وجوب صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے خرچ نہ دینے پر اس کے مال میں سے چوری چھپے اتنا لینے کی جب اجازت دی گئی، تو خرچ کرنا کتنا ضروری ہے، اس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کن بچوں کا نفقہ واجب ہے؟ تو جمہور علماء کے نزدیک اپنے خاص بچوں اور بچوں کی اولاد یعنی پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کا نفقہ واجب ہے(۲)۔ اور ظاہر ہے کہ اولاد کی اولاد کا نفقہ اسی صورت میں واجب ہوگا، جب ان کے باپ ان پر ان کی ضرورت کے مطابق خرچ نہ کرتے ہوں یا نہ کر سکتے ہوں۔

بچوں کا نفقہ واجب ہونے کے شرائط:

بچوں کا نفقہ واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں:

پہلی شرط یہ کہ ایک دن رات کے اپنے خرچ سے زیادہ اس کے پاس موجود ہو، اس کی دلیل

---

(۱) بخاری (۵۳۶۴) مسلم (۱۷۱۴) اور سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ ﴿وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف﴾ بھی اس پر دلالت ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جس کا بچہ ہے اس پر ماں کا کھانا اور کپڑا ضروری ہے یعنی جب بیوی کا نفقہ ولادت کی وجہ سے ہے تو بچے کا بدرجۂ اولیٰ ضروری اور واجب ہوگا۔

(۲) دیکھیے المهذب ۲/ ۱۶۶-۱۶۷، روضة الطالبين ۹/ ۸۳، المغنی ۱۱/ ۳۷۶ امام مالکؒ نزدیک صرف حقیقی اولاد ہی کا نفقہ واجب ہے اولاد کی اولاد کا نہیں (الشرح الصغیر ۳/ ۷۲۷)

وہ حدیث ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک واقعہ کے ضمن میں بیان کی ہے کہ ایک شخص نے اپنے پیسے لا کر حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیے، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ذات سے آغاز کرو اور پہلے اس پر خرچ کرو، اگر بچ جائے تو بیوی بچوں پر، اگر اس سے بھی بچ جائے تو دوسرے رشتہ داروں پر، اگر اس سے بھی بچ جائے تو ادھر ادھر(۱) (جہاں تم مناسب سمجھو)۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک دینار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو اپنے اوپر خرچ کرو، اس نے کہا دوسرا دینار ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے بچوں پر خرچ کرو، اس نے کہا: ایک اور ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنی بیوی پر خرچ کرو، اس نے کہا اور ایک ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے خادم پر خرچ کرو، اس نے کہا اور ایک ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تب تو تم زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو(۲) یعنی جہاں مناسب سمجھو خرچ کرو۔

اگر اس کے پاس موجود نہیں، لیکن وہ کما کر حاصل کر سکتا ہے تو اس صورت میں بھی یہی حکم ہوگا، اس لیے کہ کما سکتا ہے تو کمانا اس کے ذمے واجب ہے، اور جب کمائے گا تو جن کا نفقہ اس کے ذمے ہے، ان پر خرچ کرنا بھی واجب ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ بچہ محتاج ہو اور کما نہ سکتا ہو، اس کی پانچ صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱- چھوٹا ہو کمانے کی عمر کو نہ پہنچا ہو۔ (اور بالغ ہونے سے پہلے کمانا اس کے ذمے ضروری نہیں)

۲- کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو، مثلاً اندھا ہو، یا پولیو کا شکار ہو یا ہاتھ پاؤں سے معذور ہو،

(۱) مسلم (۹۹۷)۔

(۲) الأم للشافعی (۵/ ۸۷)، نیز دیکھیے ابوداؤد (۱۶۹۱) نسائی (۲۵۳۶)۔

وغیرہ۔

۳-پاگل ہو، جب تک پاگل رہے، اس کا خرچ باپ دادا پر اسی طرح ضروری ہوگا جس طرح چھوٹے بچے کا ہوتا ہے۔

۴-لڑکی ہو۔لڑکی اگر محتاج ہے خواہ بالغ کیوں نہ ہوئی ہو، شادی تک اس کی ذمے داری باپ پر ہے، اس لیے کہ اس کے ذمے کمانا نہیں ہے، شادی ہونے کے بعد باپ کی ذمے داری ختم ہوکر شوہر پر آئے گی۔اور اگر طلاق ہوجاتی ہے تو باپ کی ذمے داری لوٹ آئے گی۔حضور ﷺ نے حضرت سراقہ بن جعشم رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا میں تمھیں افضل ترین صدقہ (خرچ) نہ بتاؤں، انھوں نے کہا: ضرور بتائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: تمھاری بیٹی جب (طلاق ہوکر) تمھارے پاس واپس آجائے، اور اس کا تمھارے علاوہ کوئی کمانے والا نہ ہو۔(۱)۔

اسی حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنے طور پر کمائی کر کے اپنا خرچ حاصل کر رہی ہو تو باپ کی ذمے داری اس پر خرچ کی ختم ہوجائے گی؛ لیکن باپ کے ذمے ضروری ہے کہ اس کو ایسی کمائی سے روک دے جس سے اس کی عزت وآبرو کو خطرہ ہو۔

۵-ضروری علم کے حصول میں مشغولیت: بچہ بڑا ہوگیا، اور کمانے کی قدرت ہے، لیکن وہ ضروری علوم کے حاصل کرنے میں مشغول ہے، اس صورت میں بھی اس کا نفقہ باپ پر واجب ہے(۲)۔

(۱) الأدب المفرد(۸۰) ابن ماجہ(۳۶۶۷)۔

(۲) اگر وہ ایسا علم حاصل کر رہا ہو جس کا تعلق فرضِ کفایہ سے ہو جس کی ضرورت معاشرے کو پڑتی ہے، جیسے ڈاکٹری کا علم یا کوئی صنعت وغیرہ تو ایسے علم کی مشغولیت کی وجہ سے کمانہ سکنے کو عذر قرار نہیں دیا جائے گا، اور باپ پر اس صورت میں نفقہ=

بچوں کا نفقہ کس پر واجب ہے؟

اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ باپ موجود ہو اور بچے پر خرچ کر سکتا ہو تو اسی پر بچے کا نفقہ واجب ہے، اور کسی پر واجب نہیں۔

اگر باپ موجود نہیں ہے، یا خرچ نہیں کر سکتا، خود محتاج ہونے کی وجہ سے یا بیماری، بڑھاپے وغیرہ کے سبب کمائی نہ کر سکنے کی وجہ سے، تو احناف کے نزدیک اس صورت میں بچے کا نفقہ اس کے اصول (۱)۔ میں سے جو موجود ہے اس پر واجب ہوگا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ اس کے پاس گنجایش ہو، دادا کے پاس گنجایش ہو تو صرف دادا پر اور ماں کے پاس گنجایش ہو تو صرف ماں پر۔ اور دادا یا ماں، باپ کی تنگدستی کی وجہ سے اس پر خرچ کر رہے ہوں تو باپ کے پاس گنجایش ہونے پر ان کو اس سے مانگنے کا حق ہے، گویا وہ جو خرچ کریں گے وہ باپ کے حق میں واجب الادا قرض ہوگا۔ اور جب ماں کے ساتھ دادا ہو تو دونوں پر، بچے کی میراث میں سے جتنا حصہ اس کو ملتا ہے اسی کے بقدر واجب ہوگا، یعنی اس صورت میں ماں پر ایک تہائی اور دادا پر دو تہائی اور نانی اور دادی کی موجودگی میں بھی اس

== واجب نہیں ہوگا، بلکہ اس کو اختیار ہوگا، چاہے تو وہ اس کو اس علم میں مشغول رکھ کر اس پر خرچ کرے، چاہے تو خرچ روک دے اور اس کو کسی کام پر لگا دے (الفقہ المنہجی، ۴/۲/۱۷۲)

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے علم کی تفصیل بیان کیے بغیر لکھا ہے کہ علم کا حصول فرض کفایہ ہے، اگر طلبہ کو کمانے پر مجبور کیا جائے گا تو امت کی ضرورتیں معطل ہو کر رہ جائیں گی، اس لیے طالب علم ہونے کی صورت میں خرچ باپ کے ذمے ہوگا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ طالب علم محنتی اور کامیاب ہو، اگر وہ پھسڈی ہے تو اس کو پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی پیشے اور کام کو سیکھ کر اپنی معاشی ضرورت پوری کرے (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱۰/۷۴۱۴)۔

(۲) دو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، ایک اصول دوسری فروع، اصول: اصل کی جمع ہے، بمعنی جڑ، یعنی بچے کی اصل، اور اس کی پیدایش کا ذریعہ یعنی ماں باپ، دادا، نانا، نانی، دادی، اور اوپر تک۔ اور فروع: فرع کی جمع ہے، جس کے معنی شاخ کے ہیں، یعنی اولاد اور اولاد کی اولاد

طرح میراث کے بقدر نفقہ واجب ہوگا، اور اگر بچے کے وارث موجود نہ ہوں، بلکہ دوسرے رشتہ دار موجود ہوں تو ان میں جس کا رشتہ سب سے قریبی ہوگا، اس پر بچے کا نفقہ واجب ہوگا، اور اگر ایک درجے کے قریبی رشتہ دار کئی ہوں تو سب کے ذمے برابر برابر بچے کا نفقہ ہوگا۔

مالکیہ کے نزدیک بچے کا نفقہ صرف باپ پر واجب ہوگا (یعنی باپ کے نہ ہونے کی صورت میں حکومت ذمے دار ہوگی)۔

اور شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ باپ نہ ہو یا خرچ نہ کرسکتا ہو تو نفقہ ماں کے ذمے واجب ہے، ان کی دلیل یہ آیت ہے ﴿ولا تضار والدة بولدها﴾ (البقرۃ:۲۳۳) یعنی ماں کو جائز نہیں کہ اپنے بچے کو نقصان پہنچائے (۱)۔

اور یہ بھی دلیل ہے کہ جب باپ پر بچے کا نفقہ واجب ہے، اس لیے کہ وہ بچہ کی ولادت کا سبب ہے تو ماں جو بچے کو جننے والی ہے اس پر بدرجہ اولیٰ واجب ہونا چاہیے۔ اسی طرح اولاد کی اولاد کا نفقہ بھی اس پر واجب ہے، اس لیے کہ ولادت کے احکام میں نانی دادی، ماں کی طرح ہوتی ہیں اور نانا دادا کا حکم باپ کی طرح ہے (۲)۔

اور جب قرابت ورشتہ داری کا درجہ اور وراثت کے استحقاق کا درجہ برابر ہوجائے تو دونوں پر نفقہ واجب ہوگا، اس لیے کہ نفقہ واجب ہونے کی علت دونوں میں برابر پائی جاتی ہے (مثلاً دو ایک درجے کے چچا ہوں)، اور اگر قرابت کے درجے میں فرق ہوجائے

---

(۱) اس آیت کے کئی معانی بیان کیے گئے ہیں، ایک مطلب وہ ہے جو اوپر ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے، اور اسی سے استدلال صحیح ہوتا ہے کہ جب باپ خرچ نہ کر رہا ہو تو ماں کو چاہیے کہ اس پر خرچ کرے، نفقہ روک کر اس کو نقصان نہ پہنچائے۔

(۲) اور ظاہر ہے کہ جب ماں کے پاس مال نہیں اور عورت ہونے کی وجہ سے کمانا بھی اس کے لیے ضروری نہیں، تو اس صورت میں بچے کا نفقہ اس شخص پر ہوگا جس پر اس کی ماں کا نفقہ واجب ہے۔

تو صحیح قول یہ ہے کہ دونوں میں جس کا رشتہ زیادہ قریب ہے اس پر نفقہ واجب ہوگا۔ مثلاً اگر ماں اور دادا ہے تو پورا نفقہ دادا پر واجب ہوگا، اس لیے کہ وہی تنہا عصبہ ہونے کی بنیاد پر وارث ہوگا جس طرح باپ ہوتا ہے، اور بچے کے دادا، نانا، پردادا، پرنانا اسی طرح دادیاں، نانیاں ہوں تو جس کا رشتہ سب سے قریبی ہوگا اس پر بچے کا نفقہ ہوگا۔

اور حنبلی مذہب یہ ہے کہ اگر بچے کا باپ نہیں ہے تو ہر وارث پر اس کی میراث کے بقدر نفقہ واجب ہے، اس لیے کہ باپ پر بچے کی ذمے داری بیان کرنے کے بعد اللہ فرماتا ہے: وعلى الوارث مثل ذلك (بقرہ:۲۳۳) یعنی وارث پر اسی طرح ذمے داری ہے۔(۱)

(۱) دیکھیے الفقہ الاسلامی وأدلتہ (۱۰/۷۴۱۵-۷۴۱۷)۔

بارھواں باب

بچوں پر دم کرنے، جھاڑنے اور تعویذ لٹکانے کے احکام

بہت سی بیماریوں کا علاج روحانی طریقوں ہی سے ممکن ہے، دنیا کی ہر قوم اس کو تسلیم کرتی ہے، بچوں کا اس طرح علاج کچھ زیادہ ہی کیا جاتا ہے، ہمارے نبی کریم ﷺ نے اس سلسلے میں مفصل تعلیمات دی ہیں، اور مکمل رہنمائی فرمائی ہے کہ اس کے ساتھ ہمیں کسی اور روحانی علاج کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

نظر لگنا:

نظر کا اثر انداز ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کو عزیزِ مصر (بادشاہِ مصر) کے پاس بھیجا تو یہ نصیحت کی تھی کہ دیکھو سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا (سورۂ یوسف: ٦٧) اس میں یہی مصلحت تھی کہ ایک باپ کے اپنے لڑکے اور وہ بھی خوبصورت، اگر سب اکٹھے داخل ہوں گے تو نظر لگ جائے گی، اس سے بچنے کے لیے یعقوب علیہ السلام نے یہ تاکید کی تھی (١)۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، عموماً اس کا تعلق حسد سے ہوتا ہے اور نظر لگانے والے کی نیت میں پہلے سے خرابی ہوتی ہے، لیکن کبھی بغیر حسد کے بھی نظر لگ جاتی ہے، کسی اچھی چیز پر یا کسی خوبصورت بچے پر اچانک نظر پڑی تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ بچہ اتنا خوبصورت کیسے ہے! اس طرح کے موقعوں پر نظر لگ جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: حسد کے بغیر بھی کسی چیز کے اچھے لگنے پر نظر لگ جاتی ہے، چاہنے اور محبت کرنے والے کی بھی نظر لگتی ہے اور نیک اور صالح آدمی کی بھی نظر لگتی ہے، پس جس کو کوئی چیز اچھی لگے تو اس کو چاہیے کہ اس کے لیے فوراً برکت کی دعا کرے، یہ اس کی طرف سے

(١) دیکھیے تفسیر کبیر (١٨/ ١٣٧-١٣٨)۔

جھاڑنے کی طرح ہوگا، یعنی اس سے نظر نہیں لگے گی۔(۱)

آگے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں یہ بات آئی ہے اوراس کے علاوہ متعدد حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔

علامہ ابن قیم تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ نظر لگنے کے لیے آنکھ کا ہونا اوراس سے دیکھنا بھی ضروری نہیں، بلکہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی اندھا ہواس سے کسی چیز کی حقیقت (اس کا حسن و جمال و افادیت) کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے دل میں کوئی خیال پیدا ہوجائے تواس کااس پراثر ہوسکتا ہے(۲)۔

انسان درحقیقت اپنا دوطرح کا وجود رکھتا ہے: ایک جسمانی دوسرا روحانی، جس طرح جسم جسم سے متاثر ہوتا ہے، ایک جسم دوسرے جسم سے لڑ جاتا ہے تواس پراثر پڑتا ہے ،کسی محسوس چیز سے ٹکراتا ہے تو چوٹ کھاتا ہے، اسی طرح یہ بھی ایک بدیہی اور ثابت شدہ حقیقت ہے (جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا) کہ روح بھی روح سے متاثر ہوتی ہے، نظر کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے. درحقیقت اس کا تعلق نفسیات (Cyclogy) سے ہے، اور یہ روح ہی کا ایک حصہ ہے، علمِ نفس کے ماہرین اس حقیقت کوتسلیم کرچکے ہیں، ہپناٹزم کی بنیاد ہی آنکھوں کی قوتِ کشش پر ہے۔(۳)

جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی تاثیر کاتعلق اللہ کی خلقت اور تقدیر سے ہے، اس لیے اس کا انکار نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'العین حق (۴)۔ یعنی نظر لگنا ایک حقیقت ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نظر لگنا

---

(۱) فتح الباری (۱۳/۱۷۱)۔ (۲) الطب النبوی (ص:۱۷۳)۔

(۳) نظر کی حقیقت کے لیے دیکھیے تفسیر کبیر (۱۸/ ۱۳۸-۱۳۹) اور الطب النبوی (ص:۱۷۱-۱۷۳)۔

(۴) بخاری (۵۷۴۰) ومسلم (۲۱۸۷)

ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، اگر کوئی چیز تقدیر پر غالب آسکتی تو نظر بد غالب آتی۔

(۱) بچوں کو اکثر نظر لگتی ہے، وہ بلاوجہ روتے معلوم ہوتے ہیں، سوتے نہیں، یا گھبرا اٹھتے ہیں یہ سب عموماً نظر لگنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

نظر لگنے کا علاج:

نظر کا کوئی ڈاکٹری علاج نہیں، اس کا تعلق صرف اور صرف روحانی علاج سے ہے۔ حدیثِ نبوی اور سلف صالحین کے قول وعمل سے کئی طرح کے علاج معلوم ہوتے ہیں جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

۱- ایک یہ کہ کسی جاننے والے صالح آدمی سے جھڑوایا جائے یعنی دم کروایا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کے رونے کی آواز سنی تو فرمایا: تمھارے اس بچے کو کیا ہوگیا ہے، وہ کیوں رو رہا ہے۔ کسی سے جھڑوا کر کیوں اس کی نظر نہیں اتروائی؟۔(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نظر لگنے پر دم کروانے کا حکم دیا۔(۳)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے گھر میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا، حضور ﷺ نے فرمایا اسے جھڑواؤ (اس کے لیے کسی جھاڑنے والے کو دیکھو) اس کو تو نظر لگ گئی ہے۔(۴)

جھاڑ پھونک کے الفاظ بھی بعض روایتوں سے معلوم ہوتے ہیں، اور وہ یہ ہیں:

”بسم اللہ أرقیك، من كل شيئ یؤذیك، من شر كل نفس أو عین حاسد، اللہ

(۱) مسلم (۲۱۸۸)۔ (۲) مسند احمد (۶/۷۲)۔

(۳) بخاری ۵۷۳۸ مسلم ۲۱۹۵۔ (۴) بخاری (۵۷۳۹) مسلم (۲۱۸۶)۔

یشفیك ، بسم الله أرقیك (۱) ترجمہ: میں اللہ کے نام سے تم پر دم کر رہا ہوں ہر ایسی چیز سے حفاظت کے لیے جو تمھیں تکلیف دے، ہر جاندار کے شر سے اور ہر حسد کرنے والے کی نظر بد سے اللہ تمھیں شفا دے، اللہ کے نام سے میں تم پر دم کر رہا ہوں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو جھاڑا تھا۔

۲-معوذتین یعنی قل أعوذ برب الفلق اور قل أعوذ برب الناس پڑھ کر دم کیا جائے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جنوں اور انسانوں کی نظر بد سے پناہ مانگتے تھے۔ جب معوذتین نازل ہوئیں تو ان کو پکڑ لیا اور دوسری چیزوں کو (جھاڑنے کے دوسرے الفاظ کو) چھوڑ دیا۔ (۲)

۳-دوسری شفا کی آیتوں اور حفاظتی دعاؤں جیسے سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی وغیرہ سے بھی جھاڑا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔

۴-جھاڑنے اور نظر اتارنے کا ایک طریقہ حدیث میں یہ آیا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس کی نظر لگنے کا شبہ ہو اس سے وضو کرنے کے لیے کہا جائے، پھر اس پانی سے وہ شخص غسل کرے جس کو نظر لگی ہے (۳)۔

اس میں وضو کے ساتھ کچھ دوسرے اعضا کو بھی دھونا پڑتا ہے، پورا طریقہ یہ ہے جیسا کہ حضرت سہل بن حُنیف رضی اللہ عنہ کے قصے سے معلوم ہوتا ہے، وہ بہت گورے اور خوبصورت تھے، ایک مرتبہ غسل کر رہے تھے کہ عامر بن ربیعہ کی ان پر نظر پڑی، انھوں نے

---

(۲) مسلم ۲۱۸۶۔

(۳) ترمذی (۲۰۵۸) نسائی (۵۴۹۶) ابن ماجہ (۳۵۱۱)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان دو سورتوں کے علاوہ دوسرے الفاظ کے ذریعہ جھاڑنا صحیح نہیں، بلکہ اس حدیث سے دم کرنے کے لیے ان کی اولیت یعنی ترجیح معلوم ہوتی ہے (فتح الباری ۱۳/۱۵۵ ضمن شرح حدیث نمبر ۵۷۳۵)۔

(۱) أبوداود (۳۸۸۰)۔

کہا: میں نے تو اتنا خوبصورت کسی کو نہیں دیکھا، کسی کنواری لڑکی کی کھال بھی کیا ایسی نازک اور خوبصورت ہوگی! یہ کہنا تھا کہ سہل کو نظر لگ گئی، اور ایسی سخت نظر لگی کہ وہ فوراً گر پڑے۔ رسول ﷺ کو خبر دی گئی، اور آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ سہل کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟ (سہل کے بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے؟) خدا کی قسم وہ سر نہیں اٹھاتے، بلکہ انھیں ہوش بھی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمھارا خیال کسی کی طرف جاتا ہے کہ اس کی نظر لگی ہو؟ انھوں نے کہا کہ عامر بن ربیعہ کی نظر معلوم ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عامر کو بلوا کر سخت ڈانٹا، فرمایا: کیوں تم سے کوئی اپنے بھائی کو مار ڈالتا ہے، کیوں تم نے جب تمھیں اچھا لگا تھا برکت کی دعا نہ دی؟ پھر ان سے کہا: سہل کے لیے غسل کرو (اپنے اعضا دھوؤ) عامر نے اپنا چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں کہنیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں اور لنگی کا اندرونی حصہ (۱) ایک ٹب میں دھویا، (یہ پانی باہر گرنے نہیں دیا گیا، بلکہ ایک ٹب میں یہ اعضا دھوئے گئے) پھر وہ پانی سہل کے سر اور پیٹھ پر پیچھے کی طرف سے ڈالا گیا، بس کیا تھا کہ سہل بالکل ٹھیک ہو گئے، ان کو اب کوئی تکلیف ہی نہیں ہو رہی تھی (۲)۔

نظر اتارنے کا یہ عجیب طریقہ ہے جس کی حقیقت ہم نہیں جان سکتے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: اس طریقے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا وہ شخص جو اس کا انکار کرے، اور نہ وہ جو اس کا مذاق اڑائے، اور نہ وہ شخص جو اس میں شک کرے اور نہ وہ جو

(۱) حدیث میں یہاں "داخلة إزاره" کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں لنگی کا اندرونی حصہ، اس کی تشریح میں اختلاف ہوا ہے بعض علماء نے کہا کہ اس سے ران مراد ہے، اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد دائیں طرف کا کمر کا وہ حصہ ہے جہاں لنگی باندھی جاتی ہے)

(۲) مسند احمد (۳/ ۴۸۶-۴۸۷) مصنف ابن ابی شیبۃ (۱۲/ ۱۰۲-۱۰۳) مصنف عبد الرزاق ۱۰/ ۷-۸ (۱۱/ ۱۴) موطا امام مالک کتاب العین، باب الوضوء من العین، ص ۶۴۷، المعجم الکبیر طبرانی ۶/ (۷۸، ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۳) سنن کبری بیہقی ۹/ ۳۵۱-۳۵۲، شرح السنۃ للبغوي ۱۲/ ۱۶۴

بغیر یقین کے تجربہ کرنا چاہے، جب طبیعت میں ایسے خواص ہوتے ہیں جن کی علتیں اور اسباب اطباء نہیں جانتے، بلکہ ان کے نزدیک وہ عقل وقیاس میں نہیں آسکتے؛ لیکن ان میں تاثیر ہوتی ہے، پھر یہ جاہل شرعی خواص کا کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ اس کے بعد علامہ ابن قیم نے عقلی طور پر اس کو سمجھانے کی کوشش کی ہے(۱)۔

اور جب کسی پر شبہ ہو کہ اس کی نظر لگی ہے اور اس سے اس طرح اعضا دھونے کے لیے کہا جائے تو اس کو مان لینا چاہیے، انکار نہیں کرنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں فرمایا: جب تم سے غسل کرنے کے لیے (یعنی اِس طرح اعضا دھونے کے لیے) کہا جائے تو دھولو۔(۲)

ممکن ہے کہ وہ خود نہ جانتا ہو کہ اس کی نظر لگی ہے، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ اسی کی نظر لگی ہو، اور حقیقت میں اگر اس کی نظر لگی ہو تو جس کو لگی ہے اس کے اس عمل سے اس کو فائدہ ہوگا، اس خیال سے اس کو فائدے سے محروم نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے ہماری رسوائی ہوگی۔

۵-سلف میں سے بہت سے حضرات نظر بد کے شکار شخص کا علاج اس طرح سمجھتے تھے کہ اس کے لیے قرآن کی آیتیں لکھی جائیں اور اس کو پلایا جائے۔(۳)

۶-ایک علاج اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ جس کو نظر لگنے کا خطرہ ہو اس کی خوبصورتی کو اور خوبیوں کو چھپایا جائے۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خوبصورتی میں کمی لائی جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک خوبصورت بچے کو دیکھا تو فرمایا اس کی تھوڑی کے گڑھے کو سیاہ کردو، تاکہ اس کو نظر نہ لگے(۴)۔

---

(۱) دیکھیے زاد المعاد ۴/۱۷۱، اور الطب النبوی لابن القیم، ص: ۱۷۶-۱۷۸۔

(۲) مسلم (۲۱۸۸)۔ (۳) الطب النبوی ابن قیم ص ۱۷۶)۔

(۴) شرح السنۃ (۱۲/۱۶۶)۔

بچوں کی ٹھوڑی یا رخسار (گال) پر کاجل کا جو تل لگاتے ہیں اس کی اصل یہی معلوم ہوتی ہے۔

نیند میں گھبرا جانے پر:

بعض بچے نیند میں گھبرا جاتے ہیں۔ اس کے لیے حدیث میں ایک دعا آئی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کو نیند میں گھبراہٹ ہوتی ہو تو وہ یہ دعا پڑھے: أعوذ بكلمات الله التامات من غضبه و عقابه و شرّ عباده و من همزات الشياطين و أن يحضرون (۱)

ترجمہ: میں اللہ کے پورے کلمات (۲) کے واسطے سے پناہ مانگتا ہوں اس کے غضب سے، اس کی سزا سے، اس کے بندوں کے شر اور تکلیف سے، اور شیطانوں کے وساوس و اثرات سے، اور اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان میرے پاس آئیں (اور مجھ کو ستائیں)۔

نیند میں گھبرا جانے والے بچوں پر یہ دعا پڑھ کر دم کریں تو امید ہے کہ ان کا گھبرانا بند ہو جائے گا اور وہ آرام کی نیند سو سکیں گے۔ یا یہ کرے جیسا کہ اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کرتے تھے کہ اس دعا کو لکھ کر اس کا تعویذ بچے کے گلے میں باندھ دے (۳)۔

(۱) ترمذی (۳۵۲۸) أبوداود (۳۸۹۳) مسند احمد (۲/۱۸۱) عام گھبراہٹ کے لیے بھی یہ دعا پڑھی جائے جیسا کہ أبوداود کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) کلمات: یعنی باتیں، اس سے مراد قرآن ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلمات اللہ سے اللہ کے اسماء و صفات مراد ہیں (تحفۃ الأحوذی ۶/۲۱۳) اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کے فیصلے ہیں، اور تامات (یعنی مکمل، پورا) اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کے کلام میں کوئی نقص کمی اور عیب نہیں، اور یہاں اس کے مفہوم میں کئی اقوال ہیں: فائدہ پہنچانے والے، شفا دینے والے، برکت والے، فیصلہ کرنے والے (فتح الباری ۷/۶۷۶)۔

(۳) روایت کے اخیر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا یہ معمول ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بڑے ==

شام کے وقت بچوں کو باہر نہ نکلنے دینا:

بچوں کو شیطانی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک چیز جس کے بہت اہتمام کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ شام کے وقت بچوں کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے سختی سے اس سے منع کیا ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات کا ابتدائی حصہ شروع ہو جائے یا یہ فرمایا جب شام ہو جائے تو اپنے بچوں کو گھر میں روکے رکھو باہر نہ نکلنے دو، اس وقت جنات پھیل جاتے ہیں اور اپنا اثر ڈالتے ہیں، جب کچھ وقت گزر جائے تو چھوڑ سکتے ہو(۱)۔

اور ایک روایت اس طرح ہے: جب سورج غروب ہو جائے تو اپنے جانوروں کو اور بچوں کو مت چھوڑو یہاں تک کہ رات کی کچھ تاریکی گزر جائے، اس لیے کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو شیطان چھوڑے جاتے ہیں، یہاں تک کہ رات کی تاریکی کا کچھ حصہ گزر جائے(۲)

آج کل اس طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی۔ بچے مغرب کی اذان تک اور اس کے بعد بھی باہر کھیلتے رہتے ہیں(۳) پھر شکایت ہوتی ہے کہ بچے بیمار رہتے ہیں، ان پر کچھ

= بچوں کو یہ دعا سکھاتے تھے اور چھوٹے ناسمجھ بچے جو نابالغ ہوتے، یہ دعا لکھ کر ان کے گلے میں ڈال دیتے تھے۔ ابوداؤد (۳۸۹۳) ترمذی (۳۵۲۸) احمد (۲/۱۸۱) ومستدرک حاکم (۱/۵۴۸) تعویذ کے سلسلے میں مفصل بیان آگے آرہا ہے۔

(۱) بخاری (۳۲۸۰، ۳۳۱۶) ومسلم (۲۰۱۲)۔

(۲) مسلم (۲۰۱۳)۔

(۳) ہمارے شہر بھٹکل میں چند سال پہلے تک اس کی بڑی فکر کی جاتی تھی اور اہتمام ہوتا تھا، چناں چہ مغرب کی اذان سے پہلے بچوں کو گھر کے اندر لیا جاتا تھا اور ہاتھ پاؤں دھو کر ان کو درود اور دعائیں پڑھنے کے لیے تیار کیا جاتا تھا، اور ماں مغرب کی نماز پڑھ کر بچوں کو لے کر بیٹھ جاتی اور دعائیں اور درود وغیرہ پڑھاتی۔ اب نئی تہذیب اور مال اور دنیا کی محبت کا سیلاب ہر اچھی چیز کو بہا لے گیا، اللہ ہی حافظ ہے۔

آسیبی اثر معلوم ہوتا ہے۔

جہاں بچے مغرب کے بعد قرآن پڑھنے کے لیے محلے کی مسجد میں جاتے ہیں، ان کو مغرب کی اذان سے پہلے بھیجنے کا اہتمام کیا جائے، اور اگر اس وقت کسی مجبوری کی وجہ سے نہ بھیج سکیں تو معوذتین یا دوسری دعائیں پڑھ کر دم کر کے بھیجا جائے، اس سے انشاء اللہ بچے شیطانی اثرات سے محفوظ رہیں گے۔

برے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے بچوں پر دم کرنا:

بچوں کو موقع موقع سے اور خاص طور پر شام کے وقت حفاظت کی دعائیں پڑھ کر جھاڑنا اور دم کرتے رہنا چاہیے۔ بالخصوص ان الفاظ سے جن سے رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو جھاڑتے تھے، اور فرماتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسماعیل واسحاق (علیہما السلام) کو اس طرح جھاڑتے تھے۔ وہ الفاظ یہ ہیں: أعوذُ بكلماتِ الله التّامة، من كل شيطان وهامّة، ومِن كُلّ عينٍ لامّة۔ (۱)۔

ترجمہ: میں اللہ کے پورے کلمات کے وسیلے سے ہر طرح کے شیطان اور ہر قسم کے زہریلے جانور اور ہر نظر بد (ہر نقصان پہنچانے والی نظر) سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

صبح وشام کی مسنون دعاؤں میں بہت سے تعوذات (یعنی وہ دعائیں جن میں اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے شیاطین سے، مصیبتوں سے اور ہر طرح کے شر، تکلیف اور نقصان سے) وارد ہوئے ہیں۔ بچہ چوں کہ یہ دعائیں پڑھ نہیں سکتا، اس لیے بہتر ہے کہ ماں، باپ یا گھر کا کوئی شخص جب اپنے لیے یہ دعائیں پڑھے تو بچوں پر دم کر لیا کرے، تاکہ ان کے اثرات بچوں کو بھی پہنچیں اور بالخصوص شام کے وقت معوذتین (قل أعوذ برب الفلق اور

---

(۱) بخاری (۳۳۷۱)۔

قل أعوذ برب الناس) تین دفعہ پڑھ کر ضرور بچوں پر دم کرے، تاکہ ہر قسم کے شر اور مصیبت سے وہ محفوظ رہیں۔

تعویذ باندھنے کے احکام:

تعویذ کے معنی پناہ دینے اور حفاظت کرنے کے ہیں، آسیبی اثرات سے حفاظت کے لیے جو چیز گلے میں ڈالی جائے، یا ہاتھ میں یا کمر میں باندھی جائے اس کو تعویذ کہتے ہیں۔

اگر یہ تعویذ کسی مندر کے پجاری نے، کسی جوگی اور سنیاسی نے یا کسی بھی غیر مسلم نے دی ہے تو اس کا باندھنا قطعاً حرام ہے یہ گناہ کبیرہ بلکہ شرک ہے۔ اس سے بچنا ہر حال میں ضروری ہے۔ اسی طرح اس مسلمان سے جھڑوانا اور تعویذ لینا بھی جائز نہیں جو غیر اللہ سے استمداد کرتا ہو (اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد طلب کرتا ہو)۔

اور جو تعویذ قرآن کی آیتوں، اللہ کے ناموں اور اس سے استمداد پر مشتمل ہو یعنی جس میں صرف اللہ سے مدد مانگی گئی ہو، ایسی تعویذوں کے باندھنے کے سلسلے میں صحابہؓ کے زمانے سے اب تک علماء کے درمیان اختلاف ہے، بہت سے حضرات اس کی اجازت دیتے ہیں اور بعض حضرات اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ عبداللہ نے میری گردن میں ایک دھاگا دیکھا تو پوچھا یہ کیسا دھاگا (ڈال رکھا) ہے؟ میں نے کہا یہ تعویذ کا دھاگا ہے، اس میں میرے لیے جھاڑا گیا ہے، یہ سننا تھا کہ انھوں نے اس کو پکڑ کر کاٹ دیا اور فرمایا کہ تم عبداللہ کے گھر والے شرک سے بے نیاز ہو، یعنی تم لوگوں کو شرک سے بالکل دور رہنا چاہیے(۱)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بچے یعنی فضل بن عباسؓ (جو

---

(۱) مصنف ابن أبی شیبہ (۱۲/۴۰)، أبوداود (۳۸۸۳) ابن ماجہ (۳۵۳۰) نیز دیکھیے مستدرک حاکم ۴/۲۱۶۔

آپ کے چچازاد بھائی تھے) کے گلے سے تعویذ کاٹ دیا۔(۱)

اور حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جوکوئی تعویذ باندھے وہ اسی کے حوالے ہوتا ہے(۲) یعنی اللہ کی مدد ہٹ جاتی ہے۔

اس طرح کی اور بھی روایتیں اور واقعات ہیں(۳) جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تعویذ باندھنا صحیح نہیں ہے، لیکن ان روایتوں میں قرآن اور غیر قرآن کی تفصیل نہیں بیان کی گئی ہے، ہاں البتہ حضرت ابن مسعود سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ قرآن کی تعویذ کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ (۴) اسی طرح مشہور تابعی ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ وہ (صحابہ اور تابعین) تمام تعویذوں کو ناپسند کرتے تھے خواہ قرآن کی آیتوں سے ہو یا کسی دوسری چیز سے(۵) امام احمد نے بھی ایک قول کے مطابق ہر قسم کے تعویذ کو مکروہ قرار دیا ہے۔(۶) لیکن اس بنیاد پر کسی کے گلے میں تعویذ دیکھ کر بغیر تحقیق کے کاٹ دینا اور اس کو توڑ کر پھینک دینا تشدد (بے جا سختی) ہے، اور اگر اس میں قرآن کی آیت یا اللہ کا نام ہے تو اس طرح کاٹ کر پھینکنے والا قرآن اور اللہ کے ناموں کی بے حرمتی کا مجرم قرار پائے گا، رہا یہ سوال کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کا تعویذ پھر کیوں کاٹا تھا؟ اس کا جواب خود ابوداؤد کی محولہ روایت میں ہے کہ انھوں نے ایک یہودی سے یہ تعویذ لیا تھا، اور جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے اپنے چچازاد بھائی فضل بن عباس کے گلے سے تعویذ کاٹنے کا تعلق ہے اس میں بھی اسی طرح کی بات ہوگی اس لیے کہ

---

(۲) مصنف عبدالرزاق ۲۰۸/۱۰ (۲۰۷/۱۱)۔

(۱) ترمذی (۲۰۷۲) مسند احمد (۳۱۰/۴، ۳۱۱) مستدرک حاکم ۲۱۶/۴۔

(۲) دیکھیے مصنف ابن أبي شیبہ (۱۲/ ۳۸-۴۴)

(۴) مصنف ابن أبي شیبہ (۴۲/۱۲)

(۵) مصنف ابن أبي شیبہ (۴۲/۱۲)

(۶) الآداب الشرعیة لابن مفلح ۴۹۳/۳)۔

جاہلیت کے زمانے میں تعویذ وغیرہ کا بہت رواج تھا جس میں غیر اللہ سے مدد طلب کی جاتی تھی اور یہ زمانہ زمانۂ جاہلیت سے دور نہ تھا، اسی خطرے سے رسول اللہ ﷺ نے کاٹ دیا ہو، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کی شان کے اس کو منافی سمجھتے ہوں۔ اس لیے کہ اگرچہ اکثر علماء کے نزدیک قرآن یا اللہ کے نام کا تعویذ باندھنا صحیح ہے، مگر نہ باندھنا اولیٰ ہے۔ اگر یہ ہر صورت میں منع ہوتا تو بعض صحابہ اور تابعین اس کو صحیح نہ سمجھتے اور نہ اس کی اجازت دیتے۔

صحابہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور بڑے درجے کے بعض تابعین حضرت سعید بن مسیبؒ، عطاءؒ، مجاہدؒ، ضحاک اور امام باقرؒ وغیرہ بھی قرآن اور اللہ کے نام کا تعویذ باندھنا صحیح سمجھتے تھے، اور لوگوں کو لکھ کر دیتے تھے۔(۱)

مذاہب اربعہ کے جمہور فقہاء کا بھی یہی قول ہے کہ قرآن اور اللہ کے نام کا تعویذ لکھنا یا باندھنا جائز ہے۔(۲) اور جمہور کا مسلک ہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں اللہ کے پاک نام سے برکت حاصل کرنا ہوتا ہے، بس اللہ ہی کو شافی حقیقی سمجھ کر یہ عمل کرے، اسی وجہ سے فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر اس میں وہ ذاتی طور پر تاثیر سمجھ رہا

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ پریشانی کے بعد اس کو باندھنا (یعنی قرآن اور اللہ کے ناموں والا تعویذ) ممنوع نہیں ہے؛ لیکن مصیبت آنے سے پہلے اس نیت سے باندھنا کہ اللہ کی تقدیر کو روک دے صحیح نہیں ہے۔ سنن کبریٰ بیہقی ۹/۳۵۰، نیز شرح السنۃ (۱۲/۱۵۸)، اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے عمل کے لیے دیکھیے: أحمد (۲/۱۸۱) ابو داؤد (۳۸۹۳) ترمذی (۳۵۲۸) ومستدرک (۱/۵۴۸)۔ اور مذکورہ تابعین کے عمل کے لیے دیکھیے مصنف ابن أبی شیبہ (۱۲/۷۴۔۷۵)۔

(۲) دیکھیے السنن الکبریٰ للبیہقی ۹/۳۵۰-۳۵۱، المجموع (۹/۴۶-۴۷) الفتاوی الہندیہ (۵/۳۵۶) القوانین الفقہیہ لابن جزی (ص:۴۳۸) الآداب الشرعیۃ لابن مفلح (۳/۹۴ نسخہ شاملہ) علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم بھی اسی کے قائل ہیں۔ (مجموعۃ الفتاوی لابن تیمیہ (۱۰/۳۶-۳۷)، (۱۹/۶۴-۶۵) الطب النبوی لابن القیم (ص:۱۷۶)۔

ہو یا اس سے شفا کا عقیدہ رکھتا ہو تو تعویذ باندھنا جائز نہیں، سلف میں سے جن بزرگوں نے اس کو نا جائز اور مکروہ قرار دیا ہے وہ اسی وجہ سے تھا، (۱) اور انھوں نے یہ بھی شرط لگائی ہے کہ پیشاب پاخانے کے وقت اور جماع کے وقت اتار دے (۲)۔

پس اگر اس سے توکل میں فرق پڑتا ہو اور ذہن اللہ سے ہٹ کر ان چیزوں کے مفید اور مؤثر ہونے کی طرف جاتا ہو جس سے عقیدۂ توحید پر اثر پڑتا ہے یا تعویذ کی بے حرمتی ہوتی ہو تو تعویذ باندھنا جائز نہیں ہوگا؛ اسی وجہ سے بہت سے صحابہؓ اور تابعینؒ اس کو مطلق ناپسند کرتے تھے۔ اور جمہور جو تعویذ کو جائز قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک قرآن کی آیتوں کو یا اللہ کے اسماء کو یا کسی ذکرِ الٰہی اور دعا کو کسی برتن میں لکھ کر اس کو مریض کو پلانا، اس کے بدن پر چھڑکنا اور اس سے غسل کرنا بھی صحیح ہے بشرطیکہ اللہ ہی کو شافی سمجھے (۳)۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر یقینِ کامل کے ساتھ قل أعوذ برب الفلق، قل أعوذ برب الناس اور دوسری مسنون صبح وشام کی دعاؤں کا اہتمام کرے اور ان کو پڑھ کر بچوں پر دم کیا کرے تو انشاء اللہ تعویذ باندھنے اور لکھ کر پینے اور اس سے نہانے وغیرہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوگی۔ واللہ أعلم۔

اچھے جھاڑنے والے کی علامتیں اور اس کی پہچان:

اس باب کے اخیر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اچھے اور کامیاب جھاڑنے والے کی پہچان بتائی جائے اس لیے کہ لوگ اس معاملے میں زیادہ دھوکا کھاتے ہیں اور غلط طریقے پر چلتے ہیں اور فائدے کے بجائے دینی اور دنیوی دونوں نقصان اٹھاتے ہیں۔

(۱) دیکھیے السنن الکبری للبیہقی ۹/ ۳۵۰ و ۳۵۱۔ تفسیر القرطبی ۱۰/ ۲۷۹-۲۸۰۔

(۲) مصنف ابن أبي شيبة ۱۲/ ۷۵، نیز تفسیر القرطبی ۱۰/ ۲۸۰۔

(۳) حوالوں کے لیے تعویذ کے جواز کے لیے جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے رجوع کیجیے۔

جھڑوانے میں اس کا پورا اہتمام کرنا چاہیے کہ جھاڑنے والا صالح اور اس کا ماہر ہو۔ یہ بھی در حقیقت ایک علم ہے، اس میں مہارت مطلوب ہے۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ تین باتیں جمع ہو جائیں تو اللہ کے حکم سے ضرور شفا حاصل ہوتی ہے۔

۱- دوا اسی بیماری کی ہو۔

۲- ڈاکٹر اس کو تجویز کرے۔

۳- مریض کی طبیعت اس کو قبول کرے۔ ان میں سے کوئی چیز نہ پائی جائے تو شفا نہیں ہوتی۔ جو اس کو اچھی طرح سمجھ لے جیسا سمجھنا چاہیے، تو وہ جھاڑ پھونک کے اسرار کو سمجھ سکتا ہے، اور کس طرح جھاڑنے سے فائدہ ہوتا ہے اور کس سے نہیں ہوتا اس میں فرق کر سکتا ہے۔ اس وقت وہ مناسب عمل سے اس بیماری سے جھاڑے گا۔ اور اس پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ جھاڑنے کا اثر جھاڑنے والے سے اور جس کو جھاڑا جائے اس کے قبول کرنے کی صلاحیت سے ہوتا ہے۔ جس طرح تلوار کا اثر ہوتا ہے مارنے والے سے اور محل کے قبول کرنے سے یعنی جس چیز پر تلوار پڑے وہ بھی کٹنے والی چیز ہو۔(۱)۔

جس طرح طبیب ماہر نہ ہو تو دوا فائدہ نہیں دیتی، اسی طرح اگر جھاڑنے والا اس کے لائق اور اس کے طریقوں سے اچھی طرح واقف نہ ہو تو اس کا وہ فائدہ نہیں ہوتا۔

جھاڑنے والے میں دس باتیں ہونی چاہیے:

۱- اخلاص ہو۔ وہ مخلص ہو، جھاڑنے سے اپنا کوئی فائدہ اس کے پیشِ نظر نہ ہو، بلکہ جس کو جھاڑ رہا ہو اس کی صحت اور عافیت ہی پر نظر ہو۔

۲- علم شرعی کی اس میں رغبت ہو، جھاڑنے کے سلسلے میں شریعت نے جو قاعدے اصول اور

(۱) مدارج السالکین ۱/۶۹۔

احکام بتائے ہیں، ان کو وہ اچھی طرح جانتا ہو اور اسی کے مطابق عمل کرے۔

۳-تقوے سے آراستہ ہو، گناہوں سے دور ہو، عبادت: نماز روزے وغیرہ کا اہتمام کرنے والا ہو۔

۴-اس کے اخلاق اچھے ہوں، جس کا علاج کر رہا ہو، اس کے ساتھ تواضع سے پیش آئے، نرمی، ہمدردی اور بردباری کا معاملہ کرے، خیر خواہی اور دیانت کا برتاؤ کرے۔ سچائی اور وفاداری کا پاس ولحاظ رکھے۔ وعدہ کرے تو پورا کرے، اس کی پوشیدہ بات کی حفاظت کرے، دوسروں کو نہ بتائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵-کسی ماہر سے اس نے اس کی تربیت حاصل کی ہو، دوسرے علم کی طرح یہ بھی مستقل علم ہے، جس کے اصول وقواعد ہیں، جھاڑنے والے کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

۶-ذکر اللہ سے وہ اپنی بیٹری چارج کرتا رہے، اور اپنی حفاظت کا سامان کرتا رہے، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شریر جن خود اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، تو اس کو آیۃ الکرسی، معوذتین اور نماز دعا وتلاوت وغیرہ سے اپنے کو مضبوط کرتے رہنا چاہیے۔

۷-اپنی قوت اور فن پر اس کی نظر نہ ہو، اللہ ہی پر اس کا اعتماد ہو، اسی کو شافی حقیقی سمجھے۔

۸-وہ دعوت الی اللہ کا اہتمام کرے، جن کا علاج کر رہا ہو ان کو گناہوں سے دور رہنے، اور عبادت واطاعت الٰہی اختیار کرنے کی ترغیب دے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ اسی طرح سرکش جنوں سے اس کا واسطہ پڑ رہا ہو اور ان سے بات کرنے کا موقع مل رہا ہو تو ان کو شریعت کے احکام بتائے، اور کسی کو پریشان کرنے پر جو وعیدیں ہیں وہ ان کو سنائے، اور اس کی بدانجامی سے متنبہ کرے اور اس کو بتائے کہ توبہ کرنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

۹- جنات اور شیاطین کے احوال، ان کی سازشوں اور مکروفریب سے وہ واقف ہو، اس لیے کہ جو شیاطین کی تلبیسات اور ان کی سازشوں سے واقف ہوگا وہ ان سے محفوظ رہ سکے گا، اور دوسروں کو بھی بچا سکے گا۔ ہوسکتا ہے کہ جس جن نے ستایا اور پریشان کیا ہے، وہ اچھی حالت میں سامنے آئے اور اپنے کو مومن اور مخلص ظاہر کرے۔ اس لیے علاج کرنے والے کو ان کے مکروفریب سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔

۱۰- پریشانی اور بیماری کی تشخیص اور علاج میں جلدی نہ کرے، جس طرح جسمانی ڈاکٹر پہلے بیماری کی اچھی طرح تشخیص کر لیتا ہے، پھر آہستہ آہستہ علاج کرتا ہے، اسی طرح روحانی ڈاکٹر کو بھی کرنا چاہیے، وہ پہلے اچھی طرح سمجھ لے کہ کیا بات ہے، پھر اس کے مطابق اس کو جھاڑے، مریض کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس پر جادو کیا گیا ہے، یا نظر لگی ہے، یا یہ حسد کا اثر ہے، اس کے نتائج بسا اوقات خطرناک ہو سکتے ہیں، جب اس طرح کیا جائے گا تو وہ کسی پر شک کرے گا اور اپنی تکلیف کی شدت کی بنیاد پر اس کو تکلیف پہنچانے پر آمادہ ہوگا، اور اپنے علاج کے بجائے اپنی جان کو گھلائے گا، جب کہ ہوسکتا ہے کہ جس پر اس کو شک ہوا ہے وہ اس سے بالکل بری ہو۔ کامیاب جھاڑنے والے کی علامت یہ ہے کہ وہ مرض کی تشخیص کر کے علاج کرتا جائے (۱)۔

فنی طور پر ایک کامیاب جھاڑنے والے میں یہ صفات ہونی چاہیے، ایسے ماہرین ہی سے جھڑوانا چاہیے، اور انھی کو تلاش کرنا چاہیے۔ اگر ان تمام صفات کا حامل شخص نہ ملے تو جتنی صفات پائی جائیں ان کو غنیمت سمجھنا چاہیے، اور کوئی باقاعدہ جھاڑنے والا بروقت نہ ملے تو سرِ دست کسی بھی صالح شخص سے جھڑوایا جا سکتا ہے۔

(۱) ان صفات اور ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے الرقیۃ الشرعیۃ من الکتاب والسنۃ النبویۃ (ص: ۱۰۹-۱۵۲)۔

تیرھواں باب

بچے کی تعلیم وتربیت

فصل اول

توحید وعقائد اور ارکان اسلام کی تعلیم

دینی تعلیم وتربیت کا واجب ہونا:

ایک مسلمان ماں باپ کو چاہیے کہ وہ شروع ہی سے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور صحابہ وسلف صالحین کے عملی نمونوں کی روشنی میں اپنے بچے کی تعلیم وتربیت کی فکر کریں اور اس کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کریں۔ آغاز اچھا ہوگا تو اٹھان بھی اچھی ہوگی اور امید ہے کہ انشاء اللہ انجام بھی بخیر ہوگا۔ اور اگر شروع ہی سے خدانخواستہ بگاڑ پیدا ہوا تو زندگی بھر ماں باپ کو رونا پڑے گا اور پھر بھی نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ اس لیے اس پہلو پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

صاف طور پر بچوں کو ادب واخلاق سکھانا اور دینی تعلیم دلانا واجب اور ضروری ہے، قرآن کریم سے اس کا پتا چلتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً (سورہ تحریم، آیت:۶)۔

اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنی بیوی بچوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

جب باپ اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کرے گا، اچھے اخلاق وآداب نہیں سکھائے گا، دینی تعلیم نہیں دلائے گا، اللہ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں سے واقف نہیں کرائے گا تو کیسے ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا!

اور ایک بہت مشہور اور صحیح حدیث ہے جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں: ہر شخص ذمے دار ہے اور اس سے اس کے ماتحت لوگوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ آدمی اپنے گھر

کا ذمے دار ہے اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی ذمے دار ہے، ان کے بارے میں اس سے سوال ہوگا(۱)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بچوں کو تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ(۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اپنے بیٹے کو اخلاق وادب سکھاؤ تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اس کو ادب سکھایا اور کیا تعلیم دی اور فرماں برداری اور بات ماننے کے سلسلہ میں اس سے سوال ہوگا(۳)۔

نیز انھی کا ارشاد ہے: جس طرح تم پر اپنے والد کا حق ہے اسی طرح تم پر اپنے بچوں کا بھی حق ہے۔(۴)

بچوں کو لوریاں دینے میں اسلامی تعلیم کا خیال رکھنا:

بچوں کو لوریاں دینا یعنی بہلانے اور سلانے کے لیے گیت گانا ایک فطری بات ہے، اس لیے کہ انسان طبعی طور پر اچھی آواز اور ترنم سے مانوس اور متاثر ہوتا ہے، اور انسان ہی نہیں دوسرے جانور بھی اس سے اثر لیتے ہیں۔ بچہ ہر چیز کا زیادہ احساس رکھتا ہے، اس لیے لوریاں دینے سے وہ بہل جاتا ہے، اور جلدی سو جاتا ہے۔

ماں کی گود سب سے پہلا مدرسہ ہے، اس لیے لوریاں دینے میں اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں کوئی بات خلافِ شریعت نہ آجائے۔ اس میں توحید کی باتیں، اسلام کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے واقعات ہوں تو زیادہ بہتر ہے، دنیا کی

---

(۱) بخاری (۸۹۳) ومسلم (۱۸۲۹)۔

(۲) شعب الایمان (۱۱/۱۲۷)۔

(۳) العیال لابن أبی الدنیا (۳۲۹ و۳۳۴) والسنن الکبری للبیہقی (۳/۸۴) وشعب الایمان للبیہقی (۱۱/۱۳۵)۔

(۴) الادب المفرد، (رقم:۹۴)۔

باتوں اور لا حاصل اور فضول چیزوں کا اس میں تذکرہ نہ ہو، اس لیے کہ یہ ساری باتیں بچے کے ذہن ودماغ پر نقش ہو جاتی ہیں۔(۱)

بنیادی تعلیم:

حدیث نبوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ بچوں کو پانچ طرح کی چیزیں سکھانے کا زیادہ اہتمام کرتے تھے:

(۱) توحید اور ارکانِ اسلام کی تعلیم (۲) رسول اللہ ﷺ کی محبت اور سیرتِ نبوی کی تعلیم (۳) قرآن سکھانا (۴) دعائیں یاد کرانا (۵) آداب واخلاق کی تعلیم۔

سب سے پہلے لا إلہ الا اللہ سکھانا:

مسلمان ماں باپ پر اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں سب سے پہلی چیز جو واجب ہوتی ہے، وہ یہ کہ بچے کو اللہ کی پہچان کروائی جائے۔ بچہ جب زبان کھولے اور کچھ بولنے کی کوشش کرے تو سب سے پہلے اس کی زبان سے لفظ ''اللہ'' نکلے۔ لفظ اللہ کی اس کو رٹ لگائے یہاں تک اس کی زبان سے یہی لفظ نکلنے لگے، اور جب اس کے اندر بولنے کی کچھ اور طاقت پیدا ہو جائے اور ایک مفرد لفظ سے زیادہ وہ بول سکے تو سب سے پہلے اس کو لا إلہ إلا اللہ سکھایا جائے، یہاں تک کہ وہ اس کو زبان سے ادا کر سکے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: سب

(۱) ہمارے شہر بھٹکل میں پہلے مائیں اور گھر کی خواتین بچوں کو جو لوریاں دیتی تھیں اس میں اللہ سے دعا ومناجات، اسلام کی تعلیمات اور سیرت کے واقعات کا ذکر ہوتا تھا۔ نئی نسل ان لوریوں کو بھولتی جا رہی ہے۔ ایسی لوریاں بھی اب سننے کو ملتی ہیں جن میں دنیا کی طلب کی باتیں ہوتی ہیں۔ دوسری جگہوں پر بھی یہی حال ہوگا۔ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ والدہ جو لوریاں دیتی تھیں ان میں مشہور شاعر مومنؔ کی یہ جہادی نظم بھی تھی:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

سے پہلا بول اپنے بچوں کو''لا إلہ إلا اللہ'' سکھاؤ اور مرتے وقت بھی ان کو''لا إلہ إلا اللہ'' کی تلقین کرو(۱) یعنی دنیا سے جاتے وقت آخری بول بھی یہی ہو۔

صحابہ وتابعین مستحب سمجھتے تھے کہ بچہ جب صاف بولنے لگے تو سب سے پہلے اسے سات مرتبہ''لا إلہ إلا اللہ'' سکھائیں، تاکہ سب سے پہلے یہی بات اس کی زبان سے ادا ہو(۲) اور''لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ'' (یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں) پورا کلمہ سکھائیں تو اور بہتر ہے۔ چناں چہ حضرت ام سلیم کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اپنے بچے انس کو اسی طرح پورا کلمہ سکھاتی تھیں، کہو: لا إلہ إلا اللہ، کہو: أشهد أن محمدا رسول اللہ(۳)

عقائد کی مزید تعلیم:

اور آہستہ آہستہ توحید کی مزید تعلیم دیں، تاکہ بچے کو اللہ کی صفات کا علم ہو جائے، اور مستحب یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے قرآن مجید کی وہ آیات سکھائیں جن میں اللہ کی صفات وکمالات کا تذکرہ ہو، اس طرح قرآن مجید سکھانے کا آغاز بھی ہو جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ خاندانِ عبدالمطلب (جو آپ ﷺ کا خاندان ہے) کا کوئی بچہ جب بولنے لگتا تو رسول اللہ ﷺ اس کو سات دفعہ سورہ بنی اسرائیل کی یہ آخری آیت سکھاتے ''الحمدللہ الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل وکبرہ تکبیرا''(۴)۔

---

(۱) شعب الإيمان ۱۱/ ۱۲۸ رقم ۸۲۸۲ اس کی سند ضعیف ہے۔ اس حدیث کو ابن قیم نے حاکم کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور بعد کے بہت سے مصنفین نے ابن قیم کے اعتماد پر حاکم کے حوالے سے نقل کیا ہے، جب کہ یہ حدیث مستدرک حاکم کے مطبوعہ نسخے میں کہیں موجود نہیں ہے، البتہ بیہقی نے شعب الإيمان میں حاکم کے واسطے سے روایت کیا ہے)۔

(۲) مصنف عبدالرزاق ۴/ ۲۵۷ (۴/ ۳۳۴) ومصنف ابن أبي شيبہ (۳/ ۲۰۵)۔

(۳) طبقات ابن سعد (۱۰/ ۳۹۶)۔

(۴) مصنف عبدالرزاق ۴/ ۲۵۷ (۴/ ۳۳۴) ومصنف ابن أبي شيبہ ۳/ ۲۰۵ و ۱۵/ ۵۵۵، عمل اليوم والليلة ابن سنی ==

(ترجمہ: تمام تعریفیں اور خوبیاں اس اللہ کے لیے ہیں، جس نے کسی کو اولاد نہیں بنایا، اور نہ ہی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک ہے، نہ وہ عاجز و کمزور ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو کسی مددگار کی ضرورت ہو، اور اس کی خوب بڑائی بیان کرو)

حضرت جندب بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نابالغ بچے تھے، تو آپ ﷺ قرآن سے پہلے ہمیں ایمان سکھاتے تھے، پھر قرآن سکھاتے تھے، جس سے ہمارے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا، اور آج تم ایمان سے پہلے قرآن سکھا رہے ہو۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضور ﷺ کے چچازاد بھائی اور آپ کے گھر کے بچے تھے، ان کی مشہور حدیث ہے، فرماتے ہیں کہ میں ایک دن سواری پر نبی ﷺ کے پیچھے سوار تھا، حضور ﷺ نے فرمایا بیٹے! میں تم کو چند باتیں سکھاتا ہوں: اللہ کا خیال رکھو (یعنی اللہ کے حدود، حقوق، اس کے احکام اور اوامر و نواہی کا لحاظ رکھو) اللہ تمھارا خیال رکھے گا (یعنی اللہ تمھارے کام آئے گا، اور شر اور تکلیف کو تم سے دور کرے گا)، اللہ کو دھیان میں رکھو اس کو تم اپنے سامنے پاؤ گے (یعنی اللہ تمھارے ساتھ ہوگا اور ہر مصیبت سے تمھاری حفاظت کرے گا، تمھاری مدد کرے گا، تمھیں ترقی دے گا)۔ جب کوئی چیز مانگنا ہو تو اللہ ہی

== (رقم ۴۲۶)، ابن أبی شیبہ نے اس کے لیے باب کا عنوان قائم کیا ہے: فی الصبیان متی یتعلمون القرآن بچے کب قرآن سیکھیں یعنی ان کو کب قرآن سکھایا جائے، یہ حدیث عمرو بن شعیب نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جیسا کہ عبدالرزاق اور ابن أبی شیبہ نے روایت کیا ہے تو معضل ہونے کی وجہ سے یہ ضعیف ہے، البتہ ابن السنی نے عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ کہہ کر متصلاً روایت کیا ہے یہ معضل ہو یا متصل، ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے جو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت قتادہ سے نقل کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ نبی ﷺ اپنے گھر کے چھوٹے بڑے کو یہ آیت سکھاتے تھے (تفسیر طبری ۵۹۰/۱۷) یہ بھی اگرچہ مرسل ہے مگر فی الجملہ پہلی روایت کی تائید کرتی ہے)۔

(۱) ابن ماجہ، رقم: ۶۱۔ السنن الکبری للبیہقی (۱۲۰/۳) واللفظ لہ۔ حدیث میں حزاورۃ کا لفظ ہے جس کے معنی قریب البلوغ بچوں کے آتے ہیں۔

سے مانگو، اور جب مدد طلب کرنی ہو تو اللہ ہی سے مدد طلب کرو، اور یقین کرو کہ تمام لوگ مل کر بھی تم کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہ تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا ہی جو اللہ نے تمھارے مقدر میں لکھ دیا ہو، اور سارے لوگ مل کر بھی تم کو کسی چیز میں نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اسی چیز میں جو اللہ نے تمھارے مقدر میں لکھ دی ہو، تقدیر لکھی جا چکی ہے اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔(۱)۔اسی طرح دین کی بنیادی باتیں اور ارکان اسلام کی تعلیم دے۔اس کا کچھ بیان بچوں کی عبادت کے بیان میں آرہا ہے۔

(۱) ترمذی (۲۵۱۶) واحمد (۱/۲۹۳و۳۰۳و۳۰۸) وابن سنی فی عمل الیوم واللیلۃ (رقم:۴۲۵) اور ابن السنی نے اس کے لیے عنوان قائم کیا ہے: باب أول ما یوصی به الصبي إذا عقل یعنی جب بچے میں سمجھ پیدا ہو جائے تو اس کو سب سے پہلے کس چیز کی تاکید کی جائے۔بعض نسخوں میں عنوان اس طرح ہے: باب ما یوصی به الغلام إذا عقل۔یہ عظیم اور جلیل القدر حدیث ہے جس سے بہت فوائد حاصل ہوتے ہیں اور بہت سی تعلیمات ملتی ہیں؛ اسی وجہ سے امام نووی نے اپنی اربعین میں بھی اس کو ذکر کیا ہے۔حافظ ابن رجب نے اس حدیث کی شرح میں نور الاقتباس من مشکاة وصیة النبي صلی الله علیه وسلم لابن عباس کے نام سے پوری کتاب لکھی ہے، جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، نیز اپنی دوسری کتاب اربعین کی شرح: جامع العلوم والحکم میں بھی اس پر مفصل کلام کیا ہے اور مبسوط شرح کی ہے

فصل دوم

رسول اللہ ﷺ کی محبت اور سیرت نبوی کی تعلیم

توحید کی تعلیم کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی محبت اور عظمت بھی بچے کے اندر پیدا کریں۔ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بچوں کو تین باتیں سکھاؤ: اپنے نبی ﷺ کی محبت، اہل بیت (حضور ﷺ کے گھر اور خاندان والے) کی محبت اور قرآن کی تلاوت (۱) اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کا نام، آپ ﷺ کے والدین کا نام، آپ کی پیدائش اور ہجرت کے مقام کا نام، اور اس طرح کی چھوٹی چھوٹی اور ضروری باتیں بچوں کے ذہن میں بٹھائیں۔اسی طرح آپ ﷺ کا محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی سیرت کے واقعات ان کو بتائیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام زین العابدین فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ کے غزوات اور جنگوں کے بارے میں ہمیں تعلیم دی جاتی تھی جس طرح قرآن کی سورت کی تعلیم دی جاتی تھی۔(۲) یعنی جس طرح بچپن میں قرآن سکھایا جاتا تھا، ویسے ہی آپ ﷺ کی جنگوں کے بارے میں بھی ہمیں بتایا جاتا تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پوتے اسماعیل بن محمد بیان کرتے ہیں کہ میرے ابا ہم بچوں کو رسول ﷺ کے مغازی (جنگوں کے واقعات) کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کو وضاحت سے الگ الگ بیان کرتے تھے اور فرماتے تھے: اے بچو! یہ تمھارے باپ

(۱) اخرجہ ابونصر عبدالکریم الشیرازی فی فوائدہ وابن النجار عن علی، دیکھیے الجامع الصغیر (رقم: ۳۱۱) اور سیوطی نے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۲) الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب (ص ۳۵۹، رقم ۱۶۰۲) طبع دار الکتب العلمیۃ

دادوں کے شاندار کارنامے ہیں، پس ان کے تذکرے کومت بھولو(۱)۔

اسی طرح سیرت کی دیگر معلومات ان کے ذہنی سطح کے مطابق ان کے ذہن نشین کرتے رہیں۔

اہلِ بیت اور صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم کی محبت ان کے اندر پیدا کریں، امہات المؤمنین (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، خلفاے راشدین اور عشرۂ مبشرہ اور دیگر صحابہ کے نام آہستہ آہستہ ان کو بتائیں اور ان کی عظمت ان کے اندر پیدا کریں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین (گذرے ہوئے بزرگانِ دین) اپنے بچوں کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی محبت سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔(۲)

(۱) أیضاً (ص ۳۵۸، رقم ۱۶۰۱)۔

(۲) تاریخ دمشق، ۴۴/ ۳۸۶

تیسری فصل

بچوں کو قرآن سکھانا

قرآن اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور مکمل دستورِ حیات ہے۔ ہر مسلمان کو اس سے ایسا تعلق ہونا چاہیے جیسے مچھلی کو پانی سے، کہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح قرآن مجید کے بغیر کوئی مسلمان حقیقت میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ پس ہر مسلمان ماں باپ کو چاہیے کہ ہر تعلیم سے پہلے وہ اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم سے مانوس کریں، اس کا شوق ان میں پیدا کریں۔ آج عموماً ایسا ہوتا ہے کہ بچہ جب کچھ بولنے لگتا ہے تو الف۔ با کے بجائے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی اس کی زبان سے ادا کروائے جاتے ہیں اور اس کو غیر مسلموں کی گود میں دیا جاتا ہے۔ اس کی زبان پر پہلے انگریزی اور دوسری زبانوں کے حروف چڑھ جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کو بعد میں قرآن پڑھوانے اور ان سے صحیح مخارج ادا کروانے میں دقت ہوتی ہے۔ اور یہ سراسر قرآن اور حدیث کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو سب سے پہلے قرآن کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: هو الذی بعث فی الأمیین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته و یزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة (۱)۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی نے امی (ان پڑھ) لوگوں میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا جو اس کی آیتیں انھیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے (ان کے دلوں سے گندیوں کو دور کر کے اچھے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے) اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

(۱) سورہ جمعہ آیت ۲۔

اس آیت (۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قرآن کے حروف والفاظ سکھانا چاہیے، پھر آداب واخلاق کی تعلیم، پھر کتاب الٰہی کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش، پھر سارے علوم وفنون حکمت کے لفظ میں ساری چیزیں داخل ہیں۔

اس آیت کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو آج اکثر مسلمان تعلیم کی صحیح ترتیب سے ہٹ گئے ہیں اور بہت دور ہو گئے ہیں، اور ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو یہ ایک جرم ہے جس کے اکثر مسلمان مرتکب ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تعلیمی رخ کو یکسر بدلا جائے، ایک مسلمان بچے کو بنیادی عقائد کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے قرآن سکھایا جائے، پھر اخلاق وآداب کی تعلیم دی جائے، پھر اس کو کتاب الٰہی (قرآن مجید) کو سمجھانے کی فکر کی جائے، پھر شریعت کے دائرے میں رہ کر سب کچھ سکھایا جاسکتا ہے۔

مشہور حدیث ہے خیر کم من تعلم القرآن وعلّمه (۲) یعنی تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے، تو جو شخص اپنے بچے کو قرآن سکھائے اگرچہ خود نہ پڑھائے بلکہ کسی سے سکھائے وہ بھی اس فضیلت میں شامل ہے۔ (۳)۔

حدیثوں میں صراحت سے اس کی تاکید کی گئی ہے کہ بچوں کو سب سے پہلے قرآن سکھایا جائے۔ ایک حدیث ابھی پیچھے گزر چکی ہے کہ بچوں کو نبی ﷺ کی اور اہل بیت کی محبت سکھاؤ اور قرآن پڑھاؤ۔

---

(۱) اسی طرح سورہ بقرہ آیت ۱۵۱ اور سورہ آل عمران آیت ۱۶۴ میں بھی اللہ نے اسی ترتیب سے اس بات کو بیان کیا ہے۔ قابل غور بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں (سورہ بقرہ آیت ۱۲۹) یہ ترتیب نہیں ہے۔ مگر اللہ نے اصلاح کر کے تعلیم کی صحیح ترتیب مقرر فرما دی۔ أفادنا بأصل ذلك الشيخ الأستاذ العلامة الداعية السيد سلمان الحسيني الندوي حفظه الله

(۲) بخاری (۵۰۲۷)۔

(۳) دیکھیے الرسالة المفصلة لأحوال المعلمين وأحكام المعلمين والمتعلمين (۶۰/للقابسی)۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اپنے بچے کو ناظرہ (دیکھ کر) قرآن پڑھنا سکھائے اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کرے گا (۱) اور جو اپنے بچے کو حفظ قرآن سکھائے اللہ قیامت کے دن چودھویں رات کے چاند کی صورت میں اس کو اٹھائے گا اور اس کے بیٹے سے کہا جائے گا: پڑھ، تو جب بھی وہ ایک آیت پڑھے گا اللہ اس کے باپ کا ایک درجہ بلند کرے گا، یہاں تک کہ وہ پورا قرآن ختم کرے گا (۲)

اور ایک حدیث ہے کہ جو قرآن پڑھے اور سیکھے اور اس پر عمل کرے قیامت کے دن اس کو نور کا ایک تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح ہوگی، اور اس کے والدین کو دو جوڑے ایسے پہنائے جائیں گے کہ پوری دنیا کی قیمت جن کے برابر نہیں ہوسکتی، وہ پوچھیں گے ہمیں کس بنیاد پر یہ جوڑے پہنائے جارہے ہیں، جواب ملے گا تمھارے بچے کے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے (۳)۔

رسول اللہ ﷺ خود بچوں کو قرآن سکھاتے تھے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں (۴) اور جیسا کہ عقائد کی تعلیم کے سلسلے میں حضرت جندب بن عبداللہ کی یہ بات گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلے ہمیں ایمان سکھاتے تھے پھر قرآن سکھاتے تھے۔

صحابہ وتابعین بھی اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ بچے بچپن ہی میں قرآن

---

(۱) ایسے موقعوں پر گناہ کی معافی سے صغیرہ یعنی چھوٹے گناہوں کی معافی مراد ہوتی ہے، کبیرہ یعنی بڑے گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں یا پھر اللہ ہی معاف کرنا چاہے۔

(۲) المعجم الأوسط للطبرانی (۱/۵۲۴۔۵۲۵، رقم ۱۹۳۵) اس کی سند میں ضعف ہے، ایک راوی مجہول ہے۔

(۳) مستدرک حاکم ۱/۵۶۸ یہ حدیث صحیح ہے، ابوداؤد میں بھی اس کے قریب قریب ایک روایت ہے، مگر اس کی سند میں ایک راوی ضعیف ہے (دیکھیے رقم ۱۴۵۳)۔

(۴) دیکھیے مسلم (۴۰۳)۔

سیکھیں۔حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ ایک سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور بچوں کو پڑھاتے ہیں (۱)۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن کو لازم پکڑلو، خود سیکھو اور بچوں کو سکھاؤ، اس کے بارے میں تم سے سوال ہوگا، (مرنے کے بعد) اور اس کے ذریعے تم کو ثواب دیا جائے گا، اور سمجھنے والے کی نصیحت کے لیے یہ کافی ہے (۲)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بچوں کو قرآن سکھا رہے تھے، حضرت خباب رضی اللہ عنہ آکر ان کے پاس رک گئے اور پوچھا: آپ بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے علقمہ سے (جو ان سے پڑھ رہے تھے) کہا: پڑھ کر سناؤ۔ انھوں نے پڑھا، اس پر عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: میں جو کچھ قرآن جانتا ہوں وہ علقمہ کو معلوم ہے (۳) یعنی میں نے اس کو پورا قرآن سکھا دیا ہے۔

حسن بن عمرو کہتے ہیں کہ مجھے میرے والد، سعید بن جبیر (مشہور تابعی) کے پاس لے گئے جب کہ میں چھوٹا تھا، انھوں نے میرے والد سے پوچھا: تم اس کو قرآن سکھاتے ہو؟ (۴)۔

ایک صحابی ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اے بچوں کو اور گھر والوں کو قرآن سکھاؤ، اس لیے کہ اللہ تعالی نے جس مسلمان کے لیے جنت میں جانا طے کیا ہے، اس

(۱) احمد: ۴/۱۶۰و ۲۱۸-۲۱۹و ۲۱۹) و ترمذی (۲۶۵۳) و ابن ماجہ (۴۰۴۸) والحاکم (۱/۹۹)۔

(۲) فضائل القرآن لابی عبید، (ص: ۵۲-۵۳)۔

(۳) دیکھیے تاریخ ابن أبی خیثمہ (ص: ۵۳۸، رقم: ۱۳۲۱) نیز حلیۃ الاولیاء (۲/۹۹)۔

(۴) مصنف ابن أبی شیبہ (۱۵/۵۵۵)۔

سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور جنت کی سیڑھیوں پر چڑھتا جا، پس اس کو جتنا قرآن آتا ہوگا وہ پڑھتے ہوئے اس حد تک اوپر پہنچ جائے گا۔(۱)۔

ایک تابعی ثابت بن عجلان فرماتے ہیں: کہا جاتا تھا کہ اللہ زمین والوں کو عذاب پہنچانا چاہتا ہے، مگر جب بچوں کا قرآن سیکھنا وہ سنتا ہے تو عذاب کو ان سے ہٹا دیتا ہے (۲)۔

عبداللہ بن عیسی کہتے ہیں کہ اس امت میں ہمیشہ خیر رہے گا جب تک اس کے بچے قرآن سیکھتے رہیں (۳)۔

صرف قرآن سکھانا ہی نہیں، تجوید کے ساتھ سکھانا ضروری ہے۔

اور جو بچے قرآن سیکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو زبردستی سکھائیں اور جو کوتاہی کرتے ہوں ان کو سزا دیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مشہور شاگرد عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ ابن عباس میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر مجھے قرآن وحدیث سکھاتے تھے (۴)۔

حفظ قرآن اور سلف میں اس کا اہتمام:

ناظرہ قرآن سکھانے پر اکتفانہ کریں، بلکہ اس کی کوشش کریں کہ بچوں کو قرآن رسانی یاد ہو اور وہ پورے حافظ قرآن بنیں، اور کم سے کم جہاں تک ہوسکے ان کو قرآن کی سورتیں یاد کرائیں، خاص طور پر آخری پاروں کی سورتیں جن کو عموماً نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔

(۱) سنن سعید بن منصور، فضائل القرآن ( ) ومصنف ابن أبی شیبہ (۱۵/۴۸۰، و۱۹/ ۲۴۷) ابن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں :اس کے پاس دو فرشتے آکر اس کو گھیر لیتے ہیں، پڑھتا جا اور جنت کی سیڑھیوں پر چڑھتا جا، یہاں تک کہ جتنا وہ قرآن جانتا ہوگا وہاں تک اوپر وہ اس کو پہنچا دے گا۔

(۲) سنن الدارمی باب فی تعاہد القرآن (رقم:۳۳۴۰) والعیال لابن أبی الدنیا (رقم:۳۱۰)۔

(۳) العیال لابن أبی الدنیا (رقم:۳۰۹)۔

(۴) سنن الدارمی (رقم:۵۵۶)۔

متعدد صحابہ کے بارے میں منقول ہے کہ بچپن ہی میں انھوں نے اچھا خاصا قرآن یاد کرلیا تھا، چناں چہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت میں دس سال کا تھا اور میں نے قرآن مجید کی چھوٹی سب سورتیں (سورہ حجرات سے اخیر قرآن تک) یاد کرلی تھیں۔(۱)۔اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے بچپن میں قرآن حفظ کرلیا تھا(۲)۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کی مدینہ ہجرت کے موقع پر دس گیارہ سال کے بچے تھے اور اس وقت تک وہ ''سبح اسم ربک الاعلی'' اور اس طرح کی بہت سی سورتیں یاد کر چکے تھے(۳)۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہجرت کے وقت گیارہ سال کے تھے اس تعارف کے ساتھ انھیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ یہ قبیلہ خزرج کا بچہ ہے، اس کو سولہ سورتیں یاد ہیں(۴)۔

حضرت عمرو بن سلمہ کو چھ سات سال کی عمر میں اتنا قرآن یاد تھا کہ لوگوں نے ان کو اپنا امام بنالیا تھا۔(۵)۔

اور سلف میں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ بچہ دوسری تعلیم حاصل کرنے سے پہلے حافظ

(۱) بخاری (۵۰۳۵) و (۵۰۳۶) اس کے لیے امام بخاری نے باب قائم کیا ہے باب تعلیم الصبیان القرآن (بچوں کو قرآن سکھانے کا بیان)۔

(۲) دیکھیے فتح الباری (۲۸۲/۱۱)۔ (۳) بخاری (رقم: ۳۹۲۵، و ۳۹۴۱)۔

(۴) مستدرک حاکم ۴۲۱/۳۔ اس عمر میں اتنی سورتیں یاد کرنا ویسے کوئی بڑی بات نہیں معلوم ہوتی، مگر جس زمانے میں انھوں نے اتنا یاد کیا تھا وہ مدینے میں اسلام کے آغاز کا زمانہ تھا، اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان بچوں کو قرآن یاد کرنے کا کتنا شوق تھا اور ان کے بڑوں کو اس کا کتنا اہتمام تھا۔

(۵) دیکھیے بخاری (۴۳۰۲)۔

قرآن ہو۔

مشہور محدث ابن جریج کہتے ہیں میں حدیث کا علم حاصل کرنے کے لیے عطاء کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے پاس (دوسرے محدث) عبداللہ بن عبید بن عمیر بیٹھے ہوئے تھے، عبداللہ بن عبید بن عمیر نے مجھ سے پوچھا: تم کو قرآن یاد ہے؟ میں نے کہا: نہیں ۔انھوں نے کہا: جاؤ پہلے قرآن یاد کرو، پھر علم حاصل کرنا(۱)۔

ایک محدث حفص بن غیاث کہتے ہیں کہ میں (مشہور عالم ومحدث) اُعمش کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا مجھ سے حدیث بیان کیجیے ۔انھوں نے پوچھا: کیا تم کو قرآن ازبر یاد ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔انھوں نے کہا: جاؤ پہلے قرآن حفظ کرو، پھر آنا حدیث سناؤں گا۔میں گیا اور میں نے قرآن حفظ کرلیا، پھران کے پاس حاضر ہوا تو انھوں نے مجھ سے قرآن پڑھنے کے لیے کہا: میں نے پڑھا تو انھوں نے مجھ سے حدیثیں بیان کیں(۲)۔

ایک اور محدث ولید بن مسلم بیان کرتے ہیں کہ جب ہم امام اوزاعی (شام کے مشہور عالم وفقیہ) کے پاس ہوتے اور وہ ہم میں کسی نوعمر لڑکے کو دیکھتے تو اس سے پوچھتے: بچے! تم کو قرآن یاد ہے؟ وہ ہاں میں جواب دیتا، تو فرماتے، یوصیکم اللہ فی أولادکم والی آیت پڑھو(۳)۔اور وہ جب نا میں جواب دیتا تو فرماتے: جاؤ، علم حاصل کرنے سے پہلے قرآن یاد کرو۔(۴)۔

---

(۱) تاریخ بغداد(۱۰/۴۰۲)۔ (۲) المحدث الفاصل (ص:۲۰۳)۔

(۳) النساء:۱۱۔یہ متشابہ آیتوں میں سے ہے، حفاظ جانتے ہیں کہ شروع شروع میں اس آیت کو یاد رکھنے میں کتنی دشواری ہوتی ہے۔

(۴) الجامع للخطیب (ص:۲۷، رقم:۸۰) اس سلسلے میں اور بھی آثار ہیں جن کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی

بچوں کو قرآن سمجھانے کی کوشش:

اور قرآن سکھانے کے ساتھ ساتھ بچے کی ذہنی سطح کے مطابق قرآن کی بعض آیتوں کی اس کے سامنے تشریح بھی کرتے جائیں اور اس کو سمجھانے کی کوشش کریں، تاکہ بچپن ہی سے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے قرآن سمجھ کر پڑھنے کی چیز ہے اور ایک عملی اور رہنما کتاب (Guide Book) ہے، نبی صلی اللہ اور صحابہ اپنے بچوں کے ساتھ اسی طرح کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے مجھ سے سورہ نساء کے بارے میں پوچھو میں نے بچپن ہی میں قرآن پڑھا تھا(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں انھوں نے قرآن کا اکثر حصہ سمجھ کر پڑھا تھا، اس لیے کہ اگر صرف حروف والفاظ کی بات ہوتی تو وہ کہتے قرآن مجھ سے پڑھو۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر کے بچوں کے ساتھ کرتی تھیں (۲)۔

حضرت سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے مصعب نے ان سے پوچھا: ابا جان! الذين هم عن صلاتهم ساهون (ماعون:۵) (وہ لوگ جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں) کا کیا مطلب ہے؟ ہم میں کون ہے جس کو غفلت نہیں ہوتی اور جس کے دل میں خیالات نہیں آتے؟ انھوں نے کہا اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی غفلت میں پڑا رہے، یہاں تک کہ نماز کا وقت نکل جائے (۳)۔

---

(۱) مستدرک حاکم ۲/۳۰۱۔

(۲) مثلاً دیکھیے صحیح البخاری (۳۳۸۹، ۴۶۹۵)۔

(۳) مسند أبي یعلی (۱/۳۰۰ رقم ۷۰۰)۔

فصل چہارم

دعائیں یاد کرانا

بچپن میں بچوں کو قرآن کی سورتوں کے ساتھ ساتھ دعائیں بھی یاد کروانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔بچپن میں ذہن صاف ہوتا ہے،اس لیے چیزیں جلدی یاد ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اس طرف توجہ فرماتے تھے اور بچوں کو دعائیں سکھاتے تھے۔حضرت حسن رضی اللہ عنہ جن کی عمر رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت صرف آٹھ برس کی تھی،فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دعائے قنوت سکھائی اللھم اھدني فیمن ھدیت...... (۱)۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس طرح کی بات بیان کرتے ہیں (۲)۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جو رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور حضور ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے اور حضور ﷺ کے انتقال کے وقت ان کی عمر نو دس سال کی تھی۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز سے سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

لا الہ الّا اللہ وحدہ لا شریك له ،له الملك وله الحمد وھو علی كلّ شيء قدیر ،لاحول ولاقوۃ الّا باللہ ،لاإله إلا الله ،ولانعبد الّا إیاہ ،له النّعمة وله الفضل ،وله الثناء الحسن، لا الہ إلّااللہ مخلصین له الدین ولو كرہ الكافرون۔

(۱) أبوداود (۱۴۲۵) ترمذی (۴۶۴) نسائی (۱۷۴۶) ابن ماجہ (۱۱۷۸) مسند احمد (۱/۱۹۹)۔

(۲) مسند احمد (۱/۲۰۱)۔

انھوں نے بچپن میں رسول اللہ ﷺ سے یہ دعا سیکھی تھی، اس پر ہمیشہ عمل کرتے رہے۔(۳)۔

صحابہ اور تابعین بھی بچوں کو دعائیں سکھانے کا اہتمام کرتے تھے، مشہور تابعی ابراہیم نخعی بیان کرتے ہیں: ہمارے بڑے ہمیں حکم دیتے تھے جب کہ ہم بچے تھے کہ ہم جب سونے کے لیے بستر پر جائیں تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھیں۔(۲)۔

اسی طرح بچوں کو تمام مسنون دعائیں اور صبح وشام کے اذکار ایک ایک کر کے سکھائیں، تا کہ بچہ بالغ ہونے تک ان کا عادی بنے۔

(۱) مسلم (۵۹۴)۔

(۲) مصنف ابن أبي شیبہ (۵۰۸/۱۳)۔

فصل پنجم
آداب واخلاق کی تعلیم

اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی پہچان اور قرآن مجید کی تعلیم اور اذکار ودعائیں سکھانے کے ساتھ ساتھ بچے کو آداب واخلاق کی تعلیم بھی دیتے رہیں۔ آداب سے مراد ہر چیز کا ادب: سلام کا ادب، کسی کے یہاں آنے جانے کا ادب، کھانے پینے کا ادب، سونے کا ادب، بڑوں کے ساتھ بات کرنے کا ادب وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ بچوں کو ادب اور اخلاق سکھانے کی بڑی تاکید فرماتے تھے، ایک حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس سے افضل اور بہتر تحفہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھے اخلاق کی تعلیم دے (۱) یعنی ادب واخلاق کی تعلیم دینا سب سے بہتر تحفہ ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی اپنے بچے کو ادب سکھائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ آدھا صاع (تقریباً ایک کلو) ہر دن صدقہ کرے (۲)

سلام سکھانا:

متعدد حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچوں کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے (۳)۔

(۱) ترمذی (۱۹۵۲) مسند احمد (۴۱۲/۳) یہ حدیث مرسل ہے۔

(۲) ترمذی (۱۹۵۱) اس کی سند میں ایک راوی بہت ضعیف ہے۔

(۳) دیکھیے بخاری (۶۲۴۷) ومسلم (۲۱۶۸) وابوداود (۵۲۰۲) وابن ماجہ (۳۷۰۰)۔

اس کا ایک اہم مقصد بچوں کو سلام سکھانا اور ان کو سلام کا عادی بنانا ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہونے کا ادب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی اہمیت بیان کی ہے، گھر میں داخل ہونے کے ادب کے سلسلے میں اللہ فرماتا ہے: یاأیها الذین آمنو لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم و الذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات من قبل صلاة الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظهیرة و من بعد صلاة العشاء، ثلاث عورات لکم ،لیس علیکم و لا علیهم جناح بعدهن. طوافون علیکم بعضکم علی بعض، کذلک یبین الله لکم الآیات و الله علیم حکیم(۱)۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو بھی ان اوقات میں اجازت لے کر گھروں میں آنا جانا چاہیے۔ بغیر اجازت گھسنے میں بہت مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

آپ ﷺ بچوں کو سکھاتے کہ جب گھر میں جائیں تو سلام کر کے داخل ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جو آپ ﷺ کے خادم اور بچے کی طرح تھے، حضور ﷺ نے سکھایا کہ بیٹے! جب اپنے گھر میں داخل ہونے لگو تو سلام کرو، اس سے تم کو بھی برکت ہوگی اور تمھارے گھر والوں کو بھی(۲)۔

---

(۱) سورہ نور آیت:۵۸۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے (اے ایمان والو! تمھارے غلام باندی اور تمھارے وہ بچے جو ابھی بلوغ کو نہیں پہنچے، ان کو چاہیے کہ تین اوقات میں اجازت لے کر تمھارے پاس آیا کریں، صبح کی نماز سے پہلے، اور دوپہر کے وقت جب تم (آرام کرنے کے لیے) کپڑے اتار دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین تمھارے پردے کے اوقات ہیں، ان اوقات کے علاوہ تمھارے اور ان کے اوپر بغیر اجازت آنے میں کوئی حرج نہیں، تمھیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا جانا ہی ہوتا ہے، اسی طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ بڑے علم والا بڑی حکمت والا ہے)۔

(۲) ترمذی (۲۶۹۸)۔

صحابہ اور تابعین بھی بچوں کو عملی طور پر اس کی مشق کراتے تھے اور گھر میں داخل ہونے کا ادب سکھاتے تھے۔ ریحانہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے گھر کی ایک باندی تھی، گھر کے لوگوں نے اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا، تو وہ اجازت لیے بغیر گھر میں داخل ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ نے اس کو صحیح طریقہ سکھایا، اس سے کہا: باہر نکلو اور سلام کرو، جب سلام کا جواب ملے تو اندر آنے کی اجازت لو(۱)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت اسلم کے لڑکے زید کہتے ہیں کہ میرے ابا نے مجھے حضرت عمر کے پاس بھیجا، میں گیا اور اجازت لیتے ہوئے میں نے عرض کیا: اندر آ سکتا ہوں؟ انھوں نے میری آواز پہچان لی، کہنے لگے: بیٹے! ایسا نہ کہو، جب کسی کے پاس جاؤ تو کہو السلام علیکم، اگر وہ سلام کا جواب دیں تو اس وقت کہو کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ (۲)۔

مشہور تابعی محمد بن سیرین آیت: والذین لم یبلغوا الحلم (جس کی تفسیر پیچھے گزر چکی ہے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہمارے گھر والے ہمیں سلام کرنا سکھاتے تھے، تو ہم میں سے کوئی جب کہیں جاتا تو کہتا: السلام علیکم! کیا میں آ سکتا ہوں؟ (۳)

کھانے پینے کا ادب:

رسول اللہ ﷺ عملی لحاظ سے بھی اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ بچے ہر طرح کا ادب سیکھیں، آپ ﷺ کی زوجہ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے عمر بن أبی سلمہ رضی اللہ عنہما جو حضور ﷺ کے گھر کے بچے اور آپ ﷺ کی گود کے پلے تھے کہتے ہیں: کہ میں بچہ تھا رسول اللہ ﷺ کی گود میں پرورش پاتا تھا، میرا ہاتھ پلیٹ میں ادھر

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ (۱۳/۱۷۱)۔

(۲) مسند احمد (۲/۳۳) و مصنف ابن أبی شیبہ (۱۳/۱۷۲)۔

(۳) مصنف ابن أبی شیبہ (۱۳/۲۱۹)۔

ادھر جاتا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: بیٹے! بسم اللہ کہو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔(۱)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو آپ ﷺ کے گھر کے بچے تھے (آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے لڑکے اور آپ ﷺ کی زوجہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مشکیزہ کے منہ سے (یعنی اس کو منہ لگا کر) پانی پینے سے منع فرمایا۔(۲)

(۱) بخاری (۵۳۷۶) ومسلم (۲۰۲۲)۔

(۲) بخاری (۵۶۲۹)۔

فصل ششم

دیگر دینی اور اخلاقی تعلیمات

بچوں کو ہر طرح کی صحیح تعلیم دینا ضروری ہے، بچوں کی تربیت کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں سے ہم اس سلسلے میں تفصیلی معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور بچوں کی پوری طرح صحیح تربیت کر سکتے ہیں۔ ہم یہاں چند ضروری باتیں بیان کر رہے ہیں جن کے بارے میں حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ چیزیں بچوں کے اندر پیدا کرنے کا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔

خودداری:

بچپن ہی سے ان کے اندر خودداری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، صدقہ وزکاۃ کا مال کھانے کی نفرت ان کے اندر پیدا کریں۔ ایک دفعہ آپ ﷺ کے نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ صدقے کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں رکھنے لگے حضور ﷺ نے بڑی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: غلیظ! ارے یہ کیا کر رہے ہو، پھینکو اسے، کیا تم نہیں جانتے کہ ہم لوگ صدقہ کا مال نہیں کھاتے، اور ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے منہ سے نکال کر پھینکا (۱)۔

اس انداز تربیت سے بیک وقت کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ حرام مال بچے کے پیٹ میں نہیں پہنچے گا۔

دوسرے یہ کہ صدقہ اور ناجائز چیز سے بچپن ہی سے بچے کے اندر نفرت پیدا ہوگی۔

(۱) بخاری (۱۴۹۱، ۱۴۸۵) ومسلم (۱۰۶۹)۔

تیسرے یہ کہ بچہ کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط کرے گا، جب تک اماں ابا کا اشارہ نہ ہو کوئی چیز نہیں کھائے گا۔

چوتھے یہ کہ اس طرح بچہ حرص سے محفوظ رہے گا۔ اکثر بچے کھانے کے بہت حریص ہوتے ہیں، اور کھانے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ہر چیز پر للچائی ہوئی نظر ڈالتے ہیں، کوئی دینے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو خود دوڑ کر اس کے ہاتھ سے لیتے ہیں، اور اس طرح کی بہت سی چیزیں جو بچوں سے ظاہر ہوتی ہیں جن سے بسا اوقات ماں باپ کو شرم آتی ہے اور بھری محفل میں ان کو بے عزتی محسوس ہوتی ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ بچے کے اندر ایسی عادت پیدا کی جائے کہ جب تک ماں باپ کا اشارہ نہ ہو، بچہ کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز نہ لے۔ اور بعض بچے طبعاً بھی اس طرح ہوتے ہیں، جو دوسرے والدین کے لیے قابلِ رشک ہوتے ہیں۔

اس کے بالمقابل اس کی کوشش کرنی چاہیے بچے لینے کے بجائے دینے کے عادی بنیں۔ فقیروں کو بچوں کے ہاتھوں سے پیسے دیں؛ یہاں تک کہ بچے سمجھیں کہ مانگنے والوں کا حق ہوتا ہے، اس کو ڈانٹنا، جھڑکنا یا کچھ دیے بغیر واپس نہیں بھیجنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ بچوں کے سامنے یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس طرح اوپر کی بات حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے، یہ بات ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مانگنے والے کا حق ہوتا ہے اگر چہ کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کیوں نہ آئے۔ (۱) یعنی بظاہر دیکھنے میں اس کا حال بہت اچھا ہو لیکن پھر بھی اس کو کچھ دے دینا چاہیے، یہ سوچ کر کہ وہ مجبوری میں مانگ رہا ہے، اگر یہ

(۱) مسند احمد ۱/ ۲۰۱، وسنن أبي داؤد (۱۶۶۵) وصحیح ابن خزیمہ (۴/ ۱۰۹) رقم: ۲۴۶۸۔

معلوم ہو کہ مانگنے کا اس نے پیشہ بنا رکھا ہے جب کہ وہ کما سکتا ہے تو اس کو سمجھائیں اور کمائی کا طریقہ بتائیں۔

شرم وحیا:

حیا کے معنی ہیں کوئی بھی غلط اور نامناسب کام کرنے سے انقباض، یعنی دل کے اندر اس کے نہ کرنے کا جذبہ پیدا ہونا اور شرم محسوس ہونا، حیا کو اسلام میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، یہاں تک فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ”إن لكل دين خلقاً و خلق الإسلام الحياء“ (۱) یعنی ہر دین و مذہب کی کوئی خاص صفت ہوتی ہے، اسلام کی یہ خاص صفت حیا ہے۔ حیا ہی کی وجہ سے انسان گناہوں سے محفوظ رہتا ہے، حیا نہ ہو تو ہر چیز کر گزرتا ہے، کوئی چیز اس کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی، رسول اللہ ﷺ بچوں کے اندر بچپن ہی سے یہ بات پیدا کرنا چاہتے تھے، چناں چہ اس حدیث کے روایت کرنے والے بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت انس رضی اللہ عنہ جیسے نوعمر صحابہ ہیں۔

حیا کی صفت پیدا کرنے کے لیے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ آدمی اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی طرف پوری توجہ کرے، اگر اس سلسلے میں کوئی کوتاہی پیدا ہوئی تو بچہ بے حیائی کی طرف جھکتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، رسول اللہ ﷺ بچوں کو یہ بات کم عمری ہی سے سمجھاتے تھے، حضور ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن أبی طالب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ”ناف سے گھٹنے کے درمیان پردہ ہے“ (۲) یعنی اس کو کسی کے سامنے کھولنا جائز نہیں۔

---

(۱) ابن ماجہ (۴۱۸۱، ۴۱۸۲)۔

(۲) مستدرک ۳/ ۵۶۸۔ اس کی سند میں تو ضعف ہے، مگر اس مضمون کی تائید متعدد صحیح حدیثوں سے ہوتی ہے۔

معلوم ہونا چاہیے ان کی عمر رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت صرف دس سال کی تھی اور رسول اللہ ﷺ ان کے والد کی ۸ھ میں غزوۂ موتہ میں شہادت کے بعد خاص طور پر ان کی بہت فکر رکھتے تھے۔

اور ایک نوعمر صحابی محمد بن عبداللہ بن جحشؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ران پردہ ہے، یعنی اس کا چھپانا ضروری ہے(۱)۔

والدین کی فرماں برداری اور احترام:

والدین کے ساتھ احترام اور ان کی فرماں برداری کی اسلام میں جو تاکید ہے، اس کو ہر شخص جانتا ہے، قرآن میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے، اور حدیثیں تو اس سلسلے میں بہت زیادہ ہیں، ان کو ہم یہاں بیان نہیں کریں گے، ہم یہاں صرف اس بات کا ذکر کریں گے کہ بچوں کو والدین کے ساتھ کس طرح کا ادب کا معاملہ کرنا چاہیے، قرآن کی آیت: ”وقل لهما قولا كريما“(سورة بنی اسرائيل:۲۳) (یعنی ان سے احترام کے ساتھ بات کرو) کی تفسیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کو نام سے مت پکارو، ابا اماں کہہ کر پکارو(۲)۔ باپ کا ادب یہ ہے کہ ان کو نام سے نہ پکارے، ان کے سامنے نہ چلے، ان کے آگے نہ بیٹھے، اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے باپ کو ڈانٹنا اور برا بھلا کہنا پڑے(۳)۔

---

(۱) بخاری، کتاب الصلاۃ باب مایذکر فی الفخذ۔

(۲) تفسیر کبیر (۱۵۲/۲۰) اسی طرح عطاء سے بھی مروی ہے، دیکھیے تفسیر القرطبی (۲۱۴/۱۰)۔

(۳) متعدد احادیث وآثار سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں، دیکھیے الادب المفرد (رقم ۴۴)، مصنف عبدالرزاق (۱۶۲/۱۰) ۱۱/ ۱۳۷-۱۳۸، وشعب الایمان للبیہقی ۲۹۲/۱۰۔ المعجم الأوسط للطبرانی، رقم ۴۱۵۹، ورقم ۶۸۵۷، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی، رقم ۳۹۵۔

ماں باپ کو اور دوسرے بڑوں کو چاہیے کہ بچوں کو یہ ادب سکھائیں، لیکن والدین کے لیے ضروری ہے کہ بچوں سے ہی اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کریں، بلکہ بچوں کے حقوق جو ان کے ذمے ہیں ان کو بھی ادا کرنے کی فکر کریں۔

بڑوں کا ادب واحترام:

ایک چیز جس کی معاشرے میں بڑی اہمیت ہے، وہ ہے بڑوں کا ادب واحترام، آج اس کی کمی ہوتی جارہی ہے، رسول اللہ ﷺ اس کی بڑی تاکید کرتے تھے، فرماتے تھے، کہ جو چھوٹوں پر رحم وشفقت نہ کرے، بڑوں کا ادب واحترام نہ کرے، علماء کی عزت نہ کرے ان کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں (۱) یعنی وہ ہمارے طریقے پر نہیں، اس نے ہماری نافرمانی کی۔

اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ بڑوں کے سامنے چھوٹے نہ بولیں۔ رسول اللہ ﷺ اس کی تاکید کرتے تھے (۲)۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کے بچے اس کا بڑا خیال رکھتے تھے وہ اپنے بڑوں کے سامنے معلوم ہوتے ہوئے بھی نہیں بولتے تھے، ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سوال پوچھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بڑے لوگ بول نہیں رہے تھے تو میں نے بھی بولنا مناسب نہیں سمجھا جب کہ مجھے معلوم تھا (۳)۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کم عمر تھا، آپ ﷺ کی حدیثیں مجھے یاد تھیں، مگر بولنے میں یہ چیز رکاوٹ بنتی تھی کہ وہاں مجھ سے بڑے لوگ تھے (۴)۔

---

(۳) دیکھیے ابوداؤد (۴۹۴۳) ترمذی (۱۹۲) والمستدرک (۱/۱۲۱)۔

(۴) دیکھیے بخاری (۶۱۴۲، ۶۱۴۳) ومسلم (۱۶۶۹)۔

(۱) بخاری (۶۱۴۴) ومسلم (۲۸۱۱)۔ (۴) مسلم (۹۶۴)۔

سچائی:

سچ بولنا دینی اور معاشرتی دونوں لحاظ سے ضروری ہے، اسلام میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے، دراصل بچوں کے اندر جھوٹ کی عادت ماں باپ اور گھر کے افراد کے رویے سے پیدا ہوتی ہے، ورنہ اگر بچے کے ساتھ سچائی کا معاملہ کیا جائے تو بچہ لامحالہ سچ بولنے کی عادت پر پرورش پائے گا، ماں بچے کو بہلانے کے لیے بلاتی ہے کہ آؤ فلاں چیز دوں گی، لیکن آنے کے بعد نہیں دیتی، مٹھی باندھے ہوئے باپ کہتا ہے لو یہ ٹافی، مگر اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا، اس طرح کے سلوک سے بچہ جھوٹ کا عادی ہوتا ہے اور جھوٹ کی برائی اس کے دل سے ختم ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ والدین کے ایسے سلوک پر نظر رکھتے تھے۔

عبداللہ بن عامر ایک نوعمر صحابی ہیں، کہتے ہیں ایک دن میری امی نے مجھے بلایا، اس وقت رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، میری ماں نے کہا، ہا، ہا، آؤ تم کو کچھ دیتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: تم نے کیا دینے کا ارادہ کیا تھا؟ اس نے کہا میں کھجور دینا چاہتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اس کو کچھ نہ دیتی تو تم پر جھوٹ لکھا جاتا(۱)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو کسی بچے سے کہے آؤ، یہ لو، پھر اس کو نہ دے تو یہ جھوٹ ہے(۲)۔

بہت سے والدین بچے کو ڈرانے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں اور اس میں کوئی حرج ہی نہیں سمجھتے، اس سے بھی بچے کے اندر جھوٹ کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

بچوں کو اس طرح سمجھائیں کہ سچائی سے دل کے اندر اطمینان ہوتا ہے، اور حقیقی

(۱) ابوداؤد (۴۹۹۱)۔

(۲) مسند احمد، ۲/۴۵۲۔

خوشی حاصل ہوتی ہے اور جھوٹ کی وجہ سے ایک خوف لگا رہتا ہے اور بے اطمینانی ہوتی ہے اور زندگی کا لطف ختم ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ بچوں کے اندر سچائی کی اہمیت، جھوٹ سے نفرت اسی طرح پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے جیسا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کچھ ایسی ہی بات آپ ﷺ سے نقل کرتے ہیں(۱)۔

امانت:

بچوں کے اندر چوری کی عادت بہت پڑتی ہے، اس لیے ان کی امانت کی سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔ ہمارا دین ہر چیز میں امانت پر زور دیتا ہے۔ آج امانت ختم ہوتی جارہی ہے۔ اکثر جھگڑے اسی بنیاد پر ہوتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کی چیز دبالی، فلاں نے فلاں کا مال ہڑپ کیا۔ اس طرح آدمی دین سے بہت دور ہوجاتا ہے اور حرام مال کھانے سے اس کی نمازیں اور عبادتیں اور دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں، جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔

بچوں سے سودا منگوانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب بچہ باقی بچے ہوئے پیسے واپس کرے تو اس سے پورا حساب لیں، اور حساب میں کمی بیشی یا خیانت کا شبہ ہونے پر اس کو ڈانٹا جائے، یا ایسا ہوتا ہے کہ بچے کے ہاتھ سے کوئی کھانے کی چیز پاس پڑوس میں بھیجنے کی ضرورت پڑتی ہے، ہوسکتا ہے کہ بچہ اس میں سے کچھ اٹھا کر منھ میں رکھ لے، اس لیے ان سب باتوں کی نگرانی کرنی چاہیے، تاکہ بچہ خیانت کو کبھی سوچے بھی نہیں اور امانت کی صفت اس کے اندر جڑ پکڑ لے۔

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بچے تھے، کہتے

(۱) دیکھیے مسند احمد ۱/۲۰۰۔

ہیں کہ مجھ میری امی نے انگور کا خوشہ دے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، میں نے پہنچانے سے پہلے اس میں سے کچھ کھالیا۔ جب میں حضور ﷺ کے پاس اس کو لے کر پہنچا تو حضور ﷺ (سمجھ گئے پس آپ ﷺ نے) میرا کان پکڑا اور فرمایا او بے ایمان!(۱)(تم نے خیانت کی)

اس طرح بچوں کے اندر بچپن ہی سے امانت کا شعور اور احساس پیدا کریں، تا کہ بڑے ہو کر خیانت کا تصور بھی وہ نہ کر سکیں۔

حسد اور کینے سے حفاظت:

ایسا بھی بہت ہوتا ہے کہ بچوں میں تنافس (ریس، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ) ایک دوسرے کے خلاف کینہ اور حسد پیدا کرتا ہے، جس کے نتائج بسا اوقات بڑے سنگین ہوتے ہیں، حسد کی بیماری کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کا سکون ختم ہو جاتا ہے اور وہ کبھی اطمینان کی زندگی نہیں گزار سکتا اور اس کی ترقی بھی رک جاتی ہے، ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا ترقی کرے، اس لیے ہر ماں باپ کو چاہیے کہ پہلے دن سے بچے کے ذہن میں یہ بات بٹھالیں کہ عزت وذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، کامیابی اور ناکامی اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، ترقی وتنزل کا مالک اللہ ہے، ہمارا کام محنت کرنا اور کوشش کرنا ہے، پھر ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ کوئی اچھا، تیز اور ذہین بچہ جب پچھڑ جائے تو اس کو بہت زیادہ احساس ہوتا ہے اور یہ بات دوسرے ساتھیوں کے خلاف اس کے دل کے اندر کینہ پیدا کر سکتی ہے۔ ایسے موقوں پر خاص طور پر بچوں کی نگرانی کی ضرورت ہے۔ کبھی ان کو اس طرح سمجھائیں کہ

(۱) عمل الیوم واللیلۃ ابن سنی (رقم ۴۰۱)

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

بچپن ہی سے حسد اور کینے کے نقصانات دل میں بٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بظاہر بڑا دیندار معلوم ہوتا ہے، مگر اس کا دل کسی کے کینے سے بھرا ہوتا ہے اور یوں وہ اپنی آخرت تباہ کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ بچوں کے اندر کسی کا کینہ پیدا نہ ہو، ان کا دل پاک رہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے بچے کی طرح تھے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: بیٹے! اگر ایسا کر سکو کہ دن رات میں کسی بھی وقت تمھارے دل میں کسی کا کینہ نہ ہو، تو ضرور ایسا کرو، پھر فرمایا: بیٹے! یہ میری سنت ہے، میرا طریقہ ہے، اور جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھ سے محبت کی (یعنی میری محبت کی وجہ سے اس نے ایسا کیا) اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔(۱)

کم گوئی:

کم گوئی (یعنی کم بولنا) ایک نہایت اچھی صفت ہے، اسلام میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اکثر مصیبتیں بولنے کے نتیجے میں آتی ہیں، اس لیے کہ جو زیادہ بولے گا وہ غلط بھی بولے گا، زیادہ بولنے کی عادت بہت سے گناہ کرواتی ہے۔ اس میں جھوٹ بھی ہوگا، چغلی اور غیبت بھی ہوگی، کسی کا دل دکھانے والی بات بھی ہوگی، اور کبھی اس میں فحش اور گندی بات بھی ہوگی، اور اکثر ایسا ہوگا کہ اس کی زیادہ باتیں، بے مطلب اور لاحاصل اور فضول ہوں گی؛ اس لیے کہ جو زیادہ بولتا ہے وہ فضول گوئی کا عادی ہو جاتا ہے اور جس

---

(۱) ترمذی (۲۶۷۸)۔

کے اندر فضول بکنے کی عادت پڑ جائے، وہ بڑی لاپروائی کے ساتھ اپنا وقت ضائع کرتا ہے ،اور جو اپنے وقت کی حفاظت نہ کر سکے اور اس کو اہمیت نہ دے وہ دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا؛ اسی لیے قرآن مجید میں فضول بات اور فضول کام کی بہت برائی کی گئی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے مختلف انداز سے زبان کی حفاظت کی اہمیت بیان کی ہے۔آپ ﷺ چاہتے تھے کہ بچپن ہی سے بچے اس حقیقت کو سمجھ لیں اور ان کے اندر اس کی عادت پڑ جائے۔

آپ ﷺ کے نواسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے انتقال کے وقت صرف سات سال کے بچے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ آدمی کے اچھے مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ کم بولے، جہاں مطلب نہ ہو وہاں زبان روک لے۔(۱)

حلال وحرام کی تمیز:

حلال وحرام کی تمیز یعنی حلال اور حرام کے درمیان فرق کرنا اور سمجھنا کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟ یہ ایک مسلمان کے لیے بہت ضروری چیز ہے۔ ہر مسلمان کے لیے کم از کم اتنا دین کا علم حاصل کرنا ضروری اور فرض ہے، جس سے وہ یہ سمجھ سکے کہ کیا حلال اور کیا حرام ہے؟ ایسا نہ ہو کہ کسی حرام چیز کو حلال سمجھ کر وہ کر گزرے یا حلال کو حرام سمجھ کر دور رہے اور محروم رہے۔آج لوگ دینی تعلیم سے اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ وہ حلال وحرام کو نہیں جانتے، اس طرح وہ ایک فرض کو چھوڑ کر بہت بڑے گناہ میں پڑے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ کھانے کمانے میں بھی حلال وحرام کی تمیز نہیں رہی، ”جو ملے جو آئے، لے لو“ کے شیطانی اصول پر لوگ دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں اور جہنم کی آگ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں، کہاں

(۱) مسند احمد (۱/۲۰۱)۔

اس کی پرواکہ معلوم کریں یہ حلال ہے یا حرام! بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حرام معلوم ہونے پر بھی لیتے اور استعمال کرتے ہیں، اس لیے کہ حلال بھی بالکل معلوم ہوتا ہے اور حرام بھی پوری طرح واضح ہوتا ہے، لیکن نفس تاویل پر اکساتا ہے، مگر ہونا یہ چاہیے کہ جہاں شبہ ہو تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے کہ کہیں حرام میں نہ پڑ جائیں۔ دیکھیے اور غور کیجیے کہ کیسے پتے کی حدیث روایت کر رہے ہیں ایک بہت کم عمر صحابی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما (جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بچے تھے، رسول اللہ کی مدینہ ہجرت کے بعد ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ ہجرت کے بعد انصار میں پیدا ہونے والے پہلے بچے تھے، اس طرح حضور ﷺ کے انتقال کے وقت ان کی عمر نو سال یا اس سے کچھ زیادہ تھی) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے (یعنی ہر شخص ان کو سمجھ سکتا ہے، مگر ہاں) ان دونوں کے درمیان بہت سی باتیں ایسی ہیں جو مشتبہ ہیں (یعنی ان میں شک وشبہ ہوتا ہے کہ یہ حلال ہیں یا حرام) اکثر لوگ ان کو نہیں جانتے (یعنی اکثر لوگ ان کو نہیں سمجھ سکتے، ان میں غور وفکر کی ضرورت پڑتی ہے، علماء غور وفکر کر کے حقیقت کو پا لیتے ہیں) مگر جو ان شک وشبہ کی باتوں سے بچ گیا اس نے اپنے دین وآبرو کو بچا لیا اور جو شبہات (شبہ والی باتوں) میں پڑ گیا تو وہ حرام میں پڑ گیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چرواہا (بکریاں) چرا رہا ہو کسی باڑ (گھیرا، چار دیواری) کے ارد گرد، تو خطرہ ہے کہ بکریاں اس باڑ کے اندر چلی جائیں اور چرنے لگیں، سنو! ہر بادشاہ کی ایک باڑ ہوتی ہے، اور سن لو اللہ کی باڑ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں، سنو! جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ ٹھیک ہوگا تو سارا جسم ٹھیک ہوگا اور وہ اگر بگڑ جائے گا تو پورے جسم کا نظام بگڑ جائے گا، سن لو وہ ''دل'' ہے (۱) (۱) بخاری (۵۲) و مسلم (۱۵۹۹)۔

غور کیجیے کہ یہ کسی جامع اور معنی خیز حدیث ہے۔ اپنی زندگی بھی اس کے سانچے میں ڈھالیے اور اپنے بچوں کی تربیت بھی اسی انداز پر کیجیے، جس بچے کو بچپن میں یہ تعلیمات ملیں گی اور اس کے دل میں بیٹھ جائیں گی اور حلال وحرام کا فرق اس طرح اس کے سامنے واضح ہو جائے گا اور شک وشبہ والے کاموں سے بچنے کی اس دل نشین مثال کے ذریعے اس کو تعلیم ملے گی، اور دل کی اصلاح کی ضرورت اس طرح اس کے ذہن نشین کر دی جائے گی وہ بچہ کیا کبھی بھٹک سکتا ہے؟ راہ راست سے ہٹ سکتا ہے؟ حرام کے قریب جا سکتا ہے؟ کسی کا ناحق مال کھا سکتا ہے؟ نفس کے شر میں مبتلا ہو کر الٹی سیدھی تاویل کر کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر سکتا ہے؟ اس کے لیے حیلے بہانے کر سکتا ہے؟ کسی کھلے ہوئے بڑے گناہ کے کبھی قریب جا سکتا ہے؟!! پس ہر ماں باپ کو چاہیے کہ اس طرح کی باتیں بچوں کو بچپن ہی میں سکھائیں اور ان کی گھٹی میں ڈالیں جس طرح رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔

اخلاص:

اخلاص یعنی ہر کام میں نیت خالص رکھنا اور دنیا کے کسی فائدے کو دیکھے بغیر صرف اللہ کے لیے کام کرنا، نہ اس سے عزت مقصود ہو نہ شہرت، نہ دکھاوا اور نہ دنیا کی کوئی چیز۔ اخلاص کی اسلام میں جو اہمیت ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے۔ جتنا زور قرآن وحدیث میں اخلاص پر دیا گیا ہے اتنا کسی اور چیز پر نہیں۔ بہت سے لوگ مال خرچ کرتے ہیں مگر دکھاوے کے لیے، بہت سے لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں یا ان کی عزت کرتے ہیں اس نیت سے کہ وہ ہمارے کام آئیں۔ اخلاص کے بغیر بڑے سے بڑے عمل کی بھی اللہ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، سب ضائع ہو جائے گا، آخرت میں اس کے بدلے کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا، بلکہ الٹے اس پر سخت سے سخت عذاب ہوگا، لیکن اگر اخلاص ہے تو چھوٹے سے

چھوٹا کام بھی جنت میں پہنچا سکتا ہے، اور اللہ کی رضامندی اور خوشی کا سبب بنتا ہے؛ اگر اخلاص نہیں تو بڑے سے بڑے پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کر کے جہنم میں جائے گا، اور اگر اخلاص ہے تو ایک کھجور بلکہ آدھی کھجور اللہ کے راستے میں خرچ کر کے جنت حاصل کرے گا، اگر اخلاص نہیں تو جہاد جیسا عظیم عمل بھی جس میں آدمی اپنا مال خرچ کرتا ہے، خون بہاتا ہے، بلکہ گردن تک کٹاتا ہے، بے کار جائے گا اور یہ عمل جہنم میں لے جائے گا۔ کسی کے دل میں اخلاص کی حقیقت بیٹھ جائے تو اس کا بیڑا پار ہو جائے گا، رسول اللہ ﷺ کوشش کرتے تھے کہ بچوں کے دل میں بہت کم عمری ہی سے یہ بات بیٹھ جائے۔ حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سب سے کم عمر صحابہ میں سے ہیں جن کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی، وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے سب سے زیادہ تم پر جس چیز کا خوف ہے وہ شرکِ اصغر ہے، لوگوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! شرک اصغر کیا چیز ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ ریا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلا دیا جائے گا، کہے گا: جاؤ ان لوگوں کی طرف جن کو دکھانے کے لیے تم دنیا میں کام کرتے تھے، دیکھو ان کے پاس کوئی ثواب ہو تو لو(۱) (میرے پاس تو تمھارے لیے کچھ بھی نہیں)۔

ظاہر ہے کہ اتنا چھوٹا بچہ ایسی گہری بات جس کی حقیقت بھی وہ نہ سمجھ سکے یاد نہیں رکھ سکتا، جب تک کہ خاص طور سے اس کے ذہن میں یہ بات نہ بٹھائی گئی ہو، اور جس کے ذہن میں اتنی کم عمری میں یہ بات بیٹھ جائے گی، کیا اس کے اعمال میں ریا اور دکھاوا ہو سکتا ہے؟!!

(۱) مسند احمد (۵/ ۴۲۸، ۴۲۹)۔

بچے کی صحیح تعلیم وتربیت کرنے والے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی دعا:

اور جو اپنے بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کر کے ان کے نیک بننے کا سبب بنے اس کو رسول اللہ ﷺ نے دعا دی ہے، فرمایا: اللہ اس باپ پر رحم کرے جو اپنی اولاد کے نیک ہونے میں مدد کرے (۱) اور جو اپنی اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت نہ کرے اس نے ان کے ساتھ بہت ظلم کیا، دنیا وآخرت میں وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ بعض اہل علم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ باپ کے بارے میں بچوں سے پوچھنے سے پہلے اولاد کے بارے میں باپ سے سوال کرے گا، جس طرح باپ کا بیٹے پر حق ہوتا ہے، اسی طرح بیٹے کا باپ پر حق ہوتا ہے (۲) اگر اس کی دینی تعلیم وتربیت میں اس نے کوتاہی کی تو اس نے اس کا حق مارا اور اس کے ساتھ بہت برا ظالمانہ معاملہ کیا، جس کا وبال کبھی دنیا میں اس پر پڑتا ہے اور اس کو بہت بُرے دن دیکھنے پڑتے ہیں، اور کبھی تو بچوں سے ایسا جواب سننا پڑتا ہے جو اگرچہ سچا اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے مگر ناقابل تصور اور ناقابل برداشت ہوتا ہے، اور موت سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے نقل کیا ہی کہ ایک شخص نے اپنے بیٹے کو بات نہ ماننے پر برا بھلا کہا، لڑکے نے کہا: ابا جان! آپ نے بچپن میں میرا حق نہیں سمجھا تو میں نے بڑا ہو کر آپ کا حق نہیں سمجھا، آپ نے چھوٹی عمر میں مجھے ضائع کیا تو میں نے آپ کے بڑھاپے میں آپ کو ضائع کیا (۳)۔ پس خدا کے لیے اپنی اولاد کے حقوق سمجھیے اور ان کی دینی تعلیم اور صحیح اسلامی تربیت کی فکر کیجیے، ورنہ دنیا کے وبال اور آخرت کی سزا کے لیے تیار رہیے۔

---

(۱) مصنف ابن أبی شیبہ (۱۳/۸۳)۔

(۲) دیکھیے تحفۃ المودود (ص:۱۸۴)۔

(۳) أیضاً ص:۱۸۵۔

چودھواں باب

بچے کی عبادت کے احکام

بچہ جب تک بالغ نہ ہو وہ کسی عبادت کا مکلّف نہیں، یعنی کوئی عبادت اس پر واجب نہیں ہے، لیکن وہ صحیح طریقہ پر کرے تو ادا ہو جائے گی اور اس کا ثواب والدین کو ملے گا، اور اس کے اندر عبادت کا شوق بھی پیدا ہوگا اور وہ صحیح طریقہ بھی سیکھ لے گا اور بالغ ہونے کے بعد اس کے لیے آسانی ہوگی، ورنہ بالغ ہونے کے بعد پریشانی ہوگی، اور نہ سیکھنے کی وجہ سے غلطی ہوگی تو گناہ ہوگا، اور جب تک اچھی طرح نہ سیکھ لے گناہ ہوتا رہے گا۔

عبادت سے بچے کو روحانی خوشی ہوگی، دین کا شوق پیدا ہوگا، اللہ سے محبت ہوگی، اچھے کام کی طرف طبیعت مائل ہوگی، برے کام سے نفرت ہوگی۔ یہ سب عبادت کے لازمی اثرات ہیں جو بچپن ہی سے پڑنا شروع ہوتے ہیں، جو بچہ عبادت کا بچپن سے عادی ہوتا ہے اور شوق سے کرتا ہے، عموماً اس کی بعد کی زندگی اچھی ہوتی ہے۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ بچپن ہی سے بچوں کو عبادت کی ترغیب دیں، اور عادت ڈلوائیں۔ والدین کے ساتھ بچوں کو بھی عبادتوں کا ثواب ملے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بچے کی نیکیاں اور اچھائیاں اس کے حق میں لکھی جاتی ہیں، مگر اس کی برائیاں نہیں لکھی جاتیں (۱)

بچوں کے لیے مختلف عبادتوں کی تفصیلات میں کچھ فرق ہے جن کو ہم ذیل میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) الاستذکار (۵/۱۰۶)۔

پہلی فصل

بچہ اور نماز

بچے کے لیے نماز کا حکم دینا اور نماز سکھانا:

اسلام میں سب سے پہلی اور سب سے اہم عبادت نماز ہے، اس لیے بچے کے اندر سمجھ اور شعور پیدا ہوتے ہی اس کو نماز کا حکم دینا چاہیے، عموماً سات سال کی عمر میں پورا شعور پیدا ہو جاتا ہے، اسی لیے اس کو سنِ رشد اور سنِ تمیز بھی کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اسی وجہ سے سات سال کی عمر میں بچوں کو نماز کا حکم دینے اور نماز سکھانے کی تاکید کی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی مشہور حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر مارو۔ اور اس عمر میں ان کے بستر الگ کرو(١)۔

حضرت سبرہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بچہ جب سات سال کو پہنچے تو نماز کا حکم دو اور جب دس سال کو پہنچے تو نماز نہ پڑھنے پر مارو(٢)

ان حدیثوں کی رُو سے ہر ماں باپ پر واجب ہے کہ سات سال کی عمر میں بچے کو نماز کے لیے کہیں اور تاکید کریں، اور دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھنے پر ماریں اور سزا دیں۔

ماں باپ نہ ہوں تو دادا یا جو بھی بچے کا شرعاً اور قانوناً ولی ہوگا، اس کے ذمے یہ ضروری ہوگا کہ سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دے اور دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھنے پر

---

(١) ابوداؤد (٤٩٥)، مسند احمد (٢/١٨٠، و٢/١٨٧)۔

(٢) مصنف ابن أبي شيبة (٣/٢٠١)، مسند احمد (٣/٤٠٤) وابوداؤد (٤٩٤) وترمذی (٤٠٧)۔

مارے(۲)۔

اور نماز کا حکم دینے کا مطلب صرف اتنا نہیں ہے کہ نماز کے لیے کہیں، بلکہ یہ سکھانا بھی ضروری ہے کہ نماز کیسے پڑھی جاتی ہے۔ بعض روایتوں میں مُروا (حکم دو) کے بجائے علّموا (سکھاؤ) کے الفاظ ہیں(۲)۔

سات سال کی عمر تو ایک حد ہے نماز کا حکم دینے کی، یعنی سات سال کی عمر ہو جائے اور نماز کا حکم نہ دیں تو ماں باپ پر گناہ ہوگا، ورنہ ہونا تو یہ چاہیے کہ سات سال کی عمر سے پہلے ہی نماز کا حکم دیں اور نماز سکھائیں، چناں چہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ بچہ کب نماز پڑھنا شروع کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب اپنے دائیں بائیں کو پہچان لے (یعنی جب دائیں اور بائیں ہاتھ کے درمیان فرق کر سکے) تو اس کو نماز کا حکم دو(۳)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب بچہ دائیں بائیں کے درمیان فرق پہچان سکے تو اس کو نماز سکھائی جائے(۴)۔

ظاہر ہے کہ چار پانچ سال کا بچہ بھی دائیں بائیں کا فرق سمجھ سکتا ہے، اور بعض تابعین کہتے تھے کہ جب بچے کے دودھ کے دانت گر کے دوسرے دانت آنے لگیں تو اس کو نماز کا حکم دیا جائے(۵) اور یہ پانچ چھ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ اور بعض دوسرے تابعین فرماتے ہیں: جب بچہ بیس گن لے، یعنی ایک سے بیس تک کی گنتی جان لے تو اس کو نماز کا حکم دیا جائے(۶)

---

(۱) دیکھیے المجموع (۱۱/۳)۔

(۲) مثلاً دیکھیے ترمذی محولۂ بالا، صحیح ابن خزیمۃ (۴۹۶/۱ رقم (۱۰۰۱) ومستدرک حاکم (۲۵۸/۱)۔

(۳) ابوداود (۴۹۷) وسنن کبری بیہقی (۸۴/۳)۔

(۴) مصنف ابن أبی شیبۃ ۲۰۲/۳، ۲۰۳، العیال لابن ابی الدنیا (رقم ۳۰۲)۔

(۵) مصنف ابن أبی شیبۃ ۲۰۳/۳ (۶) مصنف ابن أبی شیبۃ ۲۰۳/۳، والعیال (۳۰۳)

ایسی سختی سے بچوں کو نماز کی تاکید کرنی چاہیے کہ اس کی اہمیت اور عظمت ان کے اندر پیدا ہو جائے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کے معاملے میں بچوں پر نظر رکھو، ان کی نگرانی کرو(۱)۔

بچہ نماز پڑھے بغیر سو جائے، یا نہ اٹھے تو اس کو اٹھا کر نماز کے لیے بھیجیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ بچے کو نماز پڑھنے کے لیے اٹھاؤ، خواہ ایک رکعت ہی پڑھ لے(۲)۔

یعنی اٹھ کر پوری نماز نہ سہی، نماز کے لیے کھڑا بھی ہو جائے گا تو مقصد پورا ہو جائے گا، یعنی اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ نماز پڑھے بغیر نہیں سونا چاہیے، اور اگر سو بھی چکا ہو تو اٹھ کر پڑھنا چاہیے، اس سے نماز کی اہمیت بچپن ہی سے اس میں پیدا ہوگی۔

اسی وجہ سے امام زین العابدین بچوں سے کہتے تھے کہ ظہر اور عصر ایک ساتھ پڑھ لو اور مغرب اور عشاء ایک ساتھ پڑھ لو۔ ان سے کوئی کہتا کہ یہ کیسے آپ بچوں سے وقت سے پہلے نماز پڑھنے کے لیے کہتے ہیں؟ تو وہ فرماتے کہ یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ نماز پڑھے بغیر سو جائیں(۳)۔

ہاں البتہ فجر کی نماز کے لیے چھوٹا بچہ اٹھانے پر نہیں اٹھتا تو اصرار نہ کیا جائے اور اس کو تنگ نہ کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک عورت سے گزر ہوا، وہ اپنے بچے کو فجر کی نماز کے لیے اٹھا رہی تھی، اور وہ اٹھ نہیں رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کو

---

(۱) مصنف ابن أبي شيبة ۲۰۴/۳، مصنف عبدالرزاق ۱۲۰/۴ (۱۵۴/۴) قیام رمضان للمروزی (ص:۴۹) المعجم الکبیر للطبرانی (۲۳۶/۹) وسنن کبریٰ بیہقی ۸۴/۳۔

(۲) مصنف ابن أبي شيبة ۲۰۲/۳۔

(۳) مصنف ابن ابي شيبہ (۲۰۴/۳)۔

چھوڑ دو، تنگ نہ کرو، نماز اس کے لیے ضروری نہیں ہے، یہاں تک کہ سمجھ دار ہو جائے (۱)۔

اگر بچہ نماز میں غلطیاں کر رہا ہو اور بہت چھوٹا نہ ہو اور سمجھانے سے سمجھ سکتا ہو تو اس کو سمجھانا چاہیے اور صحیح نماز کی تعلیم دینی چاہیے، بچہ سمجھ کر چھوڑنا نہیں چاہیے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان کا ایک بھتیجا آیا اور اس نے ان کے گھر میں دو رکعت نماز پڑھی، جب سجدے میں گیا تو مٹی پر پھونک ماری (مٹی دور کرنے کے لیے زمین پر پھونک ماری) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس سے کہا: بھتیجے! پھونک مت مارو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے ایک غلام سے جس نے اسی طرح پھونک ماری تھی، یہ کہتے ہوئے سنا ہے: اپنے چہرے کو اللہ کے لیے مٹی لگنے دو (۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیٹے! نماز میں ادھر ادھر مت دیکھو، اس لیے کہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنا تباہی ہے (یعنی اس سے آدمی کا دین برباد ہو جاتا ہے) اگر دیکھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں تو پھر نفل نماز میں، فرض میں نہیں (۳)۔

جس طرح نماز سکھانا ضروری ہے، اسی طرح نماز سے متعلق چیزیں طہارت اور وضو وغیرہ کے احکام سکھانا بھی ضروری ہے۔ بہر حال سات سال سے دس سال کی عمر تک نماز اچھی طرح سکھا دی جائے، تاکہ دس سال کے بعد وہ کوئی غلطی نہ کرے۔

(مسئلہ) اگر کوئی بچہ نماز کے دوران میں بلوغ کی عمر کو پہنچ رہا ہو تو جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اب اس کو نماز پوری کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ بالغ ہو گیا، اور نماز کا

(۱) ایضا ۳/۲۰۲، والعیال (۲۹۶)۔

(۲) مسند احمد ۶/۳۰۱، نیز ۶/۳۲۳، وترمذی (۳۸۱، ۳۸۲)۔

(۳) ترمذی (۵۸۹)۔

اعادہ (دوبارہ پڑھنا) ضروی نہیں مستحب ہے، اس لیے کہ نابالغ ہونے کی حالت میں نماز شروع کی تھی۔

(مسئلہ) اگر بچہ نماز پڑھ کر فارغ ہو جائے اور نماز کا وقت باقی رہے تو اس باقی وقت میں وہ بلوغ کو پہنچ جائے تو اس میں تین قول ہیں، ایک یہ کہ نماز کا اعادہ مستحب ہے، واجب نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نماز کا اعادہ واجب ہے، خواہ تھوڑا وقت باقی ہو یا زیادہ، تیسرا قول یہ ہے کہ بلوغ کے بعد وقت میں اتنی گنجایش ہو کہ پوری نماز پڑھ سکتا ہو، تو اعادہ ضروری ہے، ورنہ ضروری نہیں۔

(مسئلہ) اور اگر جمعہ کے دن نابالغ نے پر جمعہ ضروری نہ ہونے کی وجہ سے ظہر پڑھ لی پھر بلوغ کو پہنچا اور جمعہ پا سکتا ہے تو صحیح قول کے مطابق جمعہ اس کے لیے ضروری نہیں۔(۱)۔

بچہ اور سنت نمازیں:

سنت نمازوں کے لیے بھی بچوں سے کہا جائے اور آہستہ آہستہ اس کی بھی عادت ڈلوائی جائے، تاکہ بالغ ہونے تک سنتوں کے بھی عادی ہو جائیں۔

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو وتر (۲) نماز کی تعلیم دیتے تھے (۳)۔ بلکہ کبھی تہجد کی نماز میں بھی بچوں کو شریک کریں تو اور اچھا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنا واقعہ سناتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے اپنی خالہ میمونہ کے یہاں جو رسول اللہ ﷺ کی زوجہ تھیں رات گزاری، رسو

(۱) یہ مسائل المجموع سے ماخوذ ہیں (۱۲/۳)

(۲) وتر اکثر فقہاء کے نزدیک سنت ہے اور احناف کے نزدیک واجب۔

(۳) دیکھیے مسند احمد (۱/۱۹۹، ۱/۲۰۱) ابوداود (۱۴۲۵) ترمذی (۴۶۴)۔

ل اللہ ﷺ تہجد کی نماز کے لیے اٹھے تو میں بھی اٹھا اور آپ نے نیت باندھی تو میں نے بھی نیت باندھ لی اور آپ کی بائیں طرف کھڑا ہوا، آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے سے اپنی دائیں طرف کھڑا کیا۔ پھر انھوں نے قصہ تفصیل سے سنایا جس کی یہاں ہمیں ضرورت نہیں ہے (۱)۔

یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں: پہلی چیز یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ابھی بچے تھے، مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کو تہجد کی نماز میں شریک کیا تاکہ وہ بھی نماز سیکھیں اور تہجد کی عادت ڈالیں۔

دوسری چیز یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بائیں طرف کھڑے ہوئے، جو صحیح طریقے کے خلاف تھا (اس لیے کہ مقتدی ایک ہو تو امام کے دائیں کھڑا ہونا چاہیے) مگر رسول اللہ ﷺ نے بچہ سمجھ کر رہنے نہیں دیا، بلکہ اصلاح کی اور پیچھے سے لائے، تاکہ نمازی کے آگے سے گزرنا بھی نہ ہو، یہ اس لیے کیا تاکہ نماز پڑھنے کے ساتھ نماز کے یہ احکام بھی سیکھے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو استخارہ کی تعلیم دی (۲)۔

بچوں کی مسجد حاضری اور ان کی جماعت کا حکم:

متعدد حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بچے نماز کے لے مسجد آتے تھے اور جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ (۳)۔

(۱) بخاری (۱۱۷) اس کے علاوہ تقریباً بیس جگہوں پر امام بخاری نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے، ومسلم (۷۶۳)۔

(۲) عمل الیوم واللیلۃ لابن سنی (۵۹۸) استخارہ یعنی خیر طلب کرنا، جب کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو اور دل میں اطمینان نہ ہو تو اس موقع پر دو رکعت نماز اور مخصوص دعا کی تعلیم دی گئی ہے، اس کو صلاۃ الاستخارۃ (خیر طلب کرنے کی نماز) کہتے ہیں ۔یہاں حدیث میں نماز کا ذکر نہیں، صرف استخارہ کا ذکر ہے، اور اس کی سند ضعیف ہے۔ ==

اور وہ حدیثیں بھی اس پر دلالت کرتی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے اماموں کو نماز مختصر پڑھانے کی تاکید کی اس کی وجہ یہ بیان کی ہے ارشاد فرمایا ہے: اس لیے کہ ان میں بوڑھے ہوتے ہیں بچے ہوتے ہیں، کمزور، بیمار اور ضرورت مند لوگ ہوتے ہیں (۱)۔

صحابہ اپنے بچوں کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی بڑی تاکید کرتے تھے۔ مشہور تابعی مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے ایک صحابی کو اور میرے خیال میں وہ بدری صحابی تھے، اپنے بیٹے سے یہ کہتے ہوئے سنا: تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ انھوں نے پوچھا: تکبیرۂ اولی بھی تمھیں ملی تھی؟ اس نے کہا: نہیں۔ انھوں نے کہا: کالی آنکھوں والی سو خوبصورت اونٹوں سے زیادہ فائدے کی چیز تم نے ضائع کی (۲)۔

اسی وجہ سے امام شافعی وغیرہ دوسرے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ بچے کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دینے کے ساتھ مسجد میں حاضر ہونے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے، اور اس کی تاکید کی جائے تاکہ بچپن ہی سے مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی عادت پڑے (۳)۔

لیکن اگر بچے بہت چھوٹے ہوں جنھیں پیشاب پاخانے کا ہوش نہ ہو یا کھیل کر مسجد کی بے ادبی کرتے ہوں یا بہت شور کرتے ہوں جن کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کو

== (۳) امام بخاری نے متعدد حدیثوں سے اس پر استدلال کیا ہے۔ انھوں نے کتاب الاذان میں ایک باب قائم کیا ہے، باب وضوء الصبیان ومتی یجب علیهم الغسل والطهور، وحضورهم الجماعة والعیدین والجنائز وصفوفهم۔ اس کے تحت کئی حدیثیں ذکر کی ہیں۔ امام محمد بن نصر مروزی نے اس کی صراحت کی ہے۔ (قیام رمضان، ص: ۲۸)۔

(۱) دیکھیے مسلم (۴۶۷) واحمد (۲/ ۲۵۶ و ۲/ ۳۹۲ و ۲/ ۵۳۷ و ۴/ ۲۱ و ۴/ ۲۱۸) وترمذی (۲۳۶) وابن ماجہ (۹۸۷)۔

(۲) مصنف عبدالرزاق ۱/ ۳۹۱ (۱/ ۵۲۸-۵۲۹)۔

(۳) دیکھیے المجموع (۳/ ۱۱) وحاشیۃ الروض المربع (۱/ ۲۱۷)۔

تکلیف ہوتی ہو تو ایسے بچوں کو مسجد میں نہیں لانا چاہیے۔ اسی وجہ سے امام مالک سے جب پوچھا گیا کہ کوئی شخص اپنے بچے کو مسجد میں لاتا ہے تو کیا یہ پسندیدہ ہے؟ امام مالک نے جواب دیا۔ اگر بچہ مسجد کا ادب جانتا ہو اور کھیلتا نہ ہو تب تو کوئی حرج نہیں اور اگر چھوٹا ہو جو کہیں بیٹھتا نہ ہو اور کھیلتا رہتا ہو تو میں اس کو پسند نہیں کرتا۔

حدیث وفقہ کے مشہور امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں: اگر بچہ سات سال کو نہ پہنچا ہو اور مسجد سے روک دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جو بچہ سات سال کی عمر کو پہنچ چکا ہو اس کو مسجد سے نکالنا جائز نہیں؛ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے نماز کا حکم دیا ہے۔ اور نماز کے علاوہ اوقات میں بچوں کو مسجد سے دور رکھنا سنت ہے خواہ سات سال کے ہوں یا اس سے چھوٹے یا بڑے ہوں؛ اس لیے کہ ان کے شور وشغب کرنے اور کھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے، لیکن اگر نماز کے لیے آئیں تو منع نہیں کرنا چاہیے(۱)۔

امام ابن عبدالبر لکھتے ہیں جب بچہ نماز کا شعور رکھتا ہو تو جماعت میں شریک ہو جائے اور صف میں شامل ہو جائے جب کہ وہ مسجد میں کھیلتا نہ ہو اور اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔(۲)۔

اس لیے بہت چھوٹے بچوں کو مسجد میں لا کر دوسروں کی نماز خراب نہیں کرنی چاہیے، اسی وجہ سے بعض علماء نے مسجد میں بچوں کی تعلیم کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ اس سے مسجد کا ادب واحترام اور اس کی عظمت باقی نہیں رہتی۔ امام ابن راہویہ کے مذکورہ بالا قول سے بھی اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہ کی بھی یہی رائے تھی۔ اگر بچوں کی تعلیم کا مسجد میں انتظام کرنا ہو تو مسجد کے پورے ادب واحترام کے ساتھ مسجد میں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

---

(۱) دیکھیے قیام رمضان للمروزی (ص:۲۹)۔

(۲) التمہید (۱/۲۶۹)۔

جمعہ اور عیدین میں شرکت:

بچے پر جمعہ کی نماز واجب نہیں ہے۔ حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کی نماز جماعت کے ساتھ فرض و واجب ہے ہر مسلمان پر سوائے چار کے: غلام، عورت، بچہ اور مریض (۱)۔

یعنی جس طرح بچے کو سات سال کی عمر سے نماز اور مسجد کی جماعت کا حکم دیا جاتا ہے اس طرح جمعہ کی تاکید ان کے حق میں نہیں ہے۔ وہ اگر گھروں ہی میں عورتوں کی طرح ظہر کی نماز پڑھ لیں تو کافی ہے؛ مگر جمعہ کی نماز میں ان کو شریک کرنا چاہیے۔ ہر شخص اس کے فوائد محسوس کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کی بڑی جماعت کا اس کے دل پر اثر پڑے گا، اور اسلام کی عظمت اس کے دل میں بیٹھ جائے گی، اور خطبہ سے پہلے یا بعد اگر سمجھنے والی زبان میں تقریر ہوتی ہو تو وہ اس کا اثر لے گا، اور اس کی اندرونی دنیا اس سے متاثر ہوگی، جس کا اثر اس کے ظاہری سلوک اور عمل سے نمایاں ہوگا، اگر باپ کے ساتھ جاتا ہے تو اس کے دوست واحباب سے متعارف ہوگا اور باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کی حدیث میں تاکید آتی ہے (۲)۔ اور اگر بچہ سمجھ دار ہے تو اس سے اور بھی دینی، اجتماعی اور اخلاقی فائدے حاصل کر سکتا ہے؛ اس لیے بچوں کو اس سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔

اور عیدین میں یہ فوائد اس سے زیادہ حاصل ہوتے ہیں، اس لیے عیدین کی نمازوں میں ان کو ضرور شریک کرنا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ اسی وجہ سے اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ

---

(۱) ابوداود (۱۰۶۷) والمعجم الکبیر للطبرانی (۸/۳۲۱-۳۲۲) وسنن الدارقطنی (رقم:۱۵۶۱) ومستدرک الحاکم (۱/۲۸۸) وسنن البیہقی ۳/۲۲۶ (۳/۱۷۲)۔

(۲) دیکھیے مسلم (۲۵۵۲) اس سے اس کو اس کے مواقع ملیں گے۔

عیدین میں گھر کے بڑوں بچوں سب کو لے کر نکلتے تھے، چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عیدین میں فضل بن عباس، عباس، علی، جعفر، حسن، حسین، اسامہ بن زید، زید بن حارثہ، ایمن بن اُم اُیمن کو لے کر بلند آواز سے لا اِلٰہ اِلا اللہ اور اللہ اُکبر پڑھتے ہوئے نکلتے تھے۔(۱)۔

ان میں عبداللہ بن عباس، حسن، حسین، اسامہ بن زید سب بچے تھے۔ اور خود حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عید کی نماز میں شریک ہوتے تھے۔(۲)۔

لیکن اتنے چھوٹے بچے جن کو پیشاب پاخانے کی تمیز نہ ہو، یا جو بلا وجہ روتے ہوں، یا مسجد اور نماز کے آداب سے بالکل ہی ناواقف ہوں، اس وجہ سے شور ہنگامہ کرتے ہو، ایسے بچوں کو احتیاط کے ساتھ لانا چاہیے، اور احتیاط مشکل ہے تو نہیں لانا چاہیے، ورنہ دوسروں کی نمازیں خراب ہوں گی۔

بچوں کی صف بندی:

بچوں کو بڑوں کی صف میں ان کے ساتھ کھڑا نہ کیا جائے، بلکہ پیچھے کھڑا کیا جائے، اگر صف میں جگہ خالی ہو تب بھی چھوٹے بچوں کو ساتھ نہ کھڑا کریں، بلکہ الگ صف میں بڑوں کے پیچھے کھڑا کریں۔ اور اگر عورتیں بھی جماعت میں شریک ہیں تو بچوں کے پیچھے الگ صف میں کھڑی ہوں گی۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کیا اور کہا میں تم کو رسول اللہ ﷺ کی نماز سکھاتا ہوں۔ پھر انھوں نے صف بندی کروائی، پہلے بڑوں کو رکھا، پھر ان کے پیچھے بچوں کی صف بنوائی اور ان کے پیچھے

(۱) صحیح ابن خزیمہ (۱/ ۶۹۵-۶۹۶، رقم: ۱۴۳۱)۔

(۲) دیکھیے صحیح بخاری (۹۶۲، ۹۶۷ وغیرہ)۔

عورتوں کو کھڑا کیا(۱)۔

راشد بن سعد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں کو پہلی صف میں کھڑا کرنے سے منع کیا ہے۔(۲)۔

صحابہ وتابعین کا یہ معمول تھا کہ جب وہ بچوں کو بڑوں کی صف میں کھڑا دیکھتے تو ان کو وہاں سے نکال کر پیچھے بچوں کی صف میں کھڑا کر دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی بچے کو صف میں دیکھتے تو نکال دیتے تھے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عکیم کے باری میں مروی ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بچوں کی صف الگ کرتے تھے۔

مشہور راوی حدیث یزید بن صہیب (جو یزید الفقیر کے نام سے مشہور ہیں) کہتے ہیں کہ زر بن حبش اور ابو وائل (۳)۔ جب ہم بچوں کو صف میں دیکھتے تو وہاں سے نکال دیتے تھے(۴)۔ یعنی وہاں سے ہٹا کر پیچھے بچوں کی صف میں کھڑا کرتے تھے۔

مشہور محدث وفقیہ حضرت سفیان ثوری جب کسی لڑکے کو پہلی صف میں دیکھتے تو

---

(۱) مسند احمد (۵/۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴) وابو داؤد (۶۷۷) والمعجم الکبیر (۳/ ۲۸۱) والسنن الکبری للبیہقی ۳/ ۱۳۸ (۳/ ۱۹۷) اگر صرف بچے اور عورتیں ہوں تو پہلی صف میں بچے اور ان کے پیچھے عورتیں کھڑی ہوں گی، جیسا کہ حضرت انس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے (دیکھیے موطأ، کتاب قصر الصلاۃ فی السفر، باب جامع سبحۃ الضحی، رقم:۳۱، ص:۱۳۱۔ والبخاری (۳۸ وغیرہ) ومسلم (۶۵۸)۔

(۲) قیام رمضان للمروزی (ص:۲۹، رقم:۲۵)۔ یہ مرسل حدیث ہے نیز اس کی سند میں ایک راوی سیئ الحفظ ہے

(۳) دونوں کا شمار جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے، اور دونوں مخضرمین میں سے ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اسلام کی حالت میں موجود تھے، بلکہ زمانہ جاہلیت میں یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے دنیا میں موجود تھے، مگر حضور ﷺ کو دیکھنے اور آپ ﷺ سے ملنے کا موقع نہیں ملا، اور یزید الفقیر بھی تابعی ہیں۔

(۴) یہ تمام آثار ابن أبی شیبہ نے مصنف (۳/ ۳۷۹-۳۸۰) میں ذکر کیے ہیں، نیز دیکھیے قیام رمضان للمروزی (ص:۲۹)۔

پوچھتے: کیا تم بالغ ہو چکے ہو؟ جب وہ کہتا: نہیں؟ تو اس سے کہتے: پیچھے آ جاؤ(۱)۔

اگر مسجد میں نمازی نہیں اور نماز شروع ہو رہی ہو، دو چار بڑوں کے علاوہ سب بچے ہوں، تو اگر بچے بہت چھوٹے ہیں تو ان کو پہلی صف میں کھڑا نہ کیا جائے اگر بچے بڑے یعنی قریب البلوغ ہیں تو اس صورت میں ان کو بڑوں کے ساتھ پہلی صف میں کھڑا کرنے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح اگر مسجد میں نمازی ہی کم ہوں اور آنے کی امید ہی نہ ہو اس صورت میں بھی ایسے سمجھ دار بڑے بچوں کو پہلی صف میں کھڑا کرنے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

لیکن بچے اگر بڑوں کے ساتھ صف میں کھڑے ہو جائیں تو بڑوں کی نماز پر اثر نہیں پڑے گا، وہ صحیح ہوگی (۲)۔

بچوں کی امامت:

بچے کی امامت کے صحیح ہونے کے سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، بچہ اگر عقل اور سمجھ رکھتا ہے اور نماز اچھی طرح پڑھتا ہے، اور قرآن کے ساتھ ساتھ ضروری مسائل بھی جانتا ہے تو اس کی امامت امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور اور ابن منذر کا بھی یہی مسلک ہے، تابعین میں حسن بصری بھی اسی کے قائل ہیں، ان کی دلیل حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اپنی قوم کی امامت کرتے تھے جب کہ ان کی عمر صرف چھ یا سات

---

(۱) حلیۃ الأولیاء (۱۵/۷)۔

(۲) جیسا کہ حضرت ابن عباس کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیے بخاری (۸۶۱) بعض حنابلہ نے کہا ہے کہ اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی، حافظ ابن حجر نے ان کا رد کیا ہے۔ (دیکھیے فتح الباری ۱۰۸/۳)۔

سال کی تھی (۱)۔اور یہ بھی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: یؤم القوم أقرؤهم لکتاب الله۔ یعنی لوگوں کی امامت وہ کرے گا جو ان میں سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو، تو اس سے معلوم ہوا کہ اگر بچہ بھی قرآن زیادہ جانتا ہو تو وہ نماز پڑھا سکتا ہے (۱)۔

متعدد تابعین: عطاء، شعبی، مجاہد اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی نقل کیا جاتا ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں، فرض نماز کی امامت نہ کرے، مگر یہ کہ اس کے علاوہ کسی کو قرآن یاد نہ ہو تب وہ نابالغ جو قریب البلوغ ہے نماز پڑھا سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا کہنا ہے کہ نفل میں بچے کی امامت صحیح ہے، فرض میں نہیں۔ داؤد ظاہری فرماتے ہیں کہ نہ فرض میں صحیح ہے نہ نفل میں، امام احمد کے نزدیک بھی فرض میں بچے کی امامت صحیح نہیں ہے، اور نفل کے سلسلے میں ان کے دونوں قول منقول ہیں، لیکن حنبلی مسلک میں زیادہ صحیح اس کو قرار دیا گیا ہے کہ نفل میں بھی صحیح نہیں ہے۔

جو لوگ صحیح نہیں مانتے وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ حدیث میں بچے کو مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے (۲)۔ یعنی اس کی بات اور کام کا اعتبار نہیں اور اس لیے بھی کہ بچہ ہے، اطمینان نہیں ہوتا کہ کہیں غلطی نہ کردے (۳)۔

بہر حال، اگر بڑا قرآن جاننے والا موجود ہو تو نابالغ کو امامت کے لیے نہیں بڑھانا چاہیے۔

(۱) پوری روایت کے لیے دیکھیے بخاری (۴۳۰۲)۔

(۲) دیکھیے قیام رمضان، ص: ۲۸۔

(۳) دیکھیے ابوداود (۴۳۹۸، ۴۴۰۳) وابن ماجہ (۲۰۴۲)۔

(۴) ان اقوال ومسالک کی تفصیل کے لیے دیکھیے المجموع (۴/۱۰۳-۱۰۴) والمغنی (۳/۷۰-۷۱)، نیز مصنف ابن أبی شیبۃ (۳/۲۰۶)۔

فصل دوم

بچے کا روزہ

نماز کی طرح روزہ بھی ایک شرعی فریضہ ہے، اس لیے بالغ ہونے سے پہلے اس کی عادت ڈلوانے چاہیے، لیکن دونوں میں فرق ہے، نماز کا تعلق عقل اور سمجھ سے ہے، اس لیے سن رشد کو پہنچتے ہی اس کا حکم دیا جاتا ہے۔ روزے کا تعلق برداشت اور طاقت سے ہے، پس جب بھوک برداشت کر سکتا ہو تو اس سے روزہ رکھوانا چاہیے، خواہ عمر بہت کم ہو، لیکن بچہ بہت چھوٹا ہے بھوک سے پریشان ہو رہا ہے تو روزہ رکھوا کر اس پر زیادتی نہیں کرنا چاہیے، البتہ عادت ضرور ڈلوانی چاہیے۔ مشہور تابعی حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اس وقت نماز کا حکم دیتے تھے جب ان کے اندر سمجھ پیدا ہو جاتی تھی اور روزے کا حکم اس وقت دیتے تھے جب وہ روزہ رکھ سکتے تھے (۱) جمہور کے نزدیک نماز کی طرح روزہ بھی بلوغ سے پہلے اس پر واجب نہیں ہے، لیکن جمہور طاقت رکھنے کی صورت میں بچے کے لیے روزہ مستحب سمجھتے ہیں، تاکہ مشق ہو جائے، فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز کی طرح سات سال کی عمر میں روزے کا حکم دیا جائے گا اور دس سال کی عمر میں روزہ نہ رکھنے پر مارا جائے گا، عام فقہاء کا یہی قول ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ دس سال کی عمر میں روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے گا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں (۲) کہ اگر ناغہ کیے بغیر مسلسل

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبۃ ۳/۲۰۶، مصنف عبدالرزاق ۴/۱۱۹ (۴/۱۵۳)۔

(۲) عبدالرزاق نے ایک مرفوع روایت بھی اس طرح کی نقل کی ہے مگر اس میں ضعف ہے (مصنف عبدالرزاق ۴/۱۲۰ (۴/۱۵۴-۱۵۵)۔

تین دن روزے رکھ سکتا ہو اور اس کی کمزوری ان روزوں میں ظاہر نہ ہو تو روزے کے لیے کہا جائے گا۔(۱)

صحابہ اپنے بچوں سے روزے رکھواتے تھے۔(۲)

بچے جب بھوک سے رونے لگیں تو جب تک بھوک سے نڈھال اور بہت زیادہ بے تاب نہ ہوں ان کا روزہ نہ تڑوایا جائے، بلکہ انھیں افطار تک کھلونوں سے بہلایا جائے، جیسا کہ صحابہ کرتے تھے، حضرت رُبیِّع بنت معوذ رضی اللہ عنہما کہتی ہیں کہ ایک دفعہ یوم عاشورا (دس محرم) کی صبح کو رسول اللہ ﷺ نے انصار کے دیہاتوں میں (جو مدینہ کے آس پاس تھے) پیغام بھیجا کہ جس نے صبح کچھ کھایا ہو تو وہ پورا دن اسی طرح گزارے کچھ نہ کھائے، اور جس نے روزہ رکھا ہو وہ روزہ پورا کرے، وہ کہتی ہیں کہ ہم اس کے بعد عاشورا کا روزہ خود بھی رکھتے تھے اور اپنے چھوٹے بچوں کو بھی رکھواتے تھے، اور ان کے لیے رنگین روئی کے کھلونے بنواتے تھے، جب کوئی بچہ کھانا مانگ کر روتا تو ہم اس کو کھلونا دیتے، یہاں تک افطار کا وقت ہو جاتا، وہ کھلونے سے بہلتے رہتے یہاں تک کہ روزہ پورا کر لیتے (۳)۔

ایک روایت میں ہے کہ ان کو لے کر مسجد جاتے، روئی کے کھلونے تیار رکھتے، جب کوئی بچہ روتا تو کھلونا دیتے یہاں تک کہ افطار کا وقت ہو جاتا (۴)۔

بچہ اور سنت روزے:

اس حدیث سے مزید ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ سنت روزے بھی بچوں سے رکھوائے جائیں، تاکہ ان کی بھی ان کو عادت پڑے۔

بچوں کے لیے روزے کا رسول اللہ ﷺ کو کتنا اہتمام تھا، وہ اس حدیث سے

(۱) فتح الباری ۵/ ۳۶۵۔۳۶۶۔
(۲) دیکھیے السنن الکبری للبیہقی ۸/ ۵۵۷ (۸/ ۳۲۱)۔
(۳) بخاری (۱۹۶۰) ومسلم (۱۱۳۶)۔
(۴) صحیح ابن خزیمہ رقم ۲۰۸۸۔

معلوم ہوتا ہے جو حضرت رزینہ رضی اللہ عنہا نے (جو رسول اللہ ﷺ کی خادمہ تھیں) روایت کیا ہے۔ وہ عاشورا کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس دن کی بہت تعظیم کرتے تھے، اپنے (اپنے خاندان کے) اور فاطمہ کے دودھ پیتے بچوں کو بلوا کر ان کے منھوں میں اپنا لعاب ڈالتے اور ان کی ماؤں سے فرماتے کہ رات تک (یعنی افطار تک) دودھ نہ پلائیں(۱)۔

(۱) صحیح ابن خزیمہ رقم ۲۰۸۹

فصل سوم

بچے کی زکاۃ

بچے کا اگر مال ہے تو اس پر زکاۃ واجب ہے، اور ولی ذمے دار ہے، خواہ بچہ یتیم ہو یا نہ ہو، جمہور کا یہی مذہب ہے، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، حضرت جابر، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے، تابعین میں ابن سیرین، ابن زید، عطاء، طاؤس، مجاہد اور ربیعہ الرای وغیرہ سے بھی یہی بات نقل کی گئی ہے، ائمہ فقہ میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد، ابوعبید، اسحاق بن راہویہ، ابوثور، سفیان ثوری وغیرہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

ان حضرات کی دلیل ترمذی کی وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کی کفالت میں کوئی ایسا یتیم ہو جس کے پاس مال ہو تو اس کو چاہیے کہ اس مال میں وہ تجارت کرے، اور اس کو یوں ہی نہ چھوڑے کہ زکاۃ ادا کرتے کرتے ختم ہو جائے (۱)۔

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے، لیکن صحابہ کے دوسرے صحیح آثار سے اس کی تائید ہوتی ہے، اور یہ بھی دلیل ہے کہ بچہ جب فقیر اور محتاج ہے تو اس کو زکاۃ دی جائے گی، اسی طرح جب مال دار ہے تو اس کی طرف سے زکاۃ ادا بھی کی جانی چاہیے، جب وہ لے سکتا ہے تو دینا بھی چاہیے، پھر یہ کہ زکاۃ کے وجوب کے دلائل عام ہیں یعنی مسلمان ہو، آزاد ہو، پورا مالک ہو (یعنی اس پر کسی کا قرض واجب نہ ہو) ان شرطوں کے ساتھ نصاب والے پر

(۱) ترمذی (٦٤١)۔

سال پورا ہونے کی صورت میں زکاۃ فرض قرار دی گئی ہے، بڑے اور چھوٹے میں فرق نہیں کیا گیا؛ اس لیے اکثر علماء نے یہ بات اختیار کی ہے اور کسی صحابی سے اس کے خلاف قول ثابت نہیں ہے۔(۱)

بعض تابعین کے نزدیک بچے کے کسی مال پر زکاۃ واجب نہیں ہے، یہ قول سعید بن مسیّب، سعید بن جبیر، حسن بصری اور ابراہیم نخعی کا ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ بچہ ابھی مکلّف نہیں ہے، تو جس طرح نماز اور روزہ اس پر فرض نہیں، اسی طرح زکاۃ بھی اس پر واجب نہیں۔ اور یہ کہ زکاۃ میں نیت کی ضرورت ہے اور بچے کی نیت کا اعتبار نہیں (۲)۔

مگر نماز روزے اور زکاۃ میں فرق کیا گیا ہے اس لیے کہ نماز اور روزے کا تعلق بدن اور اس کی طاقت سے ہے، زکاۃ میں ایسی بات نہیں، ولی اس کی طرف سے نیت کرے گا۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی بچے کے عام مال میں زکاۃ نہیں ہے، مگر بچے کا کھیت ہے یا باغ ہے تو اس میں بچے پر زکاۃ واجب ہے جیسے بڑوں پر واجب ہے، اس لیے کہ حدیث میں مطلق یہ بات آئی ہے کہ بارش کے پانی سے جس زمین کی سینچائی ہوئی ہے تو اس پر دسواں حصہ زکاۃ ہے اور جس زمین کی سینچائی رہٹ سے ہوئی ہے تو اس پر بیسواں حصہ زکاۃ ہے(۳)۔

(۱) اس کے وجوب کے مزید دلائل کے لیے دیکھیے المجموع (۵/۲۱۵-۲۱۷) والمغنی (۴/۶۹-۷۱) تلخیص الحبیر (۲/۱۵۷-۱۵۹) نیز تحفۃ الأحوذی ۳/۳۳۷-۳۴۱۔

(۲) المجموع (۵/۲۱۷)۔

(۳) بدائع الصنائع (۲/۱۷۳) اور بچے کے عام مال میں زکاۃ واجب نہ ہونے کے احناف کے دلائل کے لیے دیکھیے بدائع ۲/۷۹-۸۱)۔

بچے کا اکاؤنٹ اور اس کی زکاۃ کا حکم:

بچے کے نام پر جو اکاؤنٹ کھلوایا جائے، اگر کھلوانے والے نے خواہ ماں باپ ہوں یا کوئی اور، اگر اس نیت سے کھلوایا ہے کہ یہ پیسہ بچے کے لیے ہے تو یہ مال بچے کا ہوگا، اس پر مستقل زکاۃ واجب ہوگی۔ لیکن اگر کھلوانے والے کی نیت یہ ہو کہ اسی کے لیے پیسے بچے کے نام سے جمع ہوں اور اس کے اپنے نام کے اکاؤنٹ میں زیادہ پیسے معلوم نہ ہوں، یا زکاۃ سے بچنے کے لیے ایسا کرے کہ اگر یہ پیسے ایک اسی کے اکاؤنٹ میں جمع ہوں گے تو زکاۃ کے نصاب کو پہنچ جائیں گے، اور الگ الگ ہوں گے، تو نصاب مکمل نہیں ہوگا، ان دونوں صورتوں میں اکاؤنٹ کھلوانے والے کے مال میں اس بچے کے اوکاونٹ کے پیسے کو ملا کر اکٹھی زکاۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ وہ درحقیقت ایک ہی کا پیسہ ہے۔ اس مسئلے کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ زکاۃ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں لا یجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع (۱)۔ یعنی الگ الگ مال کو ملایا نہیں جائے گا اور نہ اکٹھے مال کو الگ الگ کیا جائے گا۔

بچہ کا صدقۂ فطر:

صدقۂ فطر ہر مسلمان پر واجب ہے، غلام ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عورت ہو، بڑا ہو، چھوٹا ہو (۲)۔

بچے کی طرف سے ادائیگی کی ذمے داری ولی پر ہے، اور بچہ کا مال ہے تو اسی کے مال میں واجب ہے، اور اگر مال نہیں ہے تو جس کے ذمے بچے کا خرچ ہے اس پر واجب ہے، یہ جمہور کا مسلک ہے۔ امام محمد کا کہنا ہے کہ باپ پر واجب ہے، باپ نہیں ہے تو اس پر

(۱) مسند احمد (۴/۳۱۵) ابوداؤد (۱۵۸۰، ۱۵۷۹) نسائی (۲۴۵۹) ابن ماجہ (۱۸۰۱)۔

(۲) بخاری (۱۵۰۳)، مسلم (۹۸۴)۔

کچھ واجب نہیں (۱)۔

اس کا وقت چوں کہ شروع ہوتا ہے رمضان کے آخری دن کا سورج غروب ہونے سے اور دوسرے لفظوں میں عید کی رات کے شروع ہونے سے، تو جو بچہ وقت شروع ہوتے وقت موجود ہو اس کی طرف سے واجب ہے، رمضان کے آخری دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے مر جائے تو اس پر واجب نہیں، اسی طرح جو بچہ عید کی رات یعنی سورج غروب ہونے کے بعد پیدا ہو جائے اس پر بھی نہیں۔

جو بچہ پیٹ میں ہو اس کی طرف سے واجب نہیں اس پر اجماع ہے، لیکن امام احمد پیٹ کے بچے کی طرف سے ادا کرنے کو مستحب سمجھتے تھے، اور بعض حنابلہ نے امام احمد کا ایک قول واجب ہونے کا بھی نقل کیا ہے، ابن حزم کا بھی یہی قول ہے، لیکن وہ یہ قید لگاتے ہیں کہ حمل پر ۱۲۰ دن گزر چکے ہوں۔ لیکن ان پر اشکال کیا گیا ہے کہ اس کو بچہ نہیں کہتے۔ اس لیے اس پر واجب نہیں (۲)۔

(مسئلہ) لڑکی بالغ ہے مگر ابھی شادی نہیں ہوئی یا شوہر کا انتقال ہو چکا ہے یا طلاق ہو چکی ہے تو جمہور کے نزدیک اس کا فطرہ اس کے ولی پر واجب ہے، مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک خود اس عورت پر واجب ہے (۱) دیکھیے المجموع ۶/، الشرح الصغیر ۱/۶۷۴، ردالمحتار ۲/۳۱۴ والبحر الرائق (۲/۲۴۹)۔

(مسئلہ) بچے کا مال ہوتے ہوئے باپ یا ولی اپنے مال سے ادا کرے تو فطرہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا، یا کوئی کسی کی طرف سے ادا کرے تو ادا ہو جائے گا۔

---

(۱) فتح الباری ۴/۳۶۹۔

(۲) فتح الباری (۴/۳۶۹-۳۷۰)۔

چوتھی فصل

بچے کا حج

اس پر اجماع ہے (تمام علماء کا اتفاق ہے) کہ بچے پر حج فرض نہیں ہے (۱)۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ بچہ اگر حج کرے تو فرض حج اس پر سے ساقط نہیں ہوگا، بلکہ بالغ ہونے کے بعد استطاعت کی صورت میں حج کرنا ضروری ہوگا، لیکن اس کا یہ حج صحیح ہوگا، اور حج کرانے والے کو اجر ملے گا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے اپنے ایک بچے کو اٹھا کر پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اس کا حج ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا جی ہاں، اور تمھیں اجر ملے گا (۲)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی بچہ حج کرے پھر بالغ ہو جائے تو اس پر دوسرا حج ضروری ہے (۳)۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب بچہ حج کرے تو یہ اس کا حج ہو جائے گا یہاں تک جب عقل آجائے یعنی بالغ ہو جائے تو اس پر دوسرا حج ہے (۴)۔

بچے کا احرام:

اور بچہ اگر سن تمیز کو پہنچ چکا ہے تو ولی کی اجازت سے اس کا خود احرام باندھنا (حج کی نیت کرنا) صحیح ہے، اگر ولی کی اجازت کے بغیر احرام باندھے تو دونوں قول ہیں،

(۱) اس کو زکاۃ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا (کہ مال ہونے پر اکثر علماء کے نزدیک بچے پر زکاۃ فرض ہے) اس لیے کہ زکاۃ میں مال ہی اصل ہے اور حج میں مال ایک وسیلہ ہے ادائیگی کا۔

(۲) مسلم (۱۳۳۶)۔ (۳) المعجم الأوسط للطبرانی، رقم: ۲۷۳۱۔

(۴) مستدرک حاکم ۱/۴۸۱، نیز اس مسئلے کے لیے دیکھیے مصنف ابن ابی شیبة (۸/ ۵۶۷)۔

اکثر کا کہنا ہے کہ صحیح نہیں ہے اور اس صورت میں اگر ولی کسی مصلحت سے اس کا حج ختم کروانا چاہے تو کر سکتا ہے۔

اور اگر بچہ ممیّز نہیں ہے یعنی سنِ تمیز کو نہیں پہنچا ہے تو ولی اس کی طرف سے احرام باندھے گا، خواہ ولی خود بھی اپنا حج کر رہا ہو یا حج بدل کر رہا ہو یا خود اس کی اپنی حج کی نیت نہ ہو، سب صورتوں میں ولی اس کی طرف سے نیت کرے گا۔

اس صورت میں ولی باپ ہی ہوگا، باپ کی غیر موجودگی میں دادا یا جس کو ولی کی طرف سے وصیت کی جائے۔

اور اوپر مذکور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماں بھی اس کی طرف سے نیت کر سکتی ہے، اور اکثر فقہاء کا کہنا ہے کہ ماں چوں کہ ولی نہیں ہوتی، اس لیے اس کی نیت بچے کی طرف سے صحیح نہیں، مگر یہ کہ ولی کی طرف سے وصیت کی جائے، اور ایک قول یہ ہے کہ ولایت کا حق نہ ہوتے ہوئے بھی یہ اس کی طرف سے احرام باندھ سکتی ہے(۱)۔ امام نووی نے تفصیل سے اس سلسلے میں فقہاء کے اختلافات کو نقل کیا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ اصل میں چوں کہ باپ ولی ہوتا ہے تو اس کی موجودگی میں وہی اس کی طرف سے نیت کرے گا اور باپ کی غیر موجودگی میں جو بچے کا ولی ہوگا، یا باپ جن کو وصیت کرے خواہ ماں ہو بھائی ہو یا چچا ہو یا کوئی اور، مثلاً باپ اپنے بچے کو کسی کے ساتھ جس پر اعتماد ہو حج کے لیے بھیجے تو ظاہر ہے کہ وہ اصل ولی یعنی باپ کا وکیل ہوا، اس لیے اب وہی نیت کرے گا۔ واللہ اعلم

جب بچہ محرم ہو جائے یعنی اس کی حج کی نیت مکمل ہو جائے تو اب ولی پر ضروری ہے کہ حالتِ احرام میں جو چیزیں حرام ہیں ان سے بچے کو بچائے (۲)۔

(۱) ان مسائل کے لیے دیکھیے مھذب اور شرح المھذب یعنی المجموع (۷/۱۶-۲۰) نیز المغنی لابن قدامہ (۵/۵۱-۵۲)۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ (۸/۵۷۰-۵۷۲)، المجموع (۷/۲۰)۔

بچے کے حج کے دیگر ارکان وسنتیں:

حج کے جو ارکان بچہ خود کر سکے کرے، اور جو نہ کر سکے تو اس کی طرف سے ولی کرے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کیا، اور ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے، ہم نے بچوں کی طرف سے تلبیہ کیا (لبیك اللھم لبیك پڑھا) اور ان کی طرف سے رمی کی (۱)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے بچوں کو لے کر حج کرتے تھے، تو جو رمی کر سکتا تھا وہ کرتا، اور جو کر نہیں سکتا آپؓ اس کی طرف سے کرتے (۲)۔

بچہ اگر ممیز نہیں ہے تو ولی اس کی طرف سے صلاۃ الطّواف کی دو رکعتیں پڑھے (۳)۔

اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ بچے کو عرفات میں حاضر کیا جانا ضروری ہے، ولی کا اس کی طرف سے حاضر ہونا کافی نہیں۔ اسی طرح مزدلفہ منیٰ وغیرہ مقامات پر بھی اس کو حاضر کیا جائے گا، اس لیے کہ یہ سب امکان میں ہے (۴)۔

اگر حالتِ احرام میں بلوغ کو پہنچے:

اگر بچہ احرام باندھے پھر بالغ ہو جائے تو اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) حج سے فارغ ہونے کے بعد یعنی پورا حج کرنے کے بعد بالغ ہو جائے تو یہ اس کا حج نفل ہوگا، فرض باقی رہے گا، اگر بعد میں استطاعت ہو تو حج فرض ادا کرنا ضروری ہوگا، تمام

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبۃ (۸/ ۳۰۷) ومسند احمد (۳/ ۳۱۴) وابن ماجہ (۳۰۳۸)۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبۃ ۸/ ۳۰۸۔

(۳) المجموع (۷/ ۲۰) صرف عطاء کا اس میں اختلاف ابن ابی شیبۃ نے نقل کیا ہے (۸/ ۵۷۰)۔

(۴) شرح المھذب ۷/ ۲۰۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے، اس کی دلیل پیچھے گزر چکی ہے۔

(۲) حج پورا ہونے سے پہلے بالغ ہو جائے لیکن وقوفِ عرفات کا وقت گزر چکا تھا، اس صورت میں بھی اس پر حجِ فرض باقی رہے گا، اس لیے کہ اصلاً تو حج وقوف عرفہ ہی کا نام ہے جیسا کہ حدیث میں ہے "الحج عرفہ" (۱) اور اس کو بلوغ کی حالت میں وقوف عرفات کا موقع نہیں ملا، اس مسئلے میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔

(۳) اگر وقوفِ عرفات سے پہلے یا عرفات میں بلوغ کو پہنچے تو اکثر علماء کے نزدیک حجِّ فرض ادا ہو جائے گا، اس لیے کہ حالت بلوغ میں عرفات کا وقوف حاصل ہوا، امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے (۲) مگر امام امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک یہ حج نفل ہی ہوگا اس لیے کہ اس نے فرض کی نیت نہیں کی تھی، لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر احرام کی تجدید کر کے فرض کی نیت کرے تو حج فرض ادا ہو جائے گا (۳)۔

(۴) وقوفِ عرفات کے بعد بالغ ہو جائے لیکن ابھی وقت باقی ہو اور وہ اس میں یعنی دسویں ذوالحجہ کی صبح صادق سے پہلے عرفات میں واپس آجائے، اس کا حج فرض ادا ہوگا، اگر واپس نہ آئے تو ادا نہیں ہوگا (۴)۔

(۵) ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچہ بغیر احرام کے عرفات پہنچے اور عرفات میں حج کی نیت کرے اس صورت میں بھی حج فرض ادا ہو جائے گا اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں (۵)۔

(۱) مسند احمد ۴/۳۰۹، ترمذی (۸۸۹) نسائی (۳۰۱۹) ابن ماجہ (۳۰۱۵) صحیح ابن خزیمہ (۲۸۲۲)، ابوداود میں الحج یوم عرفۃ ہے (۱۹۴۹)۔

(۲) المغنی (۵/۴۵)۔ (۳) ہدایۃ (۱/۱۳۷-۱۳۸) بدائع الصنائع (۲/۲۹۵)۔

(۴) المجموع ۷/۳۱، والمغنی (۵/۴۶)۔ (۵) المغنی (۵/۴۵)۔

(٦) اگر وقوفِ عرفہ سے پہلے بالغ ہوجائے، اور حج کرنا اس کے لیے ممکن ہو، کوئی دشواری نہ ہو تو اس وقت اس کے لیے حج کرنا ضروری ہوگا، اس لیے کہ امکان کے بعد تاخیر جائز نہیں ہے، اگر اس صورت میں حج نہ کرے تو اس کے ذمے حج واجب ہوگا، خواہ اس کے بعد اس کے پاس گنجایش نہ ہو، یہ تفصیل حنبلی مذہب کے مطابق ہے(١)۔ امام شافعی کے نزدیک بھی اس پر اس صورت میں حج واجب ہوگا، اگرچہ ان کے نزدیک عام حالات میں امکان کے بعد حج فوری واجب نہیں ہوتا، لیکن یہاں وہ چوں کہ مقام میں حاضر ہو چکا ہے، اس لیے واجب ہوگا۔

(مسئلہ) اگر طواف قدوم (٢) کے بعد سعی نہیں کی تھی تو اب سعی کرنا بھی ضروری ہوگا، اس لیے کہ یہ سعی حج کے ارکان میں سے ہے، اگر بلوغ سے پہلے سعی کی تھی، تو راجح قول کے مطابق دوبارہ سعی کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ پہلی سعی نابالغ ہونے کی حالت میں ہوئی تھی، احرام اور سعی میں فرق ہے بلوغ کے بعد احرام دوبارہ باندھنا ضروری نہیں تھا، اس لیے کہ وہ مسلسل احرام ہی میں تھا۔ برخلاف سعی کے، وہ پوری نابالغ ہونے کی حالت میں ہوئی تھی (٣)۔

سفر حج میں بچے کا خرچ:

سفر حج میں بچے پر خرچ کرنا بھی ولی کے ذمے ہے اس لیے کہ اگر حج نہ ہوتا تو جس طرح ولی پر بچے کا خرچ ضروری تھا اسی طرح حج کی صورت میں بھی ضروری ہے۔ اگر سفر کی وجہ سے زائد خرچ آئے اس صورت میں بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ زائد خرچ بھی ولی کے ذمے ہے (٤)۔

(١) المغنی (٥/٤٦)۔ (٢) وہ طواف جو مکہ میں جاتے ہی کیا جاتا ہے۔
(٣) المجموع ٧/٣١۔ (٤) اس مسئلے میں اختلاف ہے جس کا امام نووی نے مجموع ==

بچے کا دم (فدیہ) :

اگر بچہ حالتِ احرام میں احرام کے منافی کوئی کام کرے تو بالغ پر جس طرح فدیہ یا دم لازم آتا ہے، کیا بچے پر بھی لازم آئے گا؟ اس میں تھوڑی تفصیل ہے، اگر بھول کر خوشبو لگائے یا سلا ہوا کپڑا پہنے تو کوئی فدیہ نہیں۔ اگر عمداً کرے تو فدیہ ہے، جس طرح عمداً نماز میں بچہ بولے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے یا روزے میں کھائے تو اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح یہاں عمداً کرے تو دم واجب ہوگا، یہی زیادہ صحیح قول ہے، اگر بال منڈائے، ناخن تراشے، یا شکار کرے، چوں کہ بھول کر بھی ان چیزوں کے کرنے سے دم واجب ہوتا ہے اس لیے بچے کے ساتھ بھی یہی حکم ہوگا یعنی دم واجب ہوگا (۱)۔

اور یہ دم صحیح قول کے مطابق ولی کے مال میں ہوگا، اگر ولی نے کوئی خلاف احرام کام کروایا ہو، مثلاً اس کو سلا ہوا کپڑا پہنائے تب تو بغیر اختلاف کے ولی کے مال میں ہوگا (۲)۔

بچے کے حج کے متفرق مسائل:

(مسئلہ) جہاں تک ممکن ہو بچہ خود تمام واجبات اور سنتوں کو انجام دے گا۔ اگر رمی کرتے وقت اپنی طرف سے مارنے والے کو پتھر اٹھا کر دینا ممکن ہو، تو دینا مستحب ہے، اور اگر بچے

== میں مفصل بیان کیا ہے، انھوں نے سفر میں اس پر خرچ کے سلسلے میں شافعی مسلک یہ نقل کیا ہے کہ یہ خرچ بچے کے مال میں سے ہوگا اتنا جتنا حضر میں خرچ آتا۔ ہم نے جو مسئلہ بیان کیا ہے ہمارے نزدیک وہی راجح ہے واللہ أعلم۔ پھر المغنی میں نظر پڑی کہ ابن قدامہ نے بھی المغنی میں اسی کو راجح قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: حج کا وجوب زندگی میں ایک دفعہ ہوتا ہے، اور اس کا بھی احتمال ہے کہ کبھی واجب نہ ہو، تو اس کی ضرورت کے بغیر احتمالی واجب کی مشق کے لیے اس کا مال خرچ کرنا جائز نہیں (دیکھیے المغنی ۵/۵۴)۔

(۱) آثار کے لیے دیکھیے، مصنف ابن ابی شیبۃ ۸/۵۰۴۔۵۰۵۔

(۲) المجموع ۷/۲۲۔

کے ہاتھ میں رکھ کر ولی مار سکتا ہو تو یہ بھی پسندیدہ ہے۔(۱) لیکن ان مسائل میں تشدد کی ضرورت نہیں۔اور آج کے زمانے میں تو بچوں کو رمی کے وقت لے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔

(مسئلہ) یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ بچے کی طرف سے جو رمی کرے گا ضروری ہے کہ اس سے پہلے اپنی رمی کر چکا ہو، اگر اس کا حج نفل ہو تب بھی یہی بہتر ہے۔واللہ اعلم۔

عام طور پر فقہاء نے یہ بات لکھی ہے کہ پہلے تینوں جمرات پر اپنی رمی سے فارغ ہو جائے پھر دوسرے کی رمی کرے۔لیکن آج کل علماء نے بھیڑ کو دیکھتے ہوئے یہ فتوی دیا ہے کہ ہر جمرہ پر اپنی رمی سے فارغ ہو کر دوسرے کی رمی کر سکتا ہے۔

(مسئلہ) اگر بچے کو اٹھا کر طواف اور سعی کر رہا ہو تو فقہاء کی صراحت کے مطابق یہ اس کا اپنا طواف اور سعی ہوگی، بچے کی طرف سے الگ سے کرنی پڑے گی۔لیکن آج کل طوافِ زیارت اور اس کے بعد کی سعی میں بھیڑ بہت زیادہ ہوتی ہے، دو دفعہ طواف اور سعی کرنا آسان نہیں ہوتا، اس لیے اپنے طواف اور سعی کے ساتھ بچے کی نیت کرے تو انشاءاللہ کافی ہوگا۔واللہ اعلم۔

(مسئلہ) چھوٹے بچے کو پیشاب پاخانہ کی تلویث سے بچانے کے لیے جو پیمپر وغیرہ باندھتے ہیں اس میں اگر سلائی بھی ہے تو اس کا شمار سلے ہوئے کپڑے میں نہیں ہوگا کہ اس کی وجہ سے دم دینا پڑے۔واللہ اعلم

(مسئلہ) اگر بچے کا حج کسی وجہ سے فاسد ہو جائے تو صحیح قول کے مطابق اس کی قضا ضروری ہے۔ اور اگر قضا ضروری ہے تو کیا بلوغ سے پہلے یہ قضا ہو سکتی ہے یا بلوغ کے بعد کرنا ضروری ہے۔اس میں دونوں قول ہیں، اگر بلوغ کے بعد قضا کرے تو کیا اس قضا سے اس کا حج فرض ادا ہو جائے گا؟ جواب یہ ہے کہ اگر وہ حج فاسد میں وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہوا تھا تو اس قضا حج سے فرض حج ادا ہو جائے گا، ورنہ نہیں، بلکہ پہلے فرض حج ادا کرنا پڑے گا پھر قضا، اگر پہلے قضا کی نیت سے حج کرے تب بھی بغیر کسی اختلاف کے وہ حج فرض ہوگا، پھر قضا کرنا پڑے گا(۱)۔

(۱) المغنی (۵/۵۲) (۲) مسئلے کی تفصیل کے لیے دیکھیے المجموع ۷/۲۳

پندرھواں باب

بچوں کی تادیب، ان کو سزا دینے اور مارنے کے احکام

تادیب کی ضرورت:

بچوں کی تادیب(۱) اور تعلیم و تربیت والدین پر فرض و واجب ہے، اس میں غفلت، کوتاہی، چشم پوشی، اور بے جا نرمی جہاں بچوں کو بگاڑ دیتی ہے اور ان کے مستقبل کو تباہ کر دیتی ہے، وہیں والدین کو بھی مجرم بنا دیتی ہے، بچوں کی تادیب کے لیے اصل تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے پوری نرمی اور شفقت کے ساتھ ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے، یہاں تک کہ بچے کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے کہ والدین اس سے جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اسی کے فائدے کے لیے ہے، بات بات پر جھڑکنا، سخت سست کہنا، مارنا، بچوں پر نفسیاتی طور پر اثر ڈالتا ہے اور بسا اوقات ان میں الٹی سوچ پیدا کرتا ہے، جس طرح حد سے زیادہ نرمی اور چھوٹ بچے کے اندر ضد پیدا کرتی ہے، اسی طرح حد سے زیادہ سختی بھی انھیں ضدی بنا کر چھوڑتی ہے، کتنے بچے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کی سختی سے بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ کتاب تربیت کے موضوع پر نہیں ہے، ورنہ بچوں کی تادیب کے مختلف طریقوں کو عرض کیا جاتا اور حدیث سے اس کی مثالیں پیش کی جاتیں، یہاں ہمیں بچوں کو سزا دینے اور مارنے کے احکام بیان کرنا مقصود ہے۔

جہاں تک ہو سکے بچوں کو زبانی طور پر نرمی و محبت سے سمجھانے کی کوشش کی جائے، اور مارنے اور جسمانی سزا دینے سے بچا جائے، ضرورت پر مارا جا سکتا ہے لیکن شریعت کے اس سلسلے میں جو اصول و احکام ہیں، ان کو ہر حال میں ذہن میں رکھا جائے، اور اس سلسلے میں افراط و تفریط سے بچا جائے۔

---

(۱) تادیب عربی لفظ ہے جس کے معنی ادب سکھانے کے ہیں، لیکن ادب و اخلاق سکھانے کے لیے سزا دینے کو بھی تادیب کہتے ہیں، عربی میں بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اردو والے بھی اس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

گھر میں چھڑی یا کوڑا رکھنا:

سزا دینے کا پہلا مرحلہ گھر میں چھڑی رکھنا یا کوڑا لٹکانا ہے، اسی سے عموماً بچوں کی تادیب ہو جاتی ہے، پس چھڑی دکھایئے بچہ سنبھل جائے گا، اور گھر میں چھڑی یا کوڑا رکھنا چاہیے، اس کی رسول اللہ ﷺ نے تاکید کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھر میں کوڑا لٹکانے کا حکم دیا(۱) اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: کوڑے ایسی جگہ لٹکاؤ، کہ گھر والوں کی ان پر نظر پڑتی رہے، یہ چیز ان کو ادب سکھائے گی (۲)۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دس نصیحتیں کیں، جن میں ایک یہ بھی ہے کہ اپنے گھر والوں کو ادب سکھانے کے لیے ان سے کوڑا نہ اٹھاؤ (یعنی کوڑا ان کے سامنے رکھو) اور اس حدیث میں آگے ہے کہ اللہ کے معاملے ان میں خوف پیدا کرو (۳)۔

اسی طرح کی بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے (۴)۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں کوڑا یا چھڑی ضرور رہے کہ اس کو دیکھ کر بچے ڈریں، اور بگڑنے سے محفوظ رہیں۔

---

(۱) الأدب المفرد رقم ۱۲۶۵۔

(۲) مصنف عبدالرزاق ۹/۳۱۸ (۹/۴۴۶) المعجم الأوسط للطبرانی (۳/۲۱۸ رقم ۴۳۸۲) آخری جملہ عبدالرزاق نے نہیں نقل کیا، طبرانی نے روایت کیا ہے۔

(۳) مسند احمد ۵/۲۳۸۔

(۴) المعجم الأوسط للطبرانی (۱/۵۰۶، رقم: ۱۸۶۹) والمعجم الصغیر للطبرانی (رقم: ۱۱۴)۔

گوش مالی (کان مروڑنا):

بچے کی شرارت پر کان امیٹھنا یعنی اس کو مروڑنا اور بل دینا عام بات ہے، یہ بھی سزا کا ایک طریقہ ہے اور بچے کو اس سے ہوش آتا ہے، رسول اللہ ﷺ بھی کبھی تادیب کے لیے کان امیٹھتے تھے(۱)۔

بچے کو مارنا اور اس کی مصلحت:

جب چھڑی دکھانے یا کان مروڑنے سے کام نہ چلے تو آخری مرحلے میں بچے کو مارا جا سکتا ہے؛ لیکن اس کے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں جن کی پابندی کے ساتھ ہی مارنا جائز ہے، ایسا نہیں کہ اپنا بچہ ہے جیسے چاہے، جب چاہے مارے، بچہ اللہ کی امانت ہے، اس کی حفاظت ضروری ہے، بس اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، اور آپ ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں جو باتیں علماء نے اخذ کی ہیں ان کی رعایت ضروری ہے۔

مارنے کے اصول وضوابط اور احکام:

آج کچھ لوگ مغرب کے اخلاق سوز اور انسانیت دشمن نظریات کی جگالی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بچوں کو مارنا جرم ہے، ان کو بالکل نہ مارا جائے، یہاں تک کہ ان کے نزدیک ماں باپ، کوئی سرپرست یا استاد بچوں کو مارے تو ان کو ان کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کا حق ہے۔ آج پورا یورپ اور امریکہ اس سے دوچار ہے۔ ان کے پاس بچوں کو جرائم سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی اخلاقی بندش تو ہے نہیں، مار کی صورت میں اس کا ایک طاقت ور وسیلہ جو تھا وہ ان کے نزدیک خود ایک اخلاقی اور معاشرتی جرم بن چکا ہے۔ بس

---

(۲) عمل الیوم واللیلۃ ابن سنی (۱۰۴)۔

اب اللہ ہی حافظ ہے۔ چناں چہ بچے اب ڈھیٹ ہو کر جانوروں کی طرح آزاد ہو چکے ہیں۔ بلوغ سے پہلے ایسے ایسے گناہوں اور جرائم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کوئی سلیم الفطرت، باحیا اور انسانوں سے ہم دردی رکھنے والا ان کو سننے کی تاب نہیں رکھتا۔

دوسری طرف کچھ لوگ بچوں کو اتنا مارتے ہیں کہ جسم پر اس کا نمایاں اثر ظاہر ہو جاتا ہے، کچھ ظالم تو ان کو زخمی کر دیتے ہیں، چمڑی اُدھیڑ دیتے ہیں، ہڈی توڑ دیتے ہیں، صورت بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ جرم ہے اور یہ لوگ پہلی قسم کے لوگوں سے بڑے مجرم ہیں کہ بچوں کے ساتھ ان کے اس طرح کے سلوک ہی کی وجہ سے کچھ ہم درد لوگوں میں اس کا رد عمل پیدا ہوا تھا، مگر وہ ردِّ عمل خود حد سے تجاوز کر گیا۔

اسلام نے جو بیچ کی راہ اختیار کی ہے وہ اس کے دینِ فطرت اور دینِ رحمت ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ مارنا کبھی ضروری ہو جاتا ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ مارنے کے موقعوں پر اگر نہ مارا جائے تو وہ بچہ تو بگڑ ہی جائے گا۔ دوسرے بچے بھی بیباک اور نڈر ہو جائیں گے۔ اور اگر بچے کی عمر کے لحاظ سے مناسب مار ماری جائے تو بچہ سہم جائے گا، سنبھل جائے گا اور بچہ بگڑنے سے محفوظ رہے گا۔ اور دوسرے بچے بھی عبرت حاصل کریں گے۔ پس اسلام نے اس کے مفصل احکام بیان کیے، مارنے کی اجازت دی، لیکن حدود متعین کیے:

۱- دس سال سے کم کی عمر میں مارنا جائز نہیں ہے، اسلام میں سب سے اہم اور ضروری چیز نماز ہے، اس میں کوتاہی پر یا اس کو بالکل نہ پڑھنے پر بھی دس سال کی عمر سے پہلے مارنے کی رسول اللہ ﷺ نے اجازت نہیں دی، تو پھر دوسری کسی بھی کوتاہی پر مارنا کیسے جائز ہوگا!

اصل تو یہی ہے کہ بچہ اگر مارنے کی وجہ نہیں سمجھتا تو مارنا صحیح نہیں، چناں چہ امام احمد نے

صراحت کی ہے کہ اگر بچہ چھوٹا ہے سمجھتا نہیں ہے تو نہیں مارا جائے گا (۱)۔ لیکن وہ اگر اپنا نفع نقصان جانتا ہے اور غلطی کا احساس ہے تو مارنا جائز ہے، تاکہ مارنے کا فائدہ حاصل ہو، حضرت عبداللہ بن زبیر نے ایک بچے کو سخت تھپڑ مارا جس سے وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ لوگوں نے پوچھا: آپ چھوٹے بچے کو مار رہے ہیں جس پر ابھی شرعی احکام واجب نہیں ہوئے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے دیکھا یہ اپنا نفع نقصان سمجھتا ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو ادب سکھاؤں (۲)۔

۲۔ ایک ساتھ تین مار سے زیادہ نہ مارا جائے۔ خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام شہروں میں یہ پیغام بھیجا تھا کہ استاد ایک ساتھ تین سے زیادہ مار نہ مارے، اس سے بچہ ڈر جائے گا (۳)۔ یعنی اس سے اس کے اندر خوف اور دہشت بیٹھ جائے گی جس سے بجائے فائدے کے نفسیاتی طور پر اس کو سخت نقصان پہنچے گا۔

مشہور تابعی ضحاک فرماتے ہیں اکہ اگر استاذ بچے کو تین سے زیادہ مارے تو قصاص لیا جائے گا (۴)۔

متعدد صحابہ نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دس کوڑوں سے زیادہ کسی کو سزا نہ دو، مگر یہ کہ اللہ کی حدوں میں سے کوئی حد ہو (۵)۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تادیب کے لیے بہت سے بہت دس مار ماری جاسکتی ہے، عام حالات میں تو تین مار سے زیادہ نہیں مارنا چاہیے، ناگزیر حالات میں دس مار تک ماری

---

(۱) الآداب الشرعیۃ ۲/ ۱۳۷، نسخہ شاملہ۔ (۲) تاریخ دمشق ۳۰/ ۱۵۲۔

(۳) العیال (۳۵۲)۔ (۴) العیال (ص: ۳۵۳)۔

(۵) بخاری (۶۸۴۸۔۶۸۵۰) و مسلم (۱۷۰۸) حد: قرآن و حدیث میں کسی گناہ پر مخصوص سزا جو آئی ہے اس کو کہتے ہیں، بعض علماء کہتے ہیں کہ ہر گناہ کو حد کہتے ہیں (فتح الباری، ۱۵/ ۶۹۹)

جاسکتی ہے۔ بالغ کو کسی گناہ پر جس میں متعین سزا نہ آئی ہو، دس کوڑوں سے زیادہ سزا دینا بھی بعض کے نزدیک جائز نہیں ہے(۱)۔ تو نابالغ کو تادیب کے لیے اس سے زیادہ سزا دینا کسی صورت میں جائز نہیں ہوگا۔(۲)۔

۳۔ جب عام حالات میں تادیب کے لیے تین سے زیادہ اور ناگزیر حالات میں دس سے زیادہ مارنا جائز نہیں ہے تو اس سے کوئی ایسا نہیں کرسکتا کہ سخت کوڑا یا سخت چھڑی استعمال کرے، تاکہ دس مار میں زیادہ مار کا فائدہ حاصل کرسکے، یہ تادیب نہیں، انتقام ہوا۔ اس لیے شریعت نے یہاں بھی وضاحت کی ہے۔ ایک آدمی کو حد میں کوڑے مارنا تھا، ایک تازہ نیا کوڑا لایا گیا، حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں، اس سے نہیں، بلکہ اس سے ہلکا لاؤ، تو اس پر ایک ٹوٹا ہوا کوڑا لایا گیا، حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں، اس سے بھی نہیں، بلکہ اس سے کچھ مضبوط ہونا چاہیے، تو ایک درمیانی کوڑا لایا گیا (جو نہ بہت سخت تھا نہ بہت کمزور) تب رسول اللہ ﷺ نے اس سے مارنے کا حکم دیا(۳)۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آیا، انھوں نے بھی بیچ بیچ کا کوڑا منگوایا، اور مارنے والے سے کہا مارو، لیکن تمھاری بغل نظر نہ آئے (یعنی ہاتھ تان

---

(۱) امام لیث، امام احمد کا مشہور قول، اسحاق بن راہویہ اور بعض شافعیہ کا یہ مذہب ہے، دوسرے فقہاء کے نزدیک تعزیر میں دس سے زیادہ کوڑے مارنا جائز ہے تفصیل کے لیے دیکھیے (فتح الباری ۱۵/ ۶۹۹۔۷۰۰)۔

(۲) لیکن اگر بچہ بڑا ہے بلوغ کے قریب پہنچ چکا ہے اور وہ نہایت بدتمیز بدمعاش ہے، دس مار بھی اس کو اپنی شرارتوں اور بدمستیوں سے باز نہیں رکھ سکتی، اور اس کے مربی کو زیادہ مار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہ بچہ اس کو برداشت کرسکتا ہے اور اس سے اس کو نقصان نہیں ہوگا، زیادہ مار جاسکتا ہے، قابسی لکھتے ہیں: انشاء اللہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دس سے زیادہ مارے، لیکن اللہ جانتا ہے کہ کون اصلاح چاہتا ہے اور کون بھڑاس نکالتا ہے (الرسالۃ المفصلۃ، ص: ۱۵۰۔۱۵۱)۔

(۳) مصنف ابن عبد الرزاق ۷/ ۲۹۵ (۷/ ۳۶۸)۔

کر مت مارو) اور ہر عضو کو اس کا حق دو (یعنی ایک ہی جگہ نہ مارو) (۱)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مارنے والے سے کہا مارو لیکن اس کو اپنے ہاتھ سے بچاؤ کرنے دو (۲)۔ (یعنی ہاتھ باندھو نہیں کھلے چھوڑ کر مارو) جب حد لگانے میں اور بڑے بڑے گناہوں پر سزا دینے میں اتنی احتیاط، تو تادیب کے طور پر اور وہ بھی چھوٹے بچے کو سزا دینے میں کتنی احتیاط ہونی چاہیے!!

۴- بلا وجہ بچے کو مارنا جائز نہیں، نیز بچے کو مارنے میں اپنی نیت خالص رکھے، غصہ اتارنے کے لیے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے نہ مارے، ان سے انتقام لینا جائز نہیں۔ صرف تادیب جائز ہے مخصوص شرائط کے ساتھ (۳)۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ظلم کی مار مارے قیامت کے دن اس سے قصاص لیا جائے گا۔ (۴)۔

ایک شیخ بیان کرتے ہیں کہ میں نے (مشہور تابعی) حضرت سعید بن جبیر کو کہتے ہوئے سنا کہ جو اپنے غلام کو ظلم سے مارے قیامت کے دن اس سے قصاص لیا جائے گا۔ میں نے کہا: اے ابو عبداللہ! کوئی مارتا ہے اپنے بیٹے کو، اپنے بھائی کو تاکہ وہ درست ہو جائے؟ فرمایا: اللہ سے پوشیدہ نہیں کہ کس کی نیت کیا ہے؟ یعنی کون اس کی اصلاح چاہتا ہے اور کون جذبۂ انتقام سے مار رہا ہے۔ (۵)۔

---

(۱) مصنف عبدالرزاق ۷/ ۲۹۶ (۳۶۸-۳۶۹) مصنف ابن أبی شیبۃ: (۱۴/ ۵۰۱) والسنن الکبری للبیہقی ۸/ ۵۶۵ (۳۲۶)۔ (۲) عبدالرزاق ۷/ ۲۹۶ (۳۶۹)۔

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے الرسالۃ المفصلۃ)۔

(۴) الأدب المفرد، رقم: ۱۸۶۔ دیکھیے المعجم الأوسط للطبرانی ۱/ ۳۹۴، رقم: ۱۴۴۵)۔ (۵) البر والصلۃ، رقم: ۱۷۷۔

اس لیے بچوں کو مارتے وقت اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ سمجھ کر مارنا چاہیے۔

۵- لٹا کر بیڑی ڈال کر یا کپڑے اتار کر مارنا جائز نہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس امت میں لٹا کر بیڑی ڈال کر اور کپڑے اتار کر مارنا نہیں ہے۔(۱)۔

اس لیے عام حالت میں مارے، خاص اہتمام نہ کرے۔

۶- جب اللہ کا نام لے تو اس نام کا احترام کرتے ہوئے مار روک دے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو مارے اس وقت وہ اللہ کو یاد کرے تو تم اپنا ہاتھ اٹھا دو یعنی مار روک دو۔(۲)

حضرت حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے غلام کو مار رہا تھا اور غلام کہہ رہا تھا اعوذ باللہ، اعوذ باللہ (یعنی میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) اتنے میں اچانک نبی کریم ﷺ وہاں پہنچے، تو اس نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا تو ہاتھ روک دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ سے پناہ مانگنے والے کا حق ہے کہ اس سے ہاتھ روک دیا جائے۔ اس نے کہا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ اللہ کے لیے آزاد ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو تمھارا چہرہ جہنم کی آگ میں جھلستا۔

۷- ہر عضو پر مارنا جائز نہیں(۳)۔ چہرے پر نہ مارے، حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم سے کوئی لڑائی کرے تو چہرے سے بچے(۴) یعنی چہرے پر نہ مارے۔

اس سے تو بات یہ لی جا سکتی ہے کہ دشمن کے چہرے پر مارنا بھی جائز نہیں ہے، تو

(۱) مصنف عبدالرزاق، ۷/ ۲۹۸(۷/ ۳۷۳) والسنن الکبریٰ للبیہقی (۸/ ۳۲۶)۔

(۲) ترمذی (۱۹۵۰)۔

(۳) البر والصلۃ، رقم: ۳۴۵) ومصنف عبدالرزاق ۹/ ۳۱۷، (۹/ ۴۴۵-۴۴۶)۔

(۴) بخاری (۲۵۵۹) مسلم (۲۶۱۲)

کسی اور کو مارتے وقت چہرے پر مارنا کس طرح جائز ہوگا۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں: جب تم میں سے کوئی مارے تو چہرے سے بچے (۱)۔

اسی طرح سر پر اور نازک اعضا جس سے جان کو خطرہ ہو سکتا ہو جیسے شرم گاہ اس پر مارنا بھی جائز نہیں (۲)۔

۸- ایسی سخت مار مارنا بھی جائز نہیں جس سے خون نکلے، یا ایسا زخم آئے جس کا اثر گوشت تک پہنچے، یا ہڈی ٹوٹے (۳)

بہر حال، ضرورت پر بچے کو مارا جا سکتا ہے، لیکن ان احتیاطوں کے ساتھ۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نابالغ کو اسلام نے ہر جسمانی سزا سے معاف رکھا ہے، نہ اس پر کوئی حد ہے، نہ قصاص، اس لیے کسی کو حق نہیں کہ بچے کو جسمانی اذیت پہنچائے، بس نماز نہ پڑھنے پر مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور اسی پر قیاس کرتے ہوئے علماء نے تعلیم کے سلسلے میں کسی کوتاہی یا بے ادبی پر تادیب کے لیے بچے کو درمیانی مار مارنا جائز قرار دیا ہے۔

---

(۱) ابوداود (۴۴۹۳) مسند احمد (۲/۲۴۴) الأدب المفرد (۱۷۴)۔

(۲) دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۷/۲۹۶-۲۹۸ (۳۶۹-۳۷۱) ومصنف ابن ابی شیبۃ (۱۴/۵۰۲)۔

(۳) دیکھیے مصنف عبدالرزاق ۷/۲۹۷ (۳۷۰) ومصنف ابن ابی شیبۃ (۱۴/۵۰۱)۔

سولھواں باب

بچوں کے لیے دعا اور بددعا کے احکام

بچے کی تعلیم وتربیت کے تمام وسائل کو امکان کی حد تک استعمال کرتے ہوئے ایک اہم وسیلے کو نہیں بھولنا چاہیے، اور وہ ہے دعا۔ یہ سب سے مؤثر وسیلہ اور سب سے کارگر ہتھیار ہے۔ اپنے بچوں کے لیے اللہ سے دعا کرنا مستحب ہے۔ ماں باپ کی دعا بچوں کے حق میں قبول ہوتی ہے، اسی طرح ان کی بددعا بھی لگ جاتی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین دعائیں قبول ہوتی ہیں ان کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں:

۱- باپ کی دعا

۲- مسافر کی دعا

۳- مظلوم کی دعا(۱)۔

باپ کی طرح ماں کی دعا بھی ہے، چناں چہ امام بخاری نے الأدب المفرد میں دعوۃ الوالدین روایت کیا ہے، یعنی ماں باپ کی دعا، ماں باپ کی دعا بچے کے حق میں ہو جیسا کہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے، یا بچہ کے خلاف یعنی اس کے لیے بددعا ہو جیسے اکثر روایتوں میں ہے، والدین کی دعا اور بددعا دونوں قبول ہوتی ہیں، اس لیے اپنے بچوں کے حق میں والدین کو دعا کرتے رہنا چاہیے، اور بددعا کو تو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ کسی مسلمان کو بددعا دینا جائز نہیں، چہ جائے کہ اپنے بچے کو، اپنے جگر گوشے اور دل کے ٹکڑے کو! بچہ کیسا بھی ہو، سوچنا چاہیے کہ اس کے بگڑنے کی ذمے داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے، ہماری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ بہت ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ بچے کو بددعا دیتے ہیں اور اس کا اثر ظاہر ہونے پر خود روتے پیٹتے ہیں، انھیں نہیں معلوم

(۱) الأدب المفرد (۳۲) مسند احمد (۲/ ۲۵۸، ۳۴۴، ۴۷۸، ۵۱۷، ۵۲۳) ابوداود (۱۵۳۶) ترمذی (۱۹۰۵) ابن ماجہ (۳۸۶۲)۔

کہ یہ انھی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ زبان سے اچھا برا جو نکلا، قبول ہوگیا، اس لیے ہاتھ سے زیادہ زبان کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا ہے: اپنے آپ کو بددعا نہ دو، اپنی اولاد کو بددعا نہ دو، اپنے مالوں (۱) کو بددعا نہ دو۔ ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے، اس میں تم اللہ سے جو چیز بھی مانگو گے، قبول ہوگی (۲)۔

رسول اللہ ﷺ گھر کے بچوں کو بہت دعائیں دیتے تھے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ایک موقع پر دعا دی: ''اللهم فقهه في الدين وعلمه التأويل'' (۳) اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا کر اور قرآن کا مطلب سکھا دے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دعا دی ''اللهم أكثر ماله و ولده، و بارك له فيما أعطيته'' (۴) اے اللہ اس کو زیادہ مال اور زیادہ اولاد دے، اور جو کچھ عطا کر اس میں برکت دے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری میں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ خاموش تھے کچھ بول نہیں رہے تھے، اتنے میں آپ آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھانے لگے، پھر مجھ پر اس کو پھیرنے لگے،

(۱) اکثر ایسا ہوتا تھا کہ عرب مال سے جانور مراد لیتے تھے، اس لیے کہ ان کے نزدیک ان کے جانور ہی ان کا اصل مال تھا، اور یہاں جانور ہی مراد ہے جیسا کہ حدیث کے پس منظر سے معلوم ہوتا ہے ورنہ اپنے دوسرے مال کو کوئی عموماً بددعا نہیں دیتا، واللہ اعلم۔

(۲) مسلم (۳۰۰۹)۔

(۳) احمد ۱/ ۲۶۶) بخاری ومسلم میں ذرا مختلف الفاظ میں یہ دعا مذکور ہے بخاری (۷۵، ۱۴۳) ومسلم (۲۴۷۷)۔

(۴) بخاری (۶۳۳۴) ومسلم (۲۴۸۰)۔

میں سمجھ گیا کہ آپ میری لیے دعا کر رہے ہیں(۱)۔

پس، ماں باپ کو اور گھر کے بڑوں کو بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دعائیں دینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

(۱) احمد (۲۰۱/۵) ترمذی (۳۸۱۷)

سترھواں باب

کھیل کود اور ورزش کے احکام

کھیل کے بارے میں اسلامی اصول:

اسلام نے کھیل کے بھی کچھ اصول متعین کیے ہیں:

۱- بے مقصد کھیل جن کا کوئی حاصل نہ ہو، صرف وقت گذاری کے لیے کھیلا جائے، اس کی اسلام میں اجازت نہیں، یہ ایک ''لغو'' کام ہے جس کی قرآن وحدیث میں بہت مذمت آئی ہے، اور کہا گیا ہے کہ مومن لغو میں نہیں پڑتا (سورہ مومنون آیت:۳)۔ جی بہلانا ایک مقصد ہے، اس لیے ایسے کھیل جس سے طبیعت بہلتی ہو اور اکتاہٹ دور ہوتی ہو، وہ لغو میں شامل نہیں۔

۲- وہ کھیل جو فرائض اور ضروری حقوق سے غافل کرنے والے ہوں، وہ سب ناجائز ہوں گے، ایسے کھیلوں کو ''لہو'' کہا گیا ہے(۱)۔

۳- وہ کھیل جس سے گناہ لازم آئے، مثلاً ستر کھولنا پڑے (مرد کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے اور عورت کا ستر پورا بدن چہرہ اور ہتھیلیوں کے علاوہ) یا اس میں جوا کی کوئی شکل ہو، اور اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ تشبہ بالکفار (غیر مسلموں کی نقالی) مقصود ہو، یہ تمام کھیل ناجائز ہیں۔

یہ تین اصول ہیں، ان کی روشنی میں ہر کھیل پر غور کیا جا سکتا ہے۔ بچے اگر چہ مکلّف نہیں ہیں، لیکن والدین کی ذمے داری ہے کہ ان کے کھیلوں کی اسلامی اصولوں کی

(۱) امام بخاری نے کتاب الاستیذان میں ایک باب قائم کیا ہے: **كل لهو باطل إذا شغله عن ذكر الله** یعنی ہر لہو باطل ہے جو انسان کو اللہ کی اطاعت سے غافل کر دے۔ حافظ ابن حجر اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کوئی شخص کسی بھی چیز میں ایسی مشغولیت اختیار کرے جو اس کو فرائض سے غافل کر دے خواہ وہ چیز جائز ہو یا ناجائز، مثلاً کوئی شخص عمداً نفل نماز، قرآن کی تلاوت، قرآن میں غور وفکر یا ذکر اللہ کے اندر اس طرح مشغول رہا کہ فرض نماز کا وقت نکل گیا تو وہ بھی لہو میں شامل ہے (فتح الباری ۱۴/ ۲۷) یعنی یہ عبادت بھی لہو میں داخل ہوگی، اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کھیل میں مشغول ہو کر کوئی شخص نماز یا والدین وغیرہ کے حقوق سے غافل رہے تو کس قدر یہ گناہ کا کام ہوگا!!۔

روشنی میں نگرانی کریں، ان کے ذمے اگرچہ فرائض نہیں ہیں، لیکن ان کھیلوں میں پڑ کر خطرہ ہے کہ بڑے ہوکر بھی ان کھیلوں کی مشغولیت کی وجہ سے وہ فرائض سے غافل ہو سکتے ہیں، ایسے کھیلوں سے ان کو دور رکھا جائے، ورنہ بچہ بڑا ہونے کے بعد مشکل پیش آئے گی، یا بچہ جس کھیل میں پڑ کر اپنی پڑھائی اور ضروری تعلیم سے غافل ہو رہا ہو، اس کھیل سے بھی اس کو دور رکھا جائے، وقتی طور پر کھیل کی وجہ سے پڑھائی میں اس کا جی نہ لگ رہا ہو تو یہ اس میں شامل نہیں، لیکن مستقل اسی کھیل میں مشغول رہنے لگے، اور ضروری تعلیم میں اس کی وجہ سے کوتاہی ہو رہی ہو، تو اس کھیل سے دور رکھنا ضروری ہے۔

کھیل کے مقاصد اسلام کی نظر میں:

ہر کھیل اور ورزش میں اسلامی نقطۂ نظر سے تین باتیں پیش نظر ہونی چاہیے، یا دوسرے لفظوں میں کھیل کے تین مقاصد ہونے چاہیے:

۱۔نشاط اور چستی حاصل کرنا مقصود ہو: حدیث میں کسل مندی اور سستی سے پناہ مانگی گئی ہے۔متعدد روایتوں میں حضور ﷺ کی یہ دعا منقول ہے اللھم انی اعوذبك من الكسل (۱)۔(اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی سے) صبح وشام کی مسنون دعاؤں میں بھی یہ بات آئی ہے (۲)۔یعنی رسول اللہ ﷺ ہر صبح اور شام سستی سے پناہ مانگتے تھے اور پناہ مانگنے کا حکم دیتے تھے۔اللہ کے رسول اللہ ﷺ مومن کو ہر وقت نشیط، چست اور چاق وچوبند دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے ہر وہ کھیل اور ورزش صحیح ہے اور اس کو اپنانا چاہیے جس سے چستی حاصل ہو، بشرطیکہ اس میں کھیل کے اصول کے تحت بیان کی ہوئی خرابیوں میں سے کوئی خرابی نہ ہو۔

---

(۱) مثلاً دیکھیے بخاری (۲۸۲۳) ومسلم (۲۷۰۶)۔

(۲) مسلم ۲۷۲۳

۲-صحت کی بحالی اور طاقت حاصل کرنا مقصود ہو: صحت بہت بڑی نعمت ہے، حدیث میں اس کی بحالی کی بہت تاکید کی گئی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جس میں بہت سے لوگ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں (یعنی ان نعمتوں کی عظمت اور اہمیت نہ سمجھ کر ان کی قدر نہیں کرتے اور ان کو ضائع کر دیتے ہیں) صحت اور خالی وقت (۱)۔

صحت حاصل کرنے کے ساتھ طاقت بڑھانے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طاقتور مومن زیادہ بہتر اور اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے کمزور مؤمن کے مقابلے میں، اور ہر مومن میں خیر ہے (۲)۔اس لیے ہر مسلمان کو ایسی کوشش کرنی چاہیے جس سے صحت بحال رہے اور طاقت حاصل ہو۔اس سے ان تمام کھیلوں اور ورزشوں کی ترغیب ہوتی ہے جن سے یہ فائدے حاصل ہوں۔چھوٹے بچے جن سے سختی برداشت نہ ہو سکے اور ان کے جسم کو ورزش سے تکلیف ہوتی ہو ان سے ورزش نہ کروائی جائے، ان کو اسلامی ضوابط کی روشنی میں اپنی مرضی کے مطابق اچھلنے کودنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے، اسی میں ان کی صحت کا راز ہے۔

۳-بہادری حاصل کرنا مقصود ہو: ہر مسلمان کو بہادر ہونا چاہیے اور بزدلی سے دور ہونا چاہیے، رسول اللہ ﷺ بزدلی سے سخت نفرت کرتے تھے اور اس سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے تھے اور ہر نماز کے بعد اس سے پناہ مانگتے تھے (۳)۔پس مسلمان کو ہر ایسا کام کرنا چاہیے جس

---

(۱) بخاری (۶۴۱۲)۔

(۲) مسلم (۲۶۶۴)۔

(۳) بخاری (۲۸۲۲، ۲۸۲۳) و مسلم (۲۷۰۶)۔

سے بزدلی دور ہو اور بہادری پیدا ہو۔ انھی میں سے وہ کھیل اور ورزش بھی ہیں جن سے بہادری حاصل ہوتی ہے۔

حدیث میں ممنوع کھیل:

اب ضرورت نہیں کہ ہم الگ الگ کھیل کا حکم بیان کریں، ہاں البتہ ان کھیلوں کا ذکر کرنا ہی چاہیے جن کی حدیثوں میں صراحت سے ممانعت آئی ہے، تاکہ بچہ یا بڑا ہر کوئی ان کھیلوں سے ہر حال میں بچے۔

۱۔ نرد (چوسر): انھی کھیلوں میں سے ایک نرد (چوسر) کا کھیل ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے کھیلنے سے بہت سختی سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

جس نے نردشیر (چوسر) کھیلا تو گویا اس نے اپنے ہاتھ سور کے گوشت اور خون میں رنگ لیے (۱)۔

اور ایک روایت میں اس طرح ہے: جس نے نرد کا کھیل کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی (۲)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب اپنے گھر میں کسی کو چوسر کھیلتے ہوئے دیکھتے تو اس کو مارتے اور چوسر کو توڑ دیتے (۳)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا چوسر کھیلتے ہوئے لوگوں سے گزر ہوتا تو ان کو یہ سزا دیتے

---

(۱) مسلم (۲۲۶۰)۔

(۲) موطأ، کتاب الرؤیا (۹) ص ۶۵۹، احمد (۴/۳۹۴) ابوداؤد (۴۹۳۸) ابن ماجہ (۳۷۶۲)، اس کی مذمت میں دوسرے آثار کے لیے دیکھیے مصنف ابن أبی شیبۃ (۱۳/ ۳۴۵-۳۵۱) ابن ابی الدنیا کی کتاب ذم الملاھی میں باب فی النرد اور بیہقی کی السنن الکبری میں کتاب الشہادات (۱۰/ ۲۶۲-۲۶۵ ت)، (۱۰/ ۳۱۴-۳۱۶)۔

(۳) موطا کتاب الرؤیا (۷) ص: ۶۵۹، ومصنف ابن أبی شیبۃ (۱۳/ ۳۴۹)۔

کہ نصف النہار تک یعنی سورج سر پر آنے تک ان کو باندھے رکھتے (۱)۔

۲-کبوتر بازی: اس سے بھی حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک کبوتر کے پیچھے دوڑا جا رہا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک شیطان دوسرے شیطان کے پیچھے جا رہا ہے (۲)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بچے پیدا کرنے کے لیے، انڈے کے لیے، یا انسیت حاصل کرنے کے لیے یا نامہ بری کے لیے (یعنی خطوط لے جانے کے لیے، پہلے ڈاکیہ کی جگہ کبوتروں کا استعمال ہوتا تھا) کبوتر پالنا بلا کراہت جائز ہے، شگون لینے کے لیے یا مقابلہ کروانے کے لیے اس کو پالنا اور اس سے کھیلنا صحیح قول کے مطابق مکروہ ہے، اور اگر جوا اس میں شامل ہو جائے تو ایسے شخص کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی (۳)۔

اسی سے سمجھ سکتے ہیں کہ بچوں کی انسیت کے لیے کبوتر یا کوئی پرندہ پال لینا جائز ہے، بشرطیکہ پرندوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے، اس طور پر کہ پنجرا تنگ نہ ہو اور ان کے کھانے پینے کا پورا خیال رکھا جائے۔

اس حد تک ہو تو جائز ہے، لیکن کبوتر بازی بہت سی جگہوں پر دوسرا رخ اختیار کرتی ہے، اور اس میں کئی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں:

(الف) دوسروں کے کبوتر پکڑ لینا، جو سراسر ظلم وغصب ہے۔

(ب) اس میں مشغولیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ نہ نماز کی فکر رہتی ہے، نہ اہل حقوق کے حقوق ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔

---

(۱) مصنف ابن أبي شيبة (۳۵۱/۱۳)۔

(۲) احمد (۳۴۵/۲) ابوداود (۴۹۴۰) ابن ماجہ (۳۷۶۴-۳۷۶۷)۔

(۳) دیکھیے روضۃ الطالبین ۲۲۶/۱۱-۲۲۷۔

(ج) مکانات کی چھتوں پر چڑھنا جس سے بے پردگی ہوتی ہے، اور پڑوسیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

(د) کبوتروں کو ڈھیلے مارنا جس سے دوسروں کو ایذا پہنچتی ہے، درمختار میں ایسی صورت کی نسبت لکھا ہے کہ اگر منع کرنے سے باز نہ آئے تو محتسب کو یہ کرنا چاہیے کہ ان کبوتروں کو ذبح کرڈالے۔(۱)

۳- جانوروں کو لڑا کر تفریح کرنا: بہت سی جگہوں پر جانوروں کو لڑا کر تفریح کرنے کا رواج ہے، مرغ اور بٹیر کو لڑانا بہت عام ہے، اور دوسرے جانوروں کو بھی لڑایا جاتا ہے، اس طرح کی تمام تفریحات قطعاً حرام ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو لڑانے سے منع فرمایا ہے(۲)۔

۴۔ شطرنج: شطرنج کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت نہیں ہے، لیکن متعدد صحابہ وتابعین نے اس سے منع کیا ہے اور سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے(۳)۔

بعض علماء نے اجازت دی ہے کچھ شرائط کے ساتھ، انھی میں سے یہ بھی ہے کہ نماز اور حقوق واجبہ سے غفلت نہ ہوتی ہو، اگر اس طرح کی بات ہو تو سب کے نزدیک متفقہ طور پر حرام ہے۔

پسندیدہ کھیل حدیث نبوی کی روشنی میں:

مذکورہ مقاصد کو پیش نظر رکھ کر حدیث کو دیکھتے ہیں تو متعدد کھیل نظر آتے ہیں جن

---

(۱) اصلاح الرسوم ص: ۱۵-۱۶۔

(۲) ابوداؤد (۲۵۶۲) ترمذی (۱۷۰۸)۔

(۳) دیکھیے مصنف ابن أبی شیبۃ (۳۵۱/۱۳) وذم الملاہی باب فی الشطرنج (رقم: ۹۵-۱۰۹) والسنن الکبری بیہقی ۱۰/ ۳۵۸-۳۵۹ (۲۱۲/۱۰)

کی حدیث سے ترغیب معلوم ہوتی ہے۔حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تیر اندازی کرو اور سواری کی مشق کرو، اور تیر اندازی کی مشق مجھے سواری کی مشق سے زیادہ پسند ہے، آدمی کا ہر کھیل بے کار ہے سوائے تین کھیلوں کے: تیر اندازی کرنا، گھوڑا سدھانا، اور اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا۔ یہ تینوں کھیل حق میں سے ہیں (۱)۔ (یعنی صحیح ہیں، ان سے فائدہ ہوتا ہے)۔

اور ایک حدیث میں ہے: اللہ کی یاد سے تعلق نہ رکھنے والی ہر چیز لہو ولعب میں شامل ہے (جن کی قرآن وحدیث میں مذمت آئی ہے) سوائے چار کے:

۱- آدمی کا اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا۔

۲- اپنے گھوڑے کی دیکھ بال کرنا اور اس کو سدھانا۔

۳- دو نشانوں کے درمیان چلنا (۲)۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں: سنت یہ ہے کہ دو نشان ہوں دو آدمی اس پر تیر ماریں پھر وہاں جا کر تیر لیں اور دوسرے نشان پر ماریں، اس لیے کہ یہ صحابہ کا طریقہ تھا۔ (۳)۔

۴- تیراکی سیکھنا (۴)۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ بیٹے کا باپ پر حق ہے کہ اس کو لکھنا، تیرنا اور نشانہ لگانا سکھائے۔ (۵)۔

(۱) احمد ۴/۱۴۴ و۱۴۸، وابوداؤد (۲۵۱۳) ترمذی (۱۶۳۷) نسائی (۳۶۰۸) ابن ماجہ (۲۸۱۱)۔

(۲) یہ چلنا نشانہ بازی کے لیے بھی ہوسکتا اور پیدل دوڑ کے مقابلے کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔

(۳) المغنی (۱۳/۴۲۲)۔

(۴) السنن الکبری للنسائی (۵/۳۰۲، و۳۰۳) المعجم الکبیر للطبرانی ۲/۲۱۱ (رقم: ۱۷۸۵) والمعجم الاوسط ۶/۱۰۱ (رقم: ۸۱۴۷)

(۵) السنن الکبری للبیہقی ۱۰/۲۶ (۱۰/۱۵)۔

نشانہ بازی:

نشانہ بازی اسلام کی نظر میں سب سے پسندیدہ کھیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو سیکھنے کی بہت تاکید کی ہے۔ اس سے بیک وقت کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں: اس سے جسم میں پھرتی اور اعصاب میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اور اس سے نظر تیز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہی چیز کی طرف دیکھنے، توجہ کرنے اور یکسو ہونے کی مشق ہو جاتی ہے، اور اس سب سے بڑھ کر دشمن کے مقابلے میں نشانہ بازی خوب کام آتی ہے۔ قرآن کریم میں دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة" (انفال: ٦٠) یعنی اے مسلمانو! جتنی قوت تمہارے بس میں ہو (یعنی جہاں تک تم سے ہو سکے) دشمنوں کے لیے اسے تیار کر کے رکھو۔

اس آیت میں جس قوت کا ذکر کیا گیا ہے اس کی تفسیر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ألا إن القوة الرمي" تین دفعہ آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی: خبردار! اصل قوت پھینکنا ہے، سنو! اصل قوت پھینک مارنا ہے، سنو! اصل قوت پھینک مارنے کی قوت ہے(١)، اس میں پتھر پھینکنے کی مشق، غلیل بازی، تیراندازی اور ہر طرح کی نشانہ بازی شامل ہے، بندوق سے نشانے پر گولی مارنا، بم، راکٹ، میزائل نشانے پر گرانا سب اس میں داخل ہے۔ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کا مستقل معجزہ ہے، بڑی سے بڑی جنگی طاقت اس وقت دنیا میں جو پائی جاتی ہے، اس کا تعلق رمی ہی سے ہے۔

متعدد حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ نے اس کو سیکھنے کی ترغیب دی ہے اور تاکید کی ہے، ان کو بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ اور متعدد صحابہ سے اس کی تاکید مروی ہے،

(١) مسلم (١٩١٧)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی بہت تاکید کرتے تھے۔ حضرت سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے بچوں سے کہتے تھے، میرے بچو! تیر اندازی (نشانہ بازی) سیکھو، یہ سب سے اچھا کھیل ہے۔(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے بچوں کو تیر اندازی اور نشانہ بازی خود سکھاتے تھے۔ ان کے پوتے ثمامہ بن عبداللہ بن انس بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس کے لیے ایک فرش لگایا جاتا تھا، وہ اس پر بیٹھتے اور ان کے بچے ان کے سامنے نشانہ بازی کرتے۔ ایک دفعہ نشانہ بازی کر رہے تھے کہ وہ آ نکلے اور کہا: میرے بچو! تم ٹھیک نشانہ نہیں لگاتے (تم لوگ نشانہ لگانا نہیں جانتے) پھر تیر کمان خود اپنے ہاتھ میں لے کر نشانہ لگایا تو بالکل ٹھیک بیٹھا۔(۲)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے بچوں کے اتالیق کو لمبی وصیت کی تھی، اس میں یہ بھی لکھا تھا: ہر بچہ سب سے پہلے قرآن کا جُز اچھی طرح یاد کرلے، جب اس سے فارغ ہو جائے تو اپنی کمان اور تیر کش لے کر نکلے اور ننگے پاؤں نشانہ لگانے کے لیے میدان میں جائے اور سات تیر مارے، پھر قیلولہ کرے یعنی دوپہر کو آرام کرے(۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ بچوں کو نشانہ سکھانے پر توجہ کریں اور اس کی مشق کرائیں، یہ سب سے اچھا کھیل ہے۔

لیکن نشانہ بازی کے لیے پرندوں کو یا کسی جانور کو نشانہ بنانا جائز نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ (۱۳/ ۴۱۶)۔

(۲) رواہ الطبرانی فی کتاب الرمی، دیکھیے تلخیص الحبیر (۴/ ۱۶۶)۔

(۳) ذم الملاھی لابن أبی الدنیا، (رقم: ۴۴)۔

ایسی چیز کو جس میں جان ہے نشانہ کے طور پر نہ اختیار کرو(۱)۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو کسی ذی روح (جان والی چیز) کو نشانہ بنائے (۲) یعنی صرف نشانہ دیکھنے کے لیے اس پر نشانہ نہ کرے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی روایت میں اور وضاحت کے ساتھ اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کسی چڑیے کو یا اس سے چھوٹی بڑی کسی چیز کو بغیر حق کے مار ڈالے اللہ اس سے اس کے قتل کے بارے میں سوال کرے گا، پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! اس کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو ذبح کر کے کھائے اور سر کاٹ کر نہ پھینکے (۳)۔

بچے غلیل سے پرندوں کا شکار کر کے چھوڑ دیتے ہیں، ان کو سختی سے اس سے منع کرنا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ یہ جائز نہیں، حرام ہے۔

سواری کی مشق:

اسلام میں سواری سیکھنے اور خاص طور پر گھڑ سواری کی مشق کی بہت تاکید کی گئی ہے، اس لیے کہ گھڑ سواری جہاد میں اور دشمنوں کے مقابلے میں بہت کام آتی ہے۔ اس سے ہمت اور جرأت، بہادری اور بلند حوصلگی جو پیدا ہوتی ہے وہ الگ ہے، اوپر حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی سواری کی مشق کی تاکید کی گئی ہے، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کی زندگیوں میں بہترین زندگی اس شخص کی ہے جس نے اپنے گھوڑے کی لگام اللہ کے راستے میں تھام رکھی

(۱) مسلم (۱۹۵۷)۔

(۲) بخاری (۵۵۱۵) مسلم (۱۹۵۸)۔

(۳) مسند احمد ۲/۱۶۶، نسائی (۴۴۵۰)۔

ہو، اس کی پشت پر اڑا جا رہا ہو، جب کبھی کوئی چیخ پکار یا دہشت کی آواز سنے اڑ کر وہاں پہنچتا ہو اور قتل اور موت کی جگہوں میں موت کو تلاش کرتا ہو(۱) یعنی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دوسروں کی جان بچانے کے لیے اور ان کا خوف دور کرنے کے لیے تیزی سے پہنچ رہا ہو ، جیسے کوئی اڑ کر پہنچے۔اسی پر ہر طرح کی سواری کی مشق کو سمجھا جا سکتا ہے، اسی بنیاد پر بچوں کو سائیکل کی مشق کرانی چاہیے، اس سے ہمت و جرأت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی ورزش بھی ہوتی ہے، جس کا جسم پر بوجھ بھی نہیں پڑتا، اور سائیکل سیکھنے کے بعد جو ہمت پیدا ہو جاتی ہے وہ دوسری گاڑیوں کا سیکھنا آسان کر دیتی ہے، اگر ان سواریوں کی مشق کے ساتھ اسلام کی خدمت کی نیت بھی کی جائے تو ان کا سیکھنا اور چلانا باعثِ اجر و ثواب بھی ہوگا، مثلاً اگر ہم موٹر سائیکل یا کار سیکھیں گے تو اپنا بہت سا وقت بچا کر اچھے کاموں میں استعمال کر سکیں گے، یا ان سواریوں سے ہم کم وقت میں دور پہنچ کر اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکیں گے، ایسی ہی اچھی نیت گاڑی سیکھتے وقت ضرور کرنی چاہیے اور بچوں کو سکھاتے وقت ایسی نیت کروانی چاہیے، تاکہ ان کا ہر قدم اسلام کے لیے ہو۔

تیراکی کی مشق:

تیراکی جسم کو قوت بخشتی ہے، طاقت بہم پہنچاتی ہے اور ہمت پیدا کرتی ہے، یہ ایک اچھی جسمانی ورزش ہے، اور تفریح طبع کی بھی باعث ہے، اور ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف موقعوں پر خطرات سے محفوظ رکھتی ہے۔ تیراکی جاننے والا اپنی اور دوسروں کی جان بچا کر دنیا میں بھی عزت اور سرخ روئی حاصل کرتا ہے اور آخرت کا بہت ثواب بھی اکٹھا کرتا ہے؛ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے اور اس کو باعثِ اجر و ثواب بتایا ہے

(۱) مسلم(۱۸۸۹)۔

جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن مرد کا بہترین کھیل تیراکی ہے اور عورت کا بہترین کھیل سوت کاتنا ہے(۱)۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بچوں کو تیراکی اور تیراندازی اور عورتوں کو سوت کاتنا سکھاؤ(۲)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے امراء اور حکام کو لکھا تھا کہ اپنے بچوں کو لکھنا اور تیرنا سکھاؤ(۳)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو لکھا (وہ شام میں تھے) کہ اپنے لڑنے والوں کو نشانہ بازی سکھاؤ اور بچوں کو تیراکی سکھاؤ(۴)۔

ان سب روایتوں سے بچوں کو تیراکی سکھانے کی تاکید معلوم ہوتی ہے، جو بچے تیراکی سیکھ لیتے ہیں وہ خطرات مول لیتے ہیں اور ڈر اور خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔

پیدل دوڑنا:

دوڑنا ایک بہترین جسمانی ورزش ہے، اس سے سستی اور کاہلی دور ہوکر نشاط اور

(۱) الکامل لابن عدی ۲/۵۷۵۔

(۲) شعب الایمان (۱۱/۱۳۶) یہ دونوں روایتیں بہت ضعیف ہیں، لیکن تیراکی سیکھنے کی تاکید صحیح روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے جو پہلے گذر چکی ہے۔

(۳) مصنف عبدالرزاق ۸/۳۴۹ (۱۸۹) نیز دیکھیے العیال، رقم: ۳۹۸۔

(۴) سنن سعید بن منصور، (رقم: ۲۴۵۵)۔

چستی پیدا ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اعضا مضبوط ہوتے ہیں اور طاقت حاصل ہوتی ہے، نیز بہت سی بیماریوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے اور عام طور پر تیرا کی کرنے والے کی صحت بہت اچھی رہتی ہے، صحابہ میں یہ ورزش بہت رائج تھی، ایک تابعی بلال بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کو دیکھا ہے وہ نشانوں کے درمیان دوڑ لگاتے تھے، اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے تھے، اور جب رات آتی تھی تو راہب بن جاتے تھے (یعنی اس طرح عبادت میں لگ جاتے تھے جیسے ان کو دنیا سے کوئی مطلب ہی نہیں) (۱)۔

بلکہ خود رسول اللہ ﷺ بھی کبھی دوڑ میں مقابلہ کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھی، میں نے پیدل دوڑ میں رسول اللہ ﷺ سے مقابلہ کیا تو میں آگے نکل گئی، جب مجھ پر کچھ گوشت چڑھا (یعنی میں کچھ موٹی ہوئی) تو پھر میں نے مقابلہ کیا تو حضور ﷺ آگے نکل گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس مقابلے کا بدلہ ہے (۲)۔ پس بچوں کو دوڑنے کی مشق کرانی چاہیے اور ہمت افزائی کرنے کے لیے آپس میں اس کے مقابلے کروانے چاہیے۔

چند اچھے کھیل:

فٹ بال، والی بال، ہاکی، بیٹ مینٹن، لانگ ٹینس، ٹیبل ٹینس، کبڈی اور رسی کا کھیل یہ سب مختصر وقتی اور بہت اچھے کھیل ہیں، ان میں جسمانی ورزش بہت اچھی ہوتی ہے، دوسری شرعی قباحتیں نہ ہوں تو ان کھیلوں سے مستفید ہونا چاہیے اور بچوں کو ان کی ترغیب دینی چاہیے، کبڈی تو بالکل مفت کھیل ہے اس میں کوئی خرچ ہے نہ کسی اہتمام کی ضرورت اور ورزش خوب ہوتی ہے، اسی طرح رسی بہت مفید کھیل ہے جو عموماً لڑکیاں کھیلتی ہیں، گلی

(۱) مصنف ابن أبي شيبہ ۱۳/ ۴۱۹-۴۲۰، وشرح السنۃ ۱۲/ ۳۱۸۔

(۲) مسند احمد (۶/ ۳۹، ۲۶۴) ابوداؤد (۲۵۷۸)۔

ڈنڈا بھی اگر میدان میں کھیلا جائے جہاں کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اچھا کھیل ہے، اس میں بھی خاصی ورزش ہوتی ہے۔

چند برے کھیل:

موجودہ دور کے بُرے کھیلوں میں جس سے روکا جانا چاہیے پتنگ بازی بھی ہے اس کھیل نے اکثر شہروں میں جو صورت حال اختیار کی ہے وہ نہایت تکلیف دہ اور تشویش ناک کھیل ہے، اس میں عموماً وہی سب خرابیاں پائی جاتی ہیں جو کبوتر بازی میں بیان ہو چکی ہیں، مزید برآں اس میں لاکھوں روپیہ ضائع کیا جاتا ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر اس کی ڈور سے کسی کا ہاتھ زخمی ہوتا ہے تو کسی کی گردن پر خراش آتی ہے اور کسی کسی کے لیے تو یہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے، کتنی جانیں اس سے تلف ہو چکی ہیں، اور کتنی موتیں اس سے واقع ہو چکی ہیں، جن کی خبریں ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

ان خرابیوں سے بچتے ہوئے کوئی پتنگ اڑالے تو اس میں بھی کوئی فائدہ نہیں، لیکن اگر کوئی چھوٹا بچہ یوں ہی کوئی پتنگ ہوا میں اڑالے تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

اس زمانے کا سب سے بُرا کھیل کہ اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے، وہ کرکٹ ہے، اس نے بڑی تعداد میں لوگوں کی دنیا و آخرت کو جو تباہ کر رکھا ہے، کھیلوں کی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، قرآن وحدیث کی زبان میں اس وقت کا سب سے بڑا لہو (غفلت میں ڈالنے والا کھیل) یہی ہے، پورا دن اس میں مشغولیت، اور تمام حقوقِ واجبہ سے غفلت، وقت، دماغ اور پیسوں کا بے تحاشا استعمال اور نتیجے میں آپس کی دشمنیاں، دوریاں، نفرتیں اور عداوتیں، کتنے لوگ اس میں پڑ کر فرض نمازیں چھوڑ دیتے ہیں، کتنے

نوجوان اس میں رہ کر والدین اور دوسروں کے حقوق پامال کرتے ہیں، کتنے بچے اس کا شکار ہوکر تعلیم کو خیر باد کہتے ہیں، غرض، اس کی تباہ کاریوں کی کوئی حد، کوئی انتہا ہے! ہر شخص عقل بیچ کر اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے۔ ان باتوں کا حاصل یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچوں کو اس سے دور رکھیں، سنِ شعور سے پہلے گھر میں پلاسٹک کا بلہ اور گیند لے کر کھیلے تو ٹھیک ہے، اس سے آگے محلے کے بچوں کے ساتھ یا میدان میں کھیلنے نہ چھوڑیں، آہستہ آہستہ بڑے میدانوں میں پہنچ جائیں گے، پھر انٹرنیشنل ٹیموں سے واقف ہو جائیں گے، پھر کامینٹری سے محظوظ ہوں گے پھر ٹی وی کی اسکرین کے سامنے نظر آئیں گے، بس اب ہاتھ سے گئے! لہذا گھر سے باہر کھیلنے کی اجازت نہ دیں، اصلاً تو اس کھیل میں کوئی خرابی نہیں، بلکہ خاصی ورزش ہے، لیکن اس کی موجودہ حالت ناگفتہ بہ ہے، اس لیے بچوں کو اس کے قریب ہی نہ جانیں دیں۔

گھریلو کھیلوں پر ایک نظر:

گھریلو کھیلوں میں چھوٹے بچوں کے لیے گڑیوں کا کھیل، دف اور گھنٹی کا استعمال عام ہے، گڑیا اگر پوری انسانی شکل میں نہ ہو، تو بلا کراہت جائز اور اگر انسانی شکل میں ہو تو ممنوع ہے (۱)۔ دف کا استعمال جائز ہے، اور گھنٹی جائز نہیں، سختی سے اس سے روکا گیا ہے ۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی گھنٹی ہو (۲) اور فرمایا: گھنٹی شیطان کے بجانے کا آلہ ہے (۳) اور فرمایا: ہر گھنٹی کے ساتھ شیطان ہے (۴)۔

---

(۱) سنن کبری بیہقی ۱۰/۳۷۲ (۱۰/۲۲۰)۔ (۲) ابوداؤد (۴۲۳۱)۔
(۳) مسلم (۲۱۱۴)۔ (۴) ابوداؤد (۴۲۳۰)۔

اور گھر میں کھیلے جانے والے بڑے بچوں کے کھیلوں میں کیرم بورڈ، لڈو، تاش، تعلیمی تاش اور اب ویڈیو گیمز بہت عام ہیں۔

تاش: فاسق وفاجر لوگوں کا معمول ہے، عموماً اس میں پڑ کر آدمی دوسرے ضروری کاموں سے غافل ہو جاتا ہے، پھر یہ کہ اس کا کوئی حاصل نہیں، اسلام میں کھیل کے جو مقاصد ہیں، اس میں وہ کوئی مقصد نظر نہیں آتا، ان وجوہات کی بنا پر فقہاء اس کی اجازت نہیں دیتے۔

تعلیمی تاش ویسے تو مفید چیز ہے، لیکن انہماک غیر معمولی ہو تو جائز نہیں۔

کیرم بورڈ، لڈو وغیرہ اگر تھکن دور کرنے اور نشاط حاصل کرنے کے لیے کچھ وقت کے لیے دوسری خرابیوں سے بچتے ہوئے کھیلا جائے تو جائز ہے۔

آج کل ان سب کھیلوں سے بڑھ کر ویڈیو گیمز کا رواج ہے، اگر جاندار کی تصویریں نہ ہوں تو یہ بھی چوں کہ تفریحِ طبع کا ذریعہ ہیں اور ذہن کی تیزی کا وسیلہ، اس لیے جائز ہے، لیکن ان سب کا انہماک اگر حقوق واجبہ سے غافل کر دے تو یہ سب ناجائز ہوں گے، لہٰذا ان احکام وتفصیلات کی روشنی میں اپنے بچوں کے لیے کھیلوں کا انتخاب کرنا چاہیے اور ان کے کھیلوں کی برابر نگرانی کرتے رہنا چاہیے۔

اٹھارواں باب

بچوں کے مال کے احکام

کیا بچوں کا کوئی مال ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب ظاہر ہے کہ بچوں کے پاس مختلف ذرائع سے مال پہنچ سکتا ہے۔ ماں باپ یا کسی کی وراثت میں اس کو مال مل سکتا ہے، یا کوئی اس کو تحفہ دے سکتا ہے، یا کسی بات پر اس کو انعام مل سکتا ہے، یا عام طور پر عید میں جو اس کو عیدی ملتی ہے، یا کوئی اور وجہ ہوسکتی ہے۔

بچے کے مال کا حکم:

جب یہ بات ہے کہ بچے کا مال ہوسکتا ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے کے مال کا کیا حکم ہے؟

کئی حدیثیں ہیں جن سے اس کا جواب مل سکتا ہے:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا کچھ مال اور اولاد ہے، اور میرے ابا چاہتے ہیں کہ میرا مال لے کر اپنے قبضے میں کریں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أنت ومالك لابيك" (۱)۔ تم اور تمھارا مال سب تمھارے باپ کا ہے۔

یہاں بچے سے نہیں، بلکہ بالغ اور عقل مند آدمی سے یہ بات کہی جارہی ہے تو بچے کے مال پر باپ کا اختیار بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمھارا سب سے حلال اور پاکیزہ مال وہ ہے جو تم اپنی کمائی سے کھاؤ اور تمھاری اولاد تمھاری کمائی ہے۔(۲)۔

---

(۱) ابن ماجہ (۲۲۹۱)۔

(۲) ابوداؤد (۳۵۲۸)، ترمذی (۱۳۵۸)، نسائی (۴۴۵۴-۴۴۵۷)۔

اور بھی متعدد صحابہ نے اس طرح کی بات نقل کی ہے(۱)۔

ان حدیثوں کی بنیاد پر مشہور تابعی عطاء کے نزدیک باپ اپنے بیٹے کے مال میں پوری طرح شریک ہوتا ہے خواہ بیٹا بڑا ہو یا چھوٹا ہو، اس میں سے اس کے لیے کھانا جائز ہے خواہ بیٹے کی طرف سے اجازت ہو نہ ہو، اور اس مال میں اپنے مال کی طرح تصرف کرنا بھی صحیح ہے جب تک اسراف نہ ہو اور باپ کی کم عقلی کا اظہار نہ ہو رہا ہو(۲)۔

امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے(۳)۔

اور اکثر علماء کے نزدیک جن میں امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی بھی شامل ہیں بیٹے کے مال میں تصرف کا باپ کو حق نہیں، مگر یہ کہ جتنی ضرورت ہو، یعنی ضرورت کے بقدر لینا صحیح ہے، زیادہ لینا جائز نہیں ہے۔ ان کی دلیل حجۃ الوداع کے موقع کی وہ مشہور حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمھارا خون اور تمھارا مال ایک دوسرے پر حرام ہے جس طرح آج کے دن کی اور اس مہینہ کی اور اس شہر کی حرمت ہے(۴)۔

---

(۱) دیکھیے تحفۃ الاحوذی(۴/۶۸۰)۔

(۲) دیکھیے نیل الاوطار(۴/۲۹۸)۔

(۳) مگر مطلق نہیں بلکہ اس کے بعض شرائط ہیں جن کے ساتھ باپ اپنے بیٹے کے مال میں تصرف کرسکتا ہے، ان میں سے (۱) ایک یہ ہے کہ بیٹے کی ضرورت سے زائد ہو اور بیٹے کو نقصان نہ پہنچا رہا ہو۔ (۲) باپ بیٹے کا یہ مال لے کر دوسرے بیٹے کو نہ دے۔ (۳) جب لے تو مالک ہونے کی نیت سے لے۔ (۴) مالک ہونے کی نیت سے لینا باپ یا بیٹے کے مرض الموت میں نہ ہو رہا ہو۔ (۵) اور جو چیز لے رہا ہو وہ عین موجود ہو، بیٹے کا قرض کسی پر ہے تو باپ کو معاف کرنے کا حق نہیں اور یہ اختیار صرف باپ کو ہوگا ماں یا دادا کو نہیں ہوگا۔ (الواضح فی فقہ الامام احمد، ص ۳۴۰-۳۴۱) بعض علماء کے نزدیک اسی پر قیاس کرتے ہوئے ماں کو بھی اپنے بیٹے کے مال میں تصرف کا حق ہے جب تک اسراف یا کم عقلی کا اظہار نہ ہو، شیخ سید سابق نے اسی کو اختیار کیا ہے(فقہ السنۃ ۴/۳۰۶)۔

(۴) بخاری(۱۷۴۱، ۴۴۰۶) ومسلم(۱۶۷۹)۔

اور حسن بصری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر شخص اپنے مال پر زیادہ حق رکھتا ہے اپنے باپ، بیٹے اور دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں(۱)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لینا جائز نہیں (۲) اور اس لیے بھی کہ بیٹے کو اپنے مال پر پورا اختیار ہے اس سے اس کا مال چھیننا جائز نہیں، جیسے اس کی اس چیز کا لینا صحیح نہیں جس سے اس کی ضرورت وابستہ ہوگئی ہو (۳) اور اس لیے بھی کہ ایک روایت میں یہ الفاظ "فهم وأموالهم لكم إذا احتجتم إليها" (۴) یعنی تمھاری اولاد اور ان کا مال تمھارا ہے جب تم کو اس کی ضرورت پڑے، اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کے مال میں تصرف کا باپ کو مطلق حق نہیں ہے، ہاں البتہ ضرورت پر وہ لے سکتا ہے۔

اور یہ بھی ایک دلیل ہے کہ اگر بیٹے کا مال پورا کا پورا باپ کی ملکیت ہوتا تو باپ کی موجودگی میں کسی کو کچھ نہیں ملنا چاہیے تھا، جب کہ پوتے کی موجودگی میں بیٹے کی وراثت کا چھٹا حصہ باپ کو ملتا ہے (۵)۔ یعنی میت کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے باپ کو اس کی وراثت کا چھٹا حصہ ملتا ہے۔

لیکن غور کرنے سے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ بچے کے مال میں ماں باپ کو اور

---

(۱) سنن سعید بن منصور (۲/ ۱۱۵، رقم ۲۲۹۳)۔

(۲) سنن الدار قطنی (۲۸۶۲، ۲۸۶۳) والسنن الکبریٰ للبیہقی ۸/ ۳۱۶ (۸/ ۱۸۲)۔

(۳) دیکھیے المغنی (۱۲/ ۳۲۰)

(۴) مستدرک حاکم ۲/ ۲۸۴، والسنن الکبری للبیہقی (۷/ ۴۸۰، ۷/ ۴۸۸)، ابوداؤد نے "إذا احتجتم" والے اضافے کو منکر کہا ہے (رقم ۲۸۲۹)۔

(۵) فتح القدیر ابن ہمام۔

بالخصوص باپ کو پورا اختیار ہے، اس لیے کہ عموماً وہ اس پر واجب خرچ سے بہت زیادہ خرچ کرتا ہے، تو اس کا مال اس پر کیے جانے والے زائد خرچ کا بدل ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں گویا اس کا مال اسی پر خرچ ہوا۔ اور بہتر صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ظاہری طور پر بھی یہ مال بچے ہی پر استعمال ہو، مثلاً اس کے لیے جائز کھلونے خریدے اسراف سے بچتے ہوئے، یا اس کا سامان سلیقے سے رکھنے کے لیے کوئی صندوق کوئی الماری خریدے اور اسی طرح کی چیزیں خریدنا زیادہ اچھا ہے جو بڑا ہونے پر بھی اس کے کام آئے۔ اس کے ضروری نفقے اور کپڑے اور ضروری تعلیم پر اس کو خرچ کرنا صحیح نہیں اس لیے کہ یہ باپ کی ذمے داری ہے، مگر یہ کہ باپ تنگ دست ہو تو یہ جائز ہے، اسی طرح ظاہری طور پر بچے کی ضرورت دکھا کر جب کہ وہ ضرورت نہ ہو اس کو خرچ کرنا بھی صحیح نہیں ہے، یہ بچے کے مال کو ضائع کرنا ہے، جب کہ بچے کی طرح اس کے مال کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ بچے کے حق میں سب سے مفید شکل یہ ہے کہ اس کو تجارت میں لگا کر بڑھاتا رہے، اور اس کا پورا حساب رکھے۔ اور آسان اور محتاط صورت یہ ہے کہ وہ بینک میں جمع کرتا رہے، اور دونوں صورتوں میں اس کی زکاۃ ادا کرتا رہے اور بڑا ہونے پر پوری دیانت کے ساتھ اس کا مال اس کے حوالے کرے، تاکہ وہ اپنی عقل اور ضرورت کے مطابق اس کو استعمال کر سکے۔

اور اگر بالغ ہے تو باپ کو اس پر مالکانہ حق نہیں ہے، اس صورت میں جمہور کا مسلک راجح ہے کہ باپ بقدر ضرورت اس کو خرچ کر سکتا ہے۔ تمام دلائل پر غور کرنے سے یہ باتیں ہمیں راجح معلوم ہوتی ہیں۔ واللہ اعلم

بچے کے مال پر بندش:

فقہ میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے ''حجر'' جس کے معنی روکنے اور بندش کرنے کے

ہیں، شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی وجہ سے اس کے اپنے مال میں تصرف سے روکنا۔ مختلف لوگوں پر ''حجر'' ہوتا ہے، انھی میں سے ایک بچہ ہے، بچہ چوں کہ کم عقل اور ناسمجھ ہوتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ مال کو کب، کہاں اور کتنا خرچ کرنا چاہیے، اگر اس کو اپنے مال میں تصرف کی اجازت دی جائے تو بہت سا مال ضائع ہو جائے اور بڑا ہونے کے بعد اسی کو تکلیف ہو، یا بڑا ہو کر جہاں مناسب خرچ کر سکتا تھا اس ثواب سے محروم رہے، اسی لیے قرآن نے صاف لفظوں میں حکم دیا ہے کہ ایسے کم عقل اور ناسمجھ لوگوں کو ان کا مال نہ دیا جائے، ان کا مال ان کے حوالے نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ولا تؤتوا السفهاء اموالكم التي جعل الله لكم قياماً'' (نساء:۵) یعنی تم اپنا وہ مال (جو تمھارے قبضے میں ہے) نادان اور کم عقلوں کے حوالے نہ کرو، جس کو اللہ نے تمھارے لیے قیام وبقا کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگلی آیت میں اللہ فرماتا ہے: وابتلوا اليتامى حتى إذا بلغوا النكاح، فإن آنستم منهم رشداً فادفعوا إليهم أموالهم'' (نساء:٦) (یعنی یتیموں کی آزمائش کرتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں (بالغ ہو جائیں) تو اگر تم ان میں سوجھ بوجھ (مال خرچ کرنے کی اہلیت) پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کرو)

ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے مال میں صحیح تصرف نہ کرتے ہوں ان پر مال میں تصرف کرنے کی بندش لگانی چاہیے، اس کی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ حکم ہے، اس لیے کہ مال ایک عظیم نعمت اور زندگی کے قیام وبقا کا ذریعہ ہے، اس کی حفاظت ہونی چاہیے، بے جا خرچ کرنے سے روکنا چاہیے۔

پس بچے کے مال پر اسی علت کے پیش نظر بندش لگائی جاتی ہے اور اس کو اپنے مال میں تصرف سے روکا جاتا ہے، لہٰذا بچہ جب تک نابالغ ہے اپنے مال میں کچھ تصرف نہیں کر سکتا۔

بندش کب ختم ہوگی؟

سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے جب اس کے اندر دو باتیں پائی جائیں تو اس پر سے مالی تصرف کی بندش ختم ہو جائے گی:

پہلی چیز بالغ ہونا، دوسری چیز اس کے اندر رشد یعنی سوجھ بوجھ اور مالی معاملات میں تصرف کی اہلیت پیدا ہونا۔

امام شافعیؒ ''رشد'' میں دینی حالت کی درستگی بھی ضروری قرار دیتے ہیں اس طور پر کہ وہ ایسا ہو کہ اس کی شہادت قابل قبول ہو(۱)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک کوئی بالغ ہو جائے اور رشد نہ پایا جائے تو پچیس سال کا ہونے پر اس کا مال اس کے حوالے کیا جائے گا، وہ اس آیت سے دلیل دیتے ہیں ''ولاتقربوا مال اليتيم إلا بالتي هي أحسن حتى يبلغ اشده'' (اسراء:۳۴) یعنی یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر بھلے طریقے سے، یہاں تک وہ اپنی پختہ عمر کو پہنچ جائے) اور یہ اب پختہ عمر کو پہنچ چکا ہے اور اس کی تادیب کے لیے بندش تھی، اور پچیس سال کے بعد تادیب سے عموماً فائدہ نہیں ہوتا، اس لیے رشد نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا مال اس کے حوالے کیا جائے گا۔ مگر صاحبین اور دوسرے ائمہ کے نزدیک جب تک رشد نہ پایا جائے اس کا مال اس کے حوالے نہیں کیا جائے گا خواہ ساٹھ سال کی عمر کو کیوں نہ پہنچے اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے: ''فإن آنستم منهم رشداً فادفعوا إليهم أموالهم'' (نساء:٦) ان میں رشد محسوس ہو تو ان کا مال ان کے حوالے کرو۔(۲)۔

جمہور علماء کے نزدیک اس سلسلے میں لڑکا اور لڑکی برابر ہیں، دونوں کا حکم یکساں

---

(۱) الأم (۲۱۵/۳)۔

(۲) أحکام القرآن للجصاص۔

ہے، لیکن امام مالک کا مشہور قول لڑکی کے سلسلے میں یہ ہے کہ اس کی شادی ہو جائے اور شوہر اس سے صحبت کرے تب اس کا تصرف صحیح ہوگا (۱)۔

بچے کے مالی معاملات کا حکم:

بچہ اگر غیر ممیّز ہے (یعنی تمیز کی صلاحیت ابھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوئی اور اپنا کام کرنے کے لائق نہیں ہوا) تو متفقہ طور پر اس کے وہ تصرفات اور معاملات جن کا تعلق درحقیقت قول اور زبان سے ہے، صحیح نہیں ہیں، مثلاً کوئی چیز خریدنا، بیچنا، کسی کو کچھ دینا، رہن رکھنا اور اس طرح کے دیگر معاملات۔

اور اگر ممیّز ہے یعنی اس کے اندر تمیز کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، دوسرے لفظوں میں جب اس کو نماز کا حکم دیا جاتا ہو، یا اس کے سات سال پورے ہو چکے ہوں تو اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

(الف) یا تو خالص اس کے حق میں فائدے کا معاملہ ہوگا جیسے ہدیہ قبول کرنا، اس طرح کے معاملات صحیح ہیں، اس لیے کہ اس میں اس کا فائدہ ہی ہے۔

(ب) یا تو اس کے حق میں سراپا نقصان کا معاملہ ہوگا، جیسے اپنا مال کسی کو ہدیہ کرے یا قرض دے یا عاریتاً دے، اس طرح کے معاملات صحیح نہیں ہیں، اور ولی کی اجازت سے بھی صحیح نہیں ہوں گے۔

(ج) وہ معاملات جن سے فائدہ بھی ہوسکتا ہے اور نقصان بھی، مثلاً کوئی چیز خریدنا، بیچنا، کوئی چیز کرایے پر دینا یا کوئی چیز کرایے پر لینا، اس طرح کے معاملات ولی کی

---

(۱) بدایۃ المجتہد (۱۴۴۶/۴)۔ لیکن بعض محققین مالکیہ جیسے امام قرطبی نے امام شافعی وغیرہ کے قول کو ہی راجح قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مسئلے کا تعلق رشد سے ہے شوہر کی وطی کرنے سے عورت کے رشد میں کیسے اضافہ ہوگا! (دیکھیے تفسیر القرطبی ۳۹/۵)

اجازت پر موقوف ہیں اگر ولی اجازت دے تو صحیح ہیں، ورنہ صحیح نہیں۔

شافعی اور حنبلی فقہاء نے بچے کے تمام مالی معاملات کو باطل قرار دیا ہے خواہ بچہ ممیّز ہو یا غیر ممیّز اور دوسرے لفظوں میں بچہ بڑا ہو یا چھوٹا اور کسی چیز کے بارے میں بچے کا اقرار بھی صحیح نہیں مثلاً وہ کہے کہ فلاں پر اس کا قرض ہے، یا اس پر فلاں کا قرض ہے، اور شافعی فقہاء کے نزدیک ولی اجازت دے تب بھی صحیح نہیں ہے، مگر یہ کہ چھوٹے موٹے معاملات ہوں، مثلاً کسی کو کوئی ہدیہ ماں باپ یا کسی بڑے کی طرف سے پہنچانا، یا عام گھر کے استعمال کی چیزیں خریدنا۔

اور حنبلی فقہاء اگر ممیّز بچے کو ولی مال میں تصرف کی اجازت دے تو اس کے تصرف کو صحیح قرار دیتے ہیں، مثلاً ولی کی اجازت سے تجارت کرے، یا اقرار کرے تو صحیح ہے(۱)۔

بچوں کے مال کا ولی کون ہوگا؟

جب کوئی بچہ ہے اور اس کا مال ہے تو اس کے مال کا ولی باپ کی زندگی میں متفقہ طور پر باپ ہوگا، باپ کے بعد ولایت کا حق کس کا ہوگا، اس سلسلے میں اختلاف ہے۔

احناف کے نزدیک ترتیب یہ ہے:

باپ، باپ کا وصی یعنی باپ جس کے لیے وصیت کرے، پھر دادا، پھر اس کا وصی، پھر قاضی پھر اس کا وصی۔

شوافع کے نزدیک ترتیب یہ ہے:

باپ، دادا، پھر باپ یا دادا جو موجود ہو اس کا وصی، پھر قاضی یا اس کا قائم مقام۔

امام مالک اور امام احمد کے نزدیک: باپ، پھر اس کا وصی، پھر قاضی یا اس کا قائم

(۱) ان مذاہب ومسائل کی تفصیل کے لیے دیکھیے: الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۶/ ۴۴۶۷-۴۴۶۹۔

مقام، پھر اگر قاضی نہ ہوتو جماعۃ المسلمین یعنی مسلمانوں کی جماعت (۱)۔

سن رشد کو پہنچنے تک یہ ولایت رہے گی جیسا کہ گزر چکا ہے۔

بچے کے مال میں ولی کتنا تصرف کرسکتا ہے؟

ولی اگر باپ ہے تو اس سلسلے کے احکام پیچھے گزر چکے ہیں اگر کوئی دوسرا ولی ہے تو وہ بچے کے کسی مال کا مالک نہیں ہوگا، اس لیے ضروری ہے کہ بچے کی مصلحت کے پیش نظر اس پر خرچ کرے اور اس میں تصرف کرے۔

احناف نے جو تفصیل بیان کی ہے اس کے لحاظ سے ولی بچے کے مال کو قرض نہیں دے سکتا، نہ اس کی وصیت کرسکتا ہے، نہ صدقہ کرسکتا ہے نہ ہبہ کرسکتا ہے، لیکن اگر قاضی مصلحت سمجھے تو اس کو قرض میں دے سکتا ہے۔

ولی اس کا مال عاریتاً دے سکتا ہے یا اس کو کسی کے پاس امانتاً رکھوا سکتا ہے، اس کے لیے لیے ہوئے قرض کے بدلے رہن رکھ سکتا ہے، اس کا مال اس کی اصل قیمت سے زیادہ میں بیچ سکتا ہے، اس کے لیے کوئی چیز اس کی اصل قیمت سے کم میں خرید سکتا ہے، اسی طرح کوئی چیز اس کی اصل قیمت میں اس کے لیے خرید یا بیچ سکتا ہے؛ اس لیے کہ ان تمام صورتوں میں اس کا فائدہ ہے۔

اسی طرح ولی کے لیے صحیح ہے کہ اس کو اجرتِ مثل (جتنی اجرت اس جیسے کی ہوتی ہے) یا زائد اجرت پر کسی کام میں لگائے، یا اتنی کم اجرت میں کہ ایسی کمی بیشی جو عموماً ہو جایا کرتی ہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن بالغ ہونے پر اس بچے کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو اس کو باقی رکھے، چاہے ختم کرے۔

---

(۱) دیکھیے: الفقہ الاسلامی وأدلتہ (۱۰/ ۷۳۳۱)۔

اگر بچے کی جائے داد ہے تو اس ولی کے لیے جو لوگوں میں اچھا سمجھا جاتا ہو یا کم سے کم مطعون نہ ہو (یعنی لوگ اس کو برا نہ کہتے، سمجھتے ہوں) اس کا بیچنا صحیح ہے، مگر وصی کے لیے اس کا بیچنا اسی صورت میں صحیح ہوگا جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو، مثلاً بچے کا اتنا قرض ہے کہ اس جائداد کو بیچے بغیر اس کا ادا کرنا ممکن نہ ہو۔

اگر باپ یا دادا ہے تو اپنے لیے بچے کا مال خرید سکتا ہے، اسی طرح اپنا مال بچے کے لیے بیچ بھی سکتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں بچے کا نقصان کرنا جائز نہیں، اگر قاضی بچے کی مصلحت کی خاطر اس سے روکنا چاہے تو اس کو حق ہے، اسی طرح اس کو تجارت وغیرہ معاملات میں لگا سکتا ہے اور اس مال کے ساتھ سفر بھی کر سکتا ہے (۱)۔

شافعی فقہاء نے یہ تفصیل بیان کی ہے:

ولی کے لیے ضروری ہے کہ مصلحت کے مطابق اس میں تصرف کرے، اس کو ضائع ہونے سے بچائے، اس کو بڑھانے کی تدبیر کرے، اس کو تجارت میں لگائے، تاکہ اس پر خرچ کرتے ہوئے وہ ختم یا کم نہ ہو جائے، وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں ''ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التی جعل الله لكم قياماً وارزقوهم فيها'' (نساء:۵) (۲) اور حدیث میں ہے کہ جو ایسے یتیم کا ولی ہے جس کا مال ہو تو اس کو چاہیے کہ اس مال کی تجارت کرے اور اس کو یوں ہی رکھ نہ چھوڑے کہ زکاۃ ادا کرتے ہوئے ختم (یعنی واضح صورت میں کم) نہ ہو جائے۔

اگر جائے داد خرید کر اس کی آمدنی سے اس کا کام چلا سکتا ہے تو جائے داد خریدے،

(۱) بدائع الصنائع ۴/۱۵۳ و بعد، تکملہ فتح القدیر ۸/۴۹۹۔

(۲) اہلِ علم وجہِ استدلال سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں وارزقوهم منها نہیں فيها کہا گیا ہے۔ (یعنی ان ناسمجھوں کو ان کا مال نہ دو جس کو اللہ نے تمھارے لیے بقاو قیام کا ذریعہ بنایا ہے اور اس میں ان پر خرچ کرو)

اس لیے کہ یہ زیادہ پائے دار شکل میں محفوظ ہو جائے گا، اور اس کی جائے داد کا بیچنا دو صورتوں میں جائز ہے: ایک یہ کہ بچے کے نفقے اور کپڑے وغیرہ کی ضرورت کی خاطر، دوسرے لفظوں میں جائے داد کے آمدنی سے اس کا خرچ پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کو بیچنا صحیح ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ بچے کا اس میں واضح فائدہ ہو، مثلاً ثمن مثل (یعنی جو اس کی عام قیمت ہے) سے زیادہ میں بیچے، کوئی ایسی چیز اس کے مال سے نہ خریدے جو جلدی خراب ہونے والی ہو، اگرچہ اس میں فائدہ نظر آئے۔

مصلحت دیکھے تو بچے کے ایک مال کے بدلے دوسرا مال لینا جائز ہے، اسی طرح اگر مصلحت معلوم ہو تو ادھار بیچنا بھی صحیح ہے، لیکن ادھار بیچنے کی صورت میں ضروری ہے کہ کسی کو گواہ بنالے، اور قیمت کے بدلے مناسب رہن لے، اور یہ بھی شرط ہے کہ خریدنے والا تنگ دست نہ ہو کہ قیمت ادا نہ کر سکے، بلکہ اس کی ظاہری صورت ایسی ہو کہ وہ قیمت ادا کر سکتا ہو، دوسرے لفظوں میں اس کے پاس قیمت ادا کرنے کی گنجایش معلوم ہوتی ہو، اور یہ مدت طویل نہ ہو، بلکہ عرف کے مطابق مختصر مدت ہو۔ اس کے خلاف کرنے کی صورت میں ولی ضامن ہوگا، اور صحیح قول کے مطابق یہ بیع ہی صحیح نہیں ہوگی، اس کا مال بغیر ضرورت کے نہ قرض دے نہ کہیں رکھوائے، اس لیے کہ ان صورتوں میں اپنے پاس سے نکالنا ہو جائے گا، جو ناگزیر ضرورت کے بغیر جائز نہیں ہے۔

بچے کے کھانے کپڑے کے سلسلے میں ضروری حد تک خرچ کرے، نہ تنگی کرے نہ حد سے زیادہ خرچ کرے، دونوں صورتوں میں گناہ ہوگا اور زیادہ خرچ کرنے کی صورت میں ضامن بھی ہوگا، تنگی اور خوش حالی کی حالت کے مطابق اس پر خرچ کرے، یعنی اس میں بچے کے خاندانی حالت کی رعایت کرنی چاہیے۔

اگر بچے کا مال اپنے لیے بیچنا چاہے تو اگر ولی باپ یا دادا ہے تو صحیح ہے؛ اس لیے کہ باپ اور دادا پر اس صورت میں کوئی الزام نہیں آ سکتا؛ اس لیے کہ بچے کے ساتھ ہم دردی اور شفقت کی وجہ سے وہ غلط یا بچے کے لیے نقصان دہ کام نہیں کر سکتے؛ اور اگر باپ اور دادا کے علاوہ کوئی دوسرا ولی ہے تو اس کے لیے یہ بیچنا جائز نہیں، اس لیے کہ ایک حدیث ہے کہ وصی یتیم کا مال نہیں بیچ سکتا نہ قرض لے سکتا ہے(۱) اور اس لیے بھی کہ اس پر الزام آ سکتا ہے اور الزام سے بچنا ضروری ہے۔

اگر راستہ پُر امن ہے تو بچے کی مصلحت کی خاطر اس مال کو سفر میں بھی لے جا سکتا ہے۔اس کے مال کی زکاۃ نکالنا بھی ضروری ہے اور یہ مسئلہ تفصیل سے پیچھے گزر چکا ہے۔ اگر بچہ بڑا ہونے کے بعد باپ یا دادا کے خلاف دعویٰ کرے کہ انھوں نے اس کا مال یا جاے داد بغیر مصلحت کے بیچا تھا، تو قسم کے ساتھ باپ اور دادا کی بات مانی جائے گی، اس لیے کہ وہ بچے کے ساتھ بدخواہی نہیں کر سکتے، اگر بچے کا یہ دعویٰ کسی وصی پر یا قاضی کے مقرر کیے ہوئے شخص کے خلاف ہو تو بچے کی (جواب بڑا ہو چکا ہے) بات مانی جائے گی، اس لیے کہ ان پر الزام آ سکتا ہے(۲)۔

حنبلی مذہب بھی تقریباً شافعی مذہب کی طرح ہے، مگر ان کے نزدیک صرف باپ کو بچے کا مال اپنے لیے خریدنے یا بچے کے لیے اپنا مال بیچنے کا حق ہے، دادا کے لیے نہیں اور یہ بھی تھوڑا سا فرق ہے کہ جس کے لیے ادھار بیچ رہا ہو اس کا مُوسر یعنی صاحب حیثیت اور ظاہری گنجایش والا ہونا ضروری نہیں اور رہن نہ لینے سے ضامن نہیں ہوگا، اور ثقہ اور معتمد آدمی کے پاس اس کا مال امانتاً رکھ سکتا ہے، اسی طرح امانت دار شخص کو اس کے مال

(۱) المعجم الکبیر (۹/ ۳۴۷)۔

(۲) المہذب ۱/ ۳۲۸-۳۳۰، روضہ الطالبین، مغنی المحتاج ۲/ ۱۷۴-۱۷۶۔

سے قرض بھی دے سکتا ہے(۱)۔

امام مالکؒ کے نزدیک باپ کے لیے بچے کا مال خواہ وہ جاے داد کی صورت میں ہو بیچنا ہر حال میں جائز ہے، اور اس سے سبب نہیں پوچھا جا سکتا، لیکن وصی اس کی جاے داد، ضروری سبب کی بنیاد پر ہی بیچ سکتا ہے(۲)۔

کیا ولی بچے کو اس کے مال میں تصرف کی اجازت دے سکتا ہے؟

اس پر اتفاق ہے کہ بچہ اگر غیر ممیّز ہے تو اس کو اپنے مال میں کسی طرح کے تصرف کی ولی اجازت نہیں دے سکتا، اجازت دینا اس کے مال کو برباد کرنا ہے جب کہ ولی اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے، اور اگر بچہ ممیّز ہے تو اس کا مال اس کے حوالے کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے پہلے اس کو آزمانا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وابتلوا الیتامیٰ '' یتیموں کو ان کے مال کے معاملے میں آزماتے رہو کہ وہ کس طرح تصرف کرتے ہیں، خاندان اور موروثی پیشوں کے لحاظ سے یہ آزمائش ہوگی، تاجر کا بیٹا ہے تو خرید و فروخت کے معاملات میں، اگر کاشتکاری سے اس کے خاندان کا تعلق ہے تو کھیتی باڑی کے معاملات میں، اسی طرح دوسرے پیشوں کو سمجھا جا سکتا ہے، اگر لڑکی ہے تو گھریلو کام کاج میں (۳)۔

ممیّز بچے کو تجارت کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ امام شافعی کے نزدیک تجارت کی اجازت دینا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ابھی بچہ ہے عقل پختہ نہیں ہوئی، اس کا کوئی معاملہ کرنا ہی صحیح نہیں، اس لیے تجارت کرنی ہو تو ولی معاملہ طے کرے گا (۴)۔ اور حنفی و

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے کشاف القناع ۳/ ۴۳۵-۴۳۹۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے الشرح الکبیر ۳/ ۲۹۹، ۳۰۹، الشرح الصغیر ۳/ ۳۹۰، ۳۹۳-۳۹۵۔

(۳) دیکھیے المغنی ۴/ ۴۷۸۔

(۴) مغنی المحتاج ۴/ ۴۷۸

مالکی فقہاء کے نزدیک اور یہی راجح قول ہے امام احمد کا بھی کہ اگر آزمائش سے اندازہ ہوجائے کہ یہ صحیح تجارت کرسکتا ہے تو اس کو تجارت کی اجازت دی جاسکتی ہے، اور حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک زبان سے اجازت دینا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس کو تجارت کرتے ہوئے دیکھ کر خاموش ہوجائے تو یہ بھی اجازت سمجھی جائے گی، لیکن حنبلی فقہاء اور احناف میں امام زفر کے نزدیک زبان سے اجازت دینا ضروری ہے۔ اور پھر امام ابوحنیفہ کے نزدیک اجازت دینے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس پر حجر یعنی شریعت کی طرف سے جو بندش لگی تھی وہ ختم ہوگئی، اس لیے یہ اجازت عام ہوگی، پس وہ تجارت سے متعلق تمام معاملات انجام دے سکتا ہے مثلاً خریدنا، بیچنا، رہن رکھنا، رہن لینا، اجرت پر دینا، اجرت پر لینا وغیرہ، مگر کسی کو اس میں ہبہ، قرض یا صدقہ نہیں دے سکتا، اس لیے کہ اس کا تعلق تجارت سے نہیں ہے۔ پھر امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ جیسے چاہے تصرف کرسکتا ہے اپنا نقصان کرے یا نفع، لیکن صاحبین کے نزدیک (۱)۔ ظاہری نقصان کے ساتھ وہ خرید و فروخت کرنے کا حق نہیں رکھتا (۲)۔

مالکیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

لیکن حنبلی مذہب یہ ہے کہ اجازت دینا بندش ختم کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ وکیل بنانے کے قائم مقام ہے، اس لیے جتنی اجازت ہے اتنا ہی تصرف کرسکتا ہے، لیکن مال وہ ادھار بیچ سکتا ہے، اس لیے کہ یہ تجارت کے لوازم میں سے ہے اور فائدے کے پیش نظر ایسا

(۱) اور یہی بات زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ اجازت دینے کا مطلب ہی دراصل یہ ہے کہ بچہ اپنا اب نقصان نہیں کرے گا، فائدہ ہی اٹھائے گا۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: الدر المختار ۵/ ۱۰۸-۱۱۱، بدائع الصنائع ۶/ ۱۷۵-۱۷۶، تبیین الحقائق ۵/ ۲۰۳۔

کیا جاتا ہے(۱)۔

ولی بچے کے مال سے کتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے:

ولی اگر غنی ہے تو بچے کے مال سے کچھ بھی فائدہ اٹھانا، اجرت لینا اس کے لیے صحیح نہیں ہے اور اگر تنگ دست ہے اور اس بچے کی ذمے داری کی وجہ سے وہ اپنی کمائی میں پورا وقت نہیں لگا سکتا جس سے اس کی اور اس کے گھر کی ضرورتیں پوری ہوں، اگر ایسی صورت ہے تو جتنی ضرورت ہے صحیح طریقے پر لے گا، یعنی عرف اس کے لیے جو اجرت متعین کرے، اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں اس لیے کہ اس سلسلے میں نصِ قطعی قرآن کریم کی آیت موجود ہے "ومن كان غنياً فليستعفف، ومن كان فقيراً فليأكل بالمعروف" (نساء:٦) یعنی جو غنی اور خوش حال ہے، اور اس کو لینے کی ضرورت نہیں تو وہ کچھ نہ لے، اور جو محتاج ہے تو صحیح طریقے کے مطابق کھائے (یعنی اس میں سے لے لے)۔

یتیم کا مال:

اوپر جو احکام تفصیل سے بیان ہوئے ان سے یتیم کے بارے میں مفصل احکام معلوم ہو سکتے ہیں بلکہ درحقیقت وہ اکثر احکام یتیم ہی سے متعلق تھے؛ اس لیے کہ باپ کے علاوہ جب کوئی دوسرا بچے کا ولی ہوگا عموماً وہ اسی صورت میں ہوگا جب بچہ یتیم ہوگا، یہ عنوان ہم نے یتیم کے مال کی اہمیت کے پیش نظر قائم کیا ہے۔ قرآن کریم میں یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کی بہت تاکید کی گئی ہے، اور اس کا مال کھانے کو جہنم کی آگ پیٹ میں بھرنے کے مشابہ قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ان الذين يأكلون أموال اليتامىٰ ظلماً

(۱) المغنی ۴/ ۴۶۸، کشاف القناع ۳/ ۴۴۵۔

إنما یاکلون فی بطونھم ناراً"(نساء: ۱۰) (بے شک جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں) اور حدیث میں بھی بہت سخت وعید آئی ہے، اس لیے یتیم کے مال کے سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنے بچوں کو دینے میں انصاف اور برابری کا حکم:

بچے جب سب اسی کے ہیں تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ بچوں کے درمیان عدل وانصاف اور برابری کا معاملہ کیا جائے، کسی شرارت پر ایک کو برا بھلا کہے تو دوسرے کو بھی اس شرارت پر ایسا ہی کہے، ایک کو کچھ دے تو دوسرے کو بھی دے، اگر ایسا نہیں ہوگا تو باپ کی طرف سے دوسرے بچوں پر ظلم ہوگا اور اس ظلم کی باز پرس ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید کی ہے اور مکرر سہ کرر (ایک ساتھ دو دو دفعہ تین تین دفعہ) اس کا حکم دیا ہے، چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بچوں کے درمیان برابری کا معاملہ کرو، اپنے بچوں کے درمیان برابری کا معاملہ کرو، اپنے بچوں کے درمیان برابری کا معاملہ کرو(۱)۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ان کے والدان کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام دیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمھارے دوسرے بچے بھی ہیں؟ انھوں نے کہا: جی ہاں، ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تم نے اپنے سب بچوں کو اسی طرح دیا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: پھر یہ واپس لے لو۔

(۱) مسند احمد (۴/۲۷۵،۳۷۵) وابوداؤد (۳۵۴۴) ونسائی (۳۷۱۷)۔

اورایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اللہ سے ڈرو اوراپنے بچوں کے درمیان برابری کرو، پس میرے والد نے وہ عطیہ واپس لے لیا'' (۱)۔

اورایک روایت میں اخیر میں اس طرح ہے: ''تم پر ان کا حق یہ ہے کہ تم ان کے درمیان برابری کرو، جس طرح ان پر تمھارا حق ہے کہ وہ تمھاری فرماں برداری کریں اور تمھارے ساتھ اچھا سلوک کریں'' (۲)۔

اوردوسری روایت میں یہ اضافہ ہے: کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ وہ تمھارے ساتھ فرماں برداری اور حسن سلوک کا معاملہ کریں۔ انھوں نے کہا: کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب یہ بات ہے تو ایک کو دے کر دوسرے کو محروم کرنا جائز نہیں (۳)۔

یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ پیار کرنے میں بھی برابری کرنے کو پسند کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول ﷺ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا ایک چھوٹا بچہ آیا، اس نے اٹھایا اور بوسہ دیا اور گود میں بٹھایا، پھر اس کی بچی آئی اس نے اس کو اٹھایا اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، تم نے دونوں کے درمیان برابری نہیں کی (۴)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کو کوئی چیز دینے میں سب کے ساتھ برابری کا معاملہ کرنے کا کیا حکم ہے؟ ضروری ہے یا مستحب؟

امام بخاری، مشہور محدث وفقیہ سفیان ثوری، امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور بعض

(۱) بخاری (۲۵۸۶، ۲۵۸۷) ومسلم (۱۳-۱۶۲۳)۔

(۲) ابوداؤد (۲۵۴۲)۔

(۳) مسلم (-۱۶۲۳) ونسائی (۳۷۱۰)۔

(۴) شعب الایمان بیہقی (۱۵۴/۱۱)۔

مالکی فقہاء کے نزدیک برابری کرنا ضروری ہے، تابعین میں طاؤوس کا قول بھی یہی ہے۔امام احمد سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر کوئی بچہ معذوری کی وجہ سے یا دین کی بنیاد پر یا کسی وجہ سے اس کا مستحق ہو تو دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس کو زیادہ دینا جائز ہے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: اگر ایک کو زیادہ دے کر دوسروں کو نقصان پہنچانا یا پریشان کرنا مقصود ہو تو جائز نہیں، اس صورت میں سب کو برابر دینا ضروری ہے۔

جمہور کے نزدیک سب کو برابر دینا مستحب ہے، ایک کو دوسرے سے زیادہ دے تو مکروہ ہوگا، فوراً اس کی تلافی کرنا اور سب کے لیے برابر کرنا مستحب ہے۔ان حضرات نے ممانعت والی حدیثوں کو کراہیت پر محمول کیا ہے، اور نعمان بن بشیر والی روایت کے متعدد جوابات دیے ہیں، جن کو حافظ ابن حجر نے مفصل بیان کیا ہے(۱) اور عدل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سب کو برابر دیں گے لڑکا ہو یا لڑکی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، اکثر فقہاء کے نزدیک یہی حکم ہے۔امام احمد، بعض شافعی فقہاء، بعض مالکی فقہاء اور حنفیہ میں امام محمد کا قول یہ ہے کہ میراث کی طرح یہاں بھی لڑکے اور لڑکی کے درمیان فرق کریں گے، یعنی لڑکے کو لڑکی سے دوگنا دیں گے، اس لیے کہ اگر وہ نہ دیتا اور اس کی موت ہو جاتی تو لڑکا دوگنے کا مستحق ہوتا، عدل کا مطلب یہاں یہی ہے نہ کہ دونوں کے درمیان بالکل برابر کر دیں(۲)۔

مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، بلکہ پہلی بات ہی زیادہ صحیح اور معقول ہے، اس لیے کہ میراث کا فرق قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔اور پھر یہ کہ اس کی وجہ سے باپ کے بارے میں کوئی تکدر اور برائی دل میں نہیں آسکتا، جب کہ اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں سے

(۱) فتح الباری (۶/۴۴۱-۴۴۳)۔

(۲) فتح الباری (۱۱/۴۴۱)۔

دینے میں بات بالکل الگ ہوتی ہے اس لیے کہ اگر وہ برابری نہیں کرے گا تو باپ کے بارے میں دوسری اولاد کے دل میں تکدر پیدا ہوگا اوراس کا ظاہری سلوک پر بھی پڑ سکتا ہے، پھراس سے دوسری خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں، اس لیے اولاد کو دینے میں برابری کا پورا خیال رکھنا چاہیے اورلڑکوں اور لڑکیوں میں بھی فرق نہیں سمجھنا چاہیے۔اور پھر یہ کہ ایک روایت میں یہاں تک آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنی اولاد کو دینے میں برابری کرو، اگر میں کسی کو ترجیح دیتا تو عورتوں کو ترجیح دیتا(۱) اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی میں لڑکا اورلڑکی ہونے کی وجہ سے فرق کر کے لڑکے کو زیادہ نہیں دینا چاہیے۔

اس سلسلے میں آئی ہوئی احادیث وآثار اور فقہاء کی تصریحات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں کچھ دینے میں بچوں کے درمیان برابری کا معاملہ کرنا چاہیے، اگر بغیر کسی وجہ کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں گے تو بچوں کے آپس میں دشمنی اور عداوت پیدا ہوگی، اور باپ کے بارے میں دل میں کچھ تکدر پیدا ہوسکتا ہے، جس کے برے نتائج ظاہر ہوں گے، لیکن اگر بچہ معذور ہے، اس لیے اس کو خاص تعاون کی ضرورت ہے یا دین داری یا کسی کمال کی وجہ سے مثلاً کوئی بچہ قرآن کی زیادہ تلاوت کرتا ہے، نماز کا زیادہ اہتمام کرتا ہے، امتحان میں پہلے نمبر سے کامیاب ہوتا ہے، خدمت میں سب سے تیز رہتا ہے حسن سلوک میں سب سے نمایاں ہے، یہ اور اس طرح کی دیگر صورتیں جس میں وہ زیادہ دیے جانے کا مستحق معلوم ہوتا ہے تو اُس کی ہمت افزائی اور دوسرے بچوں کی ترغیب کے لیے اس کو زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ایسے موقعوں پر اس کو زیادہ دینا بہتر معلوم ہوتا ہے، لیکن دوسرے بچوں کو محروم کرنے کے لیے اور ان کو نقصان پہنچانے کی نیت سے ایسا کرتا ہے تو قطعی حرام ہے۔

(۱) السنن الکبری للبیہقی ۶/۲۹۴، (۶/۱۷۷)، اوراس کی سند کو حافظ ابن حجر نے حسن کہا ہے (فتح الباری ۶/۴۴۱)۔

اولاد کو عطیہ دے کر واپس لینے کا حکم:

اکثر فقہاء کے نزدیک ماں اور باپ کے لیے اپنی اولاد کو کچھ دے کر واپس لینا صحیح ہے، شافعی فقہاء نے اس کو مطلق جائز قرار دیا ہے، خواہ اولاد بڑی ہو یا کم عمر۔ حنفی فقہاء کہتے ہیں کہ اگر اولاد چھوٹی ہے تو دی ہوئی چیز واپس لینا صحیح نہیں ہے، اسی طرح اس صورت میں بھی جائز نہیں ہے جب اولاد بڑی ہے اور عطیہ دی ہوئی چیز پر اس کا قبضہ ہو چکا ہے، گویا ان کے نزدیک صرف ایک صورت میں واپسی کا حق ہے، جب اولاد بڑی ہو اور چیز اس کے قبضے میں نہ گئی ہو۔ مالکی فقہاء ماں اور باپ کے درمیان فرق کرتے ہوئے یہ تفصیل بیان کرتے ہیں کہ ماں کو اپنا دیا ہوا عطیہ واپس لینے کا حق ہے جب کہ باپ زندہ ہو، اگر باپ کا انتقال ہو چکا ہو تو ماں کو اپنا دیا ہوا عطیہ واپس لینے کا حق نہیں ہے، اور باپ کو واپس لینے کا حق اس صورت میں ہے جب بیٹے پر نیا قرض نہ آیا ہو، یا اس نے نکاح نہ کیا ہو، باپ اگر بیٹے کو عطیہ دے چکا ہے اس کے بعد بیٹے پر کوئی نیا قرض آیا یا اس نے نکاح کر لیا تو باپ کو واپس لینے کا حق نہیں (۱)۔

بچہ جب کسی کا مال ضائع کرے:

بچہ اگر کسی کا مال لے لے تو ولی کی ذمے داری ہے کہ وہ جس کا مال ہے اس تک پہنچائے۔ اسی طرح اگر کسی کا مال ضائع کرے تو ولی کی ذمے داری ہے کہ وہ اس کی تلافی کرے اور مال جس کا ہے اس کو اس کا بدل دے۔ اگر بچے کا مال ہے تو اسی کے مال سے یہ چیز ادا کرے، اور اگر بچے کا مال نہیں ہے تو ولی اپنے مال سے اس کو ادا کرے گا۔

اگر ولی نے ادا نہیں کیا اور بچہ بڑا ہو گیا، اگر اس کو وہ مال ضائع کرنا یاد ہو تو اب اس کی ذمے داری ہے کہ وہ چیز ادا کرے۔

(۱) فتح الباری ۶/۴۴۳

اگر بچے نے جب وہ بہت چھوٹا تھا، ابھی سن شعور کو نہیں پہنچا تھا، اس وقت اس نے کسی کی کوئی چیز ضائع کی، اور ولی کی طرف سے اس کی ادائیگی نہیں ہوئی، اتنے میں بچہ بڑا ہو گیا، اس کو بچپن میں اپنا کیا ہوا یہ فعل یاد نہیں تو اگر اب وہ شخص جس کا مال اس نے ضائع کیا تھا بچے کے خلاف دعوی کرے تو اب اس کے لیے ادا کرنا ضروری نہیں، ہاں اگر بچے کا ولی اقرار کرے یا معتبر گواہوں کی شہادت سے یہ بات ثابت ہو جائے تو اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

بچے جو کھلونے دوسرے بچوں کے ضائع کرتے ہیں، اس میں یہی مسائل ہوں گے۔

کبھی بچپن میں اپنا ضائع کرنا اس کو یاد ہوتا ہے، بڑا ہونے کے بعد وہ اس کی تلافی چاہتا ہے، مگر اب اس کو اس کے تذکرے سے شرم آتی ہے، وہ چاہتا تو ہے کہ اس کو ادا کرے، مگر اس کی تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ اس نیت سے کچھ مصحف خرید کر مسجد میں وقف کر دیتا ہے، یا کچھ کتابیں خرید کر کسی لائبریری میں دیتا ہے، یا کوئی قرآن کی کیسٹ، سی ڈی خرید کر کسی کو عطا کرتا ہے، یا کسی فقیر یا ضرورت مند کو اتنا مال اس نیت سے دیتا ہے، ان تمام صورتوں میں ادائیگی نہیں ہوگی۔ اور اس کے ذمے حق باقی رہے گا۔

ہاں اس صورت میں اس کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے وہ اس شخص تک جس کا کوئی مال یا کھلونا بچپن میں ضائع کیا تھا کسی ذریعے سے اس کی قیمت پہنچائے، اگرچہ وہ شخص نہ جانتا ہو کہ یہ اس کی بچپن میں ضائع کی ہوئی فلاں چیز کی قیمت ہے۔ اس صورت میں ادائیگی ہو جائے گی اور وہ بری الذمہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

کسی کے درخت کا پھل توڑنا:

بچے عام طور پر راستہ چلتے درختوں پر پتھر مار کر پھل توڑتے ہیں، یا کسی کے باغ میں جا کر پھلوں کو نشانہ بناتے ہیں، اصل یہ ہے کہ کسی کے مال کا بغیر اجازت استعمال جائز

نہیں۔ چناں چہ کسی کے درخت پر پتھر مار کر پھل توڑنا جائز نہیں، البتہ جو زمین پر گر گیا ہو اس کو اٹھا کر کھانا صحیح ہے۔ لیکن بچے اگر پتھر مار کر توڑیں تو ان پر سختی نہیں کرنی چاہیے، نرمی و محبت سے سمجھانا چاہیے۔ ایک نو عمر صحابی رافع بن عمرو غفاری بیان کرتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا، انصار کے ایک باغ میں پتھر مارتا تھا، مجھے پکڑ کر لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور شکایت کی کہ یہ پتھر مار کر ہمارے باغ کے پھل توڑتا ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: بیٹے! تم کیوں درختوں کو پتھر مارتے ہو؟ میں نے کہا: بھوک لگتی ہے کھانے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھو پتھر مت مارنا، جو نیچے گر جائے اس کو اٹھا کر کھا لینا۔ پھر حضور ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی کہ اے اللہ! اس کا پیٹ بھر دے۔(۱)

(۱) مسند احمد (۵/۳۱)، ابوداود (۲۶۲۲)، ترمذی (۱۲۸۹)، ابن ماجہ (۲۲۹۹) حاکم (۴۴۴۳)۔

انیسواں باب

بچوں کے نکاح وطلاق کے مسائل

نکاح معاشرتی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے اور اسلام ایک فطری دین ہے، جس نے زندگی کے تمام مسائل کا فطری حل بتایا ہے۔انھی میں بچوں کے نکاح کی اجازت کا مسئلہ بھی ہے۔بسا اوقات خاندان، نابالغ بچوں اور بالخصوص نابالغ لڑکی کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں شادی کر دی جائے ،اور یہ طریقہ شروع ہی سے چلا آ رہا ہے، ہمارے ملک کے بہت سے علاقوں اور بالخصوص دیہی علاقوں میں اب بھی اس کا عام چلن ہے۔

بچوں کے نکاح کی اجازت:

پس فطری تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اسلام نے بھی اس کی اجازت دی ہے،قرآن کریم کی متعدد آیتوں سے اس اجازت کا پتا چلتا ہے۔(۱)۔اسی لیے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ باپ کے لیے اپنی نابالغ اولاد کی شادی کرنا جائز ہے(۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح چھوٹی عمر میں کیا(۳)اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچازاد بہن امامہ بنت حمزہ کا نکاح حضرت ابو سلمہ کے لڑکے عمر سے کیا،اس وقت وہ دونوں چھوٹے تھے۔(۴)اسی طرح متعدد صحابہ سے بھی یہی بات ثابت ہے(۵)۔

لیکن اسلام میں اس کی صرف اجازت ہے،کوئی ترغیب نہیں دی گئی ہے، بلکہ بہتر

(۱)مثلاً سورہ طلاق کی آیت:۴،سورہ نور کی آیت:۳۲،سورہ نساء کی آیت:۱۲۷۔تفصیل کے لیے دیکھیے کمسنی کی شادی اور اسلام۔از:مولانا سلطان احمد اصلاحی،ص:۷-۱۵۔

(۲)الاجماع لابن المنذر،ص:۳۹۔ (۳)دیکھیے بخاری(۵۱۳۳)مسلم(۱۴۲۲)۔

(۴)الاصابۃ(۲/۳۷۳)۔

(۵)دیکھیے مصنف عبدالرزاق ۶/۱۶۲،۱۶۲،(۷/۱۲۰-۱۲۲)

اور پسندیدہ اسی کو قرار دیا گیا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد بچوں کی شادی کریں۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں: مستحب اور پسندیدہ یہ ہے کہ باپ اور دادا کنواری لڑکی کی شادی اس وقت تک نہ کریں جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو، اور اس سے اجازت لینی چاہیے، تاکہ ایسا نہ ہو اس کی ناپسندیدگی کے ساتھ اس کو شادی کے جال میں پھنسا دیا جائے۔(۱)۔

بچوں کے نکاح کا ولی:

نابالغ بچوں کا نکاح بغیر ولی کے کسی کے نزدیک صحیح نہیں، لڑکا ہو یا لڑکی، نکاح کرانے والے کا ہونا ضروری ہے، اور یہ ولایت اجباری ہوگی یعنی بچوں سے پوچھنا اور اجازت لینا ضروری نہیں، لیکن پوچھ لینا مستحب ہے، حدیث میں ہے کہ کنواری لڑکی کا نکاح اس سے پوچھے بغیر نہ کیا جائے، صحابہ نے عرض کیا کہ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ وہ راضی ہے؟ آپ نے فرمایا اس کا خاموش رہنا ہی اس کی رضامندی ہے۔(۲)۔اور یہ بالکل معقول بات ہے کہ بچے اپنا نفع نقصان نہیں سمجھتے۔

مگر اس میں کچھ اختلاف ہے کہ ولی کون ہوگا؟ احناف کے نزدیک باپ، دادا اور اسی طرح دوسرے رشتے دار، جن کو ولایت کا حق حاصل ہوتا ہے بچوں کے نکاح کے ولی ہوسکتے ہیں (۳) اور اگر بچی ہوش مند ہے اور اس نے خود سے نکاح کرلیا تب بھی اس کا نکاح درست ہے، البتہ نافذ اس وقت ہوگا جب ولی اجازت دیں، جب تک اجازت نہ دیں نکاح موقوف رہے گا۔(۴) اور دوسرے اولیاء اگر کریں تو بالغ ہونے کے بعد اس کو

---

(۱) شرح مسلم للنووی (۹/۲۱۰)۔

(۲) بخاری (۵۱۳۶)، مسلم (۱۴۱۹)۔

(۳) المبسوط ۴/ ۲۳۷، بدائع (۲/ ۴۹۹ وبعد)۔

(۴) بدائع الصنائع ۲/ ۴۹۱، البحر الرائق (۳/ ۱۹۳)۔

نکاح باقی رکھنے یا فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔(۱) متعدد صحابہ: حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔(۲)۔

شوافع کے نزدیک صرف باپ اور دادا کو اس کا حق ہے، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کنواری کا نکاح اس کا باپ کرے گا(۳)، اور دادا چوں کہ باپ کی جگہ پر ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی یہ حق حاصل ہوگا۔(۴)۔

بچوں کے نکاح کے شرائط:

بڑوں کے نکاح کے لیے جو شرائط ہیں بچوں کے نکاح میں بھی عموماً ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، مگر بعض باتوں میں کچھ اختلاف ہے۔

شافعیہ نے اس سلسلے میں تفصیل بیان کی ہے کہ اگر بچی کا نکاح کرنا ہو (اسی طرح بالغہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر ہو رہا ہو) اس میں کئی شرطیں ہیں:

۱۔ شوہر کفو ہو۔(۵)۔

۲۔ مہر مثل ہو(۶)۔

---

(۱) البحر الرائق (۲/۲۱۱) فتح القدیر لابن الہمام (۳/۱۷۰-۱۷۱) فتاوی ہندیہ (۱/۲۸۵)۔

(۲) اور شیخ سید سابق نے بھی اسی مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچازاد بہن امامہ بنت حمزہ کی شادی کی اور ان کو اختیار دیا کہ بالغ ہونے پر نکاح فسخ کرسکتی ہے۔(فقہ السنۃ ۲/۴۰۵)۔

(۳) مسلم، سنن دار قطنی۔

(۴) مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک صرف باپ کو اس کا حق ہے یا جس کو باپ وصیت کرے یا پھر حاکم (الشرح الصغیر ۲/۳۵۳، المغنی ۹/۴۰۳۔

(۵) کفو یعنی برابر، ہم رتبہ، کفاءت (یعنی مماثلت اور برابری) کا اعتبار خاندان، پیشہ اور عیوب سے حفاظت وغیرہ میں ہونا ضروری ہے۔ تفصیل کے لیے دوسری فقہ کی کتابوں سے رجوع کیا جائے

(۶) مہر مثل یعنی اس طرح کی لڑکیوں کا عموماً جو مہر ہوتا ہے۔

۳۔مہر، ملک کی کرنسی سے ہو۔

۴۔شوہر کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ مہر ادا کر سکے۔

۵۔لڑکی اور شوہر کے درمیان کوئی عداوت اور دشمنی نہ ہو۔

۶۔ولی اور اس کے درمیان کوئی عداوت معلوم نہ ہو۔

۷۔کسی نابینا یا بہت بوڑھے یا کسی ایسے شخص سے شادی نہ کرائے جس کے ساتھ رہنے میں اس کو تکلیف ہو(۱)۔

اسی طرح شافعیہ نے بچے کی شادی کے لیے مصلحت کا ہونا شرط قرار دیا ہے۔

احناف میں امام ابو یوسف اور امام محمد بچوں کی شادی میں کفاءت اور مہر مثل کو شرط قرار دیتے ہیں۔(۲)۔

(مسئلہ) پاگل بچوں کا نکاح کرانا بھی سب کے نزدیک صحیح ہے، مگر شافعی فقہاء نے بہتر یہ سمجھا ہے کہ پاگل (بچہ ہو یا بڑا) کی شادی عام حالات میں نہ کی جائے۔شادی کی ضرورت معلوم ہو تو کرے(۳)۔

(مسئلہ) نابالغ لڑکی اگر ثیبہ (شوہر دیدہ) (۴)۔ہے، تو اس کا نکاح نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ ثیبہ کی شادی کے لیے اس کی اجازت ضروری ہوتی ہے اور نابالغ ہونے کی وجہ سے اجازت کا اعتبار نہیں۔یہ اس صورت میں ہے جب لڑکی عاقل ہو۔اگر پاگل ہے تو شادی کرائی جاسکتی ہے، اس لیے پاگل بڑی بھی ہو تو اس کی اجازت کا اعتبار نہیں، پس اگر

(۱) نہایۃ المحتاج ۶/ ۲۱۷، مغنی المحتاج، الفقہ المنہجی میں صرف تین شرائط کا تذکرہ کیا گیا ہے، شرط نمبر ۱، ۴، اور ۵۔(الفقہ المنہجی (۴/ ۶۶)۔

(۲) بدائع (۲/ ۵۱۱)۔ (۳) مغنی المحتاج۔

(۴) ثیبہ یعنی جس کی اس سے پہلے شادی ہو چکی ہو، اس کے بالمقابل لفظ باکرہ ہے یعنی کنواری۔

نابالغ ثیبہ پاگل ہو تو اجازت متصور ہی نہیں، اس لیے اس کے نکاح میں کوئی چیز مانع نہیں۔

یہ تشریح شافعی مسلک کے مطابق ہے۔

احناف کے نزدیک پاگل صغیرہ اور کبیرہ (چھوٹی بڑی) اور باکرہ و ثیبہ میں کوئی فرق نہیں، سب کا نکاح کرایا جا سکتا ہے۔(۱)۔

یتیم لڑکی کے نکاح کا مسئلہ:

جس طرح دوسرے بچوں کا نکاح کرایا جا سکتا ہے، اسی طرح یتیم لڑکی کا نکاح بھی بلوغ سے پہلے کرنا جائز ہے، یتیم لڑکی کے نکاح کے جواز پر سورۂ نساء کی آیت ویستفتونك فی النساء ...... الآیة (۲) سے استدلال کیا گیا ہے۔ اور جو اس لڑکی کا شرعی ولی ہوگا وہی نکاح کا ولی ہوگا، لیکن بلوغ کے بعد اس کو اختیار ہوگا، چاہے تو نکاح باقی

(۱) بدائع (۲/۵۰۹-۵۱۰)۔

(۲) نساء: ۱۲۷۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: لوگ تم سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہو اللہ ان کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے اور جو احکام تم کو قرآن میں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں ان یتیم عورتوں کے بارے میں جن کو تم ان کا مقررہ حق نہیں دیتے، اور ان کے ساتھ نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو (یا لالچ کی بنا پر خود ان سے نکاح کرنا چاہتے ہو) اور کمزور بچوں کے بارے میں بھی اللہ تم کو حکم دیتا ہے، اور یہ کہ تم ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو، اور جو بھلائی تم کرو گے اللہ اس کا خوب علم رکھتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی، تو یہ لوگ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے: اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس کے ساتھ خود شادی کریں اور اس کا مہر ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال سے فائدہ اٹھائیں، اور اگر مال و جمال کی کمی کی وجہ سے اس لڑکی میں ان کو دلچسپی نہ ہوتی تو ان کو چھوڑے دیتے، نہ خود شادی کرتے نہ کسی سے بیاہتے۔ (یعنی اگر مال ہوتا اور خوبصورت نہ ہوتی تو کسی اور سے بھی اس کا نکاح نہ کراتے کہ کہیں اس کا مال کسی اور کے قبضے میں نہ چلا جائے اور پھر وہ اس کے مال سے فائدہ نہ اٹھا سکیں)، اور خود دوسری عورت سے شادی کرتے۔ تو ان کو حکم دیا گیا کہ اس لڑکی سے شادی کی اسی صورت میں اجازت ہے جب اس کے مہر کا پورا حق اس کو دے دو (بخاری ۵۱۴۰)، امام بخاری نے اس باب کا عنوان باب تزویج الیتیمہ رکھا ہے۔

رکھے چاہے تو فسخ (ختم) کرائے۔

یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے، اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے(۱)۔

اور یہ بھی دلیل ہے کہ حدیث میں ہے: یتیم لڑکی سے نکاح کے سلسلے میں اس سے مشورہ لیا جائے گا، اگر خاموش رہے تو اجازت سمجھی جائے گی، اور انکار کرے تو اس کا نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ یعنی جب بالغ ہونے کے بعد انکار کرے۔(۲)۔

امام شافعی کے نزدیک یتیم لڑکی کی شادی بلوغ سے پہلے صحیح نہیں، وہ بھی اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ بلوغ سے پہلے کی اجازت کا اعتبار نہیں، تو پوچھنے سے فائدہ نہیں۔ گویا اس میں اشارہ ہے کہ اس کے بلوغ کا انتظار کیا جائے گا۔(۳)۔

خیارِ بلوغ:

احناف کے نزدیک اگر باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے نکاح کیا ہو تو اس کو بالغ ہونے کے بعد نکاح کو باقی رکھنے اور ختم کرنے کا اختیار رہو گا۔ یعنی چاہے تو نکاح کو باقی رکھے اور چاہے تو ختم کردے، چوں کہ بلوغ کے ساتھ اس کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے اس لیے اس کو خیارِ بلوغ کہتے ہیں، یہ اختیار بالغ ہونے کے وقت حاصل ہوتا ہے، تاخیر سے ختم ہوجاتا ہے، اس لیے اگر وہ نکاح ختم کرنا چاہتی ہے تو بلوغ کے ساتھ ہی نکاح ختم کرنے کا

---

(۱) فقہ السنۃ (۲/۴۱۰) لیکن امام احمد کے نزدیک نو سال کی عمر میں شادی ہوئی اور وہ راضی ہوگئی، تو نکاح صحیح ہے، اور اس کو بلوغ کے بعد اختیار نہیں ہوگا۔ (دیکھیے سنن الترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اکراہ الیتیمۃ علی التزویج، در ضمن حدیث :۱۱۰۹)۔

(۲) ابوداود (۲۰۹۳-۲۰۹۴) ترمذی (۱۱۰۹) نسائی (۳۲۷۰) واحمد (۲/۲۵۹) و۲/۳۸۴، و۲/۴۷۵۔

(۳) دیکھیے فتح الباری (۱۱/۴۶۵)۔

اعلان کرنا چاہیے، ورنہ اختیار ختم ہو جائے گا، یہاں تک کہ مجلس کے ختم ہونے تک بھی یہ اختیار باقی نہیں رہے گا۔ یہ اس صورت میں ہے جب لڑکی کنواری ہو اور شوہر نے اس سے تعلق قائم نہ کیا ہو۔

اگر لڑکی شوہر دیدہ ہو یا کنواری ہو، مگر شوہر نے تعلق قائم کر لیا ہو پھر شوہر کے پاس رہتے ہوئے بلوغ کو پہنچی تو اس کا خیار خاموشی سے یا وہاں سے اٹھنے سے ختم نہیں ہوگا، بلکہ اسی صورت میں ختم ہوگا جب وہ صراحت کے ساتھ نکاح سے رضامندی کا اظہار کرے یا اس سے کوئی ایسا عمل پایا جائے جس سے اس کی رضامندی معلوم ہوتی ہو، مثلاً شوہر کو تعلق قائم کرنے سے نہ روکے، یا نفقہ طلب کرے یا اسی طرح کوئی کام کرے، اگر اس کے ساتھ کھانا کھائے یا اس کا کوئی کام کرے جیسے خدمت کرتی تھی، تب اس کا خیار باقی رہے گا۔ اور اگر بلوغ کے وقت اس کو عقد نکاح کا علم ہو جائے، لیکن خیار بلوغ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہے تو اس کا خیار ختم ہو جائے گا۔ اگر بلوغ کے وقت عقد کا علم نہ ہو تو علم ہونے تک خیار باقی رہے گا۔ جب بالغ ہو جائے اور شوہر کا نام یا مہر سے متعلق پوچھے یا خود گواہوں کے سامنے پیش کرے تو خیار بلوغ باطل ہو جائے گا۔(۱)۔

نابالغ بیوی کے ساتھ مباشرت:

یہ بات واضح ہے کہ نابالغ لڑکی کی جب شادی کرنا صحیح ہے تو اس کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن ہاں اس کی جسمانی صحت کا اعتبار کیا جائے گا، اگر اتنی چھوٹی ہے کہ جنسی تعلق کو برداشت نہیں کر سکتی یا اتنی کمزور ہے کہ تعلق قائم کرنے سے کسی مرض کا اندیشہ ہے تو اس سے تعلق قائم کرنا درست نہیں ہے۔ اگر ایسی کوئی بات نہیں تو

(۱) فتاوی ہندیہ (۱/۲۸۶)، فتح القدیر (۳/۱۷۷)۔

اس سے تعلق قائم کیا جاسکتا ہے۔اس میں عمر کو کوئی دخل نہیں۔(۱)۔

بچوں کا مہر:

اس کے دو پہلو ہیں۔ایک لڑکے کے لحاظ سے دوسرا لڑکی کے لحاظ سے۔

جہاں تک پہلے کا تعلق ہے تو یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مہر کے بغیر شادی نہیں ہوتی اور شوہر پر اس کی ادائیگی ضروری ہے، پس اس لڑکے کے مال سے اس کو ادا کیا جائے گا۔لیکن سوال یہ ہے کہ جب اس کا مال نہیں ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی، جواب اس کا یہ ہے کہ باپ یا جو ولی ہے مہر معجّل کی صورت میں وہ ادا کرے گا، اور یہ بچے کے ذمے قرض ہوگا، بڑا ہونے کے بعد اس کے لیے ادا کرنا ضروری ہے،(۲)۔

اور فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ باپ یا ولی نابالغ بچے کی شادی میں مہر مثل سے زیادہ متعین نہیں کرے گا۔مہر مثل سے زیادہ باندھنے کی صورت میں زیادہ مہر باطل ہو جائے گا، اس کی ادائیگی ضروری نہیں ہوگی، صرف مہر مثل ادا کرنا کافی ہوگا(۳)۔

دوسرے پہلو میں کئی مسائل ہیں:

۱۔باپ کو یہ حق نہیں کہ نابالغ لڑکی کا نکاح مہر مثل سے کم میں کرے، یہ امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد، امام داؤد ظاہری اور امام ابن حزم ظاہری کا مسلک ہے، باپ اس طرح کرے تو لڑکی کو اعتراض کا حق ہے اس لیے کہ مہر اس کا حق ہے، باپ کو اس کا نقصان کرنے کی اجازت نہیں۔

---

(۱) شرح مسلم نووی (۹/۲۱۰)، نیز فتاوی ہندیہ (۱/۲۸۷)۔

(۲) لیکن فقہاء کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ مال نہ ہونے کی صورت میں باپ ضامن ہوگا یا نہیں؟ دیکھیے المغنی وردالمختار (۴/۲۸۷)۔

(۳) ردالمختار (۹/۲۱۵)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی باپ دادا کے علاوہ دوسرے ولی کو یہ حق نہیں، لیکن باپ اوردادا کو اس کا حق ہے کہ چاہے تو مہر مثل سے کم پر نکاح کرے(۱)۔ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک، باپ اگر مہر مثل سے کم میں نکاح کرے تو لڑکی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں ،(اس لیے کہ ان کے نزدیک مہر مثل سے کم میں باکرہ کا نکاح کرنا جائز ہے، باپ کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں۔(۲)۔

۲۔ اگر لڑکی بالغ ہونے پر نکاح فسخ کرتی ہے تو پورا مہر ساقط ہو جائے گا۔(۳)۔

۳۔ نابالغ لڑکی کا مہر باپ لے گا اس لیے کہ اس مال کا وہی ذمے دار ہے، اسی طرح باپ دادا کی عدم موجودگی میں دوسرا ولی اپنے قبضے میں رکھے گا، لیکن عدالت یا قاضی کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کا اس کو کوئی حق نہیں ہوگا۔(۴)۔

بچوں کی طلاق:

یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ بچوں کو طلاق کا اختیار نہیں، اس لیے کہ بچہ غیر مکلّف ہے، اس کے کسی تصرف کا اعتبار نہیں، صریح و صحیح حدیث میں آتا ہے کہ تین طرح کے لوگوں کے تصرف کا اعتبار نہیں۔ سونے والا جب تک بیدار نہ ہو، بچہ جب تک کہ بالغ نہ ہو، اور پاگل جب تک کہ عقل نہ آئے۔(۵)۔

اورطلاق تو ایک نقصان دہ عمل ہے، اس لیے ممیز بھی ہو اور ولی اجازت بھی دے تو

(۱) الدر المختار مع الرد (۱۷۱/۴) مغنی المحتاج (۱۴۹/۳، ۲۲۷) المحلی (۵۱/۹)۔

(۲) فقہ السنۃ (۴۳۳/۲)

(۳) کشاف القناع (۱۳۷/۵) والشرح الصغیر

(۴) دیکھیے فقہ السنۃ بحولۂ بالا۔

(۵) ابوداؤد (۴۳۹۸، ۴۴۰۱، ۴۴۰۳) ونسائی (۳۴۳۲)، ابن ماجہ (۲۰۴۱، ۲۰۴۲)، نیز دیکھیے ترمذی (۱۴۲۳)۔

جائز نہیں (۱)۔ وہ اگر طلاق دے گا تو ایک لغو عمل ہوگا، اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن کیا باپ کو اس کی طرف سے طلاق دینے کا حق ہے؟ بعض حدیثوں سے ہمیں اس سلسلے میں رہنمائی ملتی ہے اور ہم ان کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ مصلحت ہونے پر باپ کو یہ حق حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میری زوجیت میں ایک عورت تھی، مجھے اس سے محبت تھی، مگر میرے والد کو وہ پسند نہیں تھی، انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس کو طلاق دے دو، میں نے نہیں مانا، انھوں نے جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا، (ایک روایت میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو طلاق دے دو۔ (۲)۔

تو جب باپ کو اپنی بڑی اولاد سے طلاق دلوانے کا حق ہے تو بچوں کے سلسلے میں یہ حق اس کو بدرجۂ اولیٰ حاصل ہونا چاہیے، پھر یہ کہ شادی بھی اس نے اپنے اختیار سے کرائی تھی تو طلاق بھی اپنے اختیار سے دے گا، اس لیے کہ باپ بیٹے کا بدخواہ نہیں ہوسکتا اور اس قصداً نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ واللہ اعلم۔

جب اس کو طلاق دینے کا حق نہیں تو طلاق رجعی میں رجوع کا بھی حق نہیں، مگر احناف کے نزدیک اس کو رجوع کا حق حاصل ہے۔ (۳)۔

بچی کا خلع:

احناف کے نزدیک اگر بچی ممیّز ہے اور خلع لے تو طلاق رجعی پڑے گی اور اس

(۱) الفقہ الاسلامی وأدلتہ (۹/۶۸۸۲) لیکن حنابلہ کے نزدیک بچہ ممیز ہے تو طلاق صحیح ہوگی۔

(۲) ابوداؤد (۵۱۳۸)، ترمذی ۱۱۸۹۰) ابن ماجہ (۲۰۸۸)۔

(۳) دیکھیے الفقہ الاسلامی وأدلتہ (۱۰/۶۹۹۰)۔

کے ذمے معاوضے گے ادائیگی لازم نہیں ہوگی، طلاق اس لیے پڑے گی کہ طلاق بیوی کے قبول کرنے پر موقوف تھی، اور ممیّز ہونے کی وجہ سے قبولیت کی اہلیت اس میں موجود ہے، اور معاوضہ اس لیے لازم نہیں ہوگا کہ وہ ابھی نابالغ ہے اور مالی معاملات کے لیے بلوغ بھی ضروری ہے۔

اور بچی غیر ممیّز ہے تو اس کے خلع کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، یعنی اگر اس کے مطالبے پر شوہر طلاق دے تو طلاق نہیں پڑے گی، اس لیے کہ طلاق بیوی کی قبولیت پر موقوف تھی اور غیر ممیّز ہونے کی وجہ سے اس میں اس کی اہلیت ہی نہیں۔(۱)۔

نابالغہ کی عدت:

نابالغ لڑکی کی عدتِ طلاق تین ماہ ہے، قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے، طلاق کے مسائل بیان کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے والـلائـی لـم یـحـضـن (۲)۔ اور ان لڑکیوں کی عدت جو ابھی حیض کی عمر کو نہیں پہنچیں، تین ماہ ہے، مگر وفات کے بعد کی عدت میں بڑی چھوٹی میں کوئی فرق نہیں، سب کی چار ماہ دس دن ہے۔

---

(۱) احکام الأحوال الشخصیہ، بحوالہ فقہ السنہ (۳/۵۸)، لیکن امام مالک کے نزدیک اس کا باپ اس کی طرف سے خلع لے گا (بدایۃ المجتہد)۔

(۲) سورہ طلاق (آیت:۴)۔

بیسواں باب

بچے کی موت اور وراثت سے متعلق احکام

موت ایسی چیز ہے جس سے کسی مخلوق کو چھٹکارا نہیں، موت کا کوئی وقت متعین نہیں، موت کسی بھی وقت اور عمر کے کسی بھی مرحلے میں، بلکہ ماں کے پیٹ میں بھی آ سکتی ہے۔ اسلام جامع دین ہے، زندگی کے ہر گوشے سے متعلق اس نے رہنمائی کی ہے۔ موت اور اس کے بعد کے مراحل کے بارے میں بھی تفصیل سے احکام موجود ہیں، چوں کہ چھوٹے بچے کے احکام کچھ مختلف ہیں، اس لیے ذیل میں ہم ان کو بیان کرتے ہیں:

پہلی فصل

بچے کی نمازِ جنازہ، غسل، کفن اور دفن کے احکام

بچے کی تین حالتیں ہوتی ہیں، اور تینوں کے احکام الگ الگ ہیں:

پہلی حالت یہ ہے کہ چار مہینے سے پہلے جب جان نہیں ہوتی، بچہ ساقط ہو جائے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ بچہ حمل کے چار مہینے کے بعد یعنی جان پڑنے کے بعد ساقط ہو جائے، لیکن باہر آتے وقت زندگی کی کوئی علامت نہ پائی جائے، بالفاظِ دیگر مردہ پیدا ہونا یقینی طور پر معلوم ہو جائے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتے وقت زندہ ہو، اس کے بعد مر جائے۔

پہلی حالت میں یعنی چار مہینے سے پہلے حمل ساقط ہونے کی صورت میں اس کو نہ غسل دیا جائے گا نہ نماز پڑھی جائے گی، بلکہ کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے گا۔

یہ متفقہ مسئلہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، اس لیے کہ جان پڑنے سے پہلے اس کی حیثیت گوشت کے ٹکڑے کی سی ہے، جان پڑی ہی نہیں کہ میت کے احکام اس پر نافذ ہوں(۱)۔

(۱) دیکھیے المجموع (۵/۱۵۴) المغنی (۳/۴۶۰) بدائع الصنائع (۲/۲۸) والذخیرۃ للقرافی (۲/۴۷۰)۔

امام نووی لکھتے ہیں کہ اگر آدمی کی صورت نہ ہوئی ہو تو اس کے لیے کوئی حکم نہیں، نہ غسل ہے نہ کفن (۱) لیکن بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی گوشت کا احترام کرتے ہوئے اس کو کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کیا جائے۔

دوسری حالت میں یعنی بچہ جان پڑنے کے بعد ساقط ہو جائے، مگر نکلتے وقت مردہ ہو، زندگی کی کوئی علامت معلوم نہ ہو، اس حالت میں اختلاف ہے کہ بچے پر نماز پڑھی جائے گی یا نہیں، اسی طرح اس کے غسل کے مسئلے میں بھی اختلاف ہے۔

احناف کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ غسل اور کفن دیا جائے گا، مگر نماز نہیں پڑھی جائے گی۔(۲)۔

امام شافعی کا راجح قول بھی یہی ہے۔(۳)، امام شوکانی نے بھی اسی قول کو راجح قرار دیا ہے، اور وجہ ترجیح بھی بیان کی ہے(۴)۔

مالکیہ کے نزدیک نہ غسل واجب ہے نہ نماز، البتہ کفن دینا واجب ہے(۵)۔

امام احمد کے نزدیک غسل کفن نماز سب واجب ہے(۶)

اہل ظاہر کے نزدیک نماز جنازہ مستحب ہے(۷)۔

جو فقہاء نماز کو واجب قرار دیتے ہیں، وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں ہے "السقط يصلى عليه" (۸)۔ یعنی بچہ جو وقت سے پہلے ساقط ہو جائے اس کی نماز پڑھی جائے گی، اس میں مطلق نماز پڑھنے کی بات کہی گئی ہے۔ زندہ پیدا ہو یا مردہ اس بات کو

(۱) المجموع (۵/۱۵۴)۔ (۲) ہدایۃ (۱/۹۱)، بدائع (۲/۲۸)۔
(۳) المہذب مع شرح المہذب (۵/۱۵۳)۔ (۴) دیکھیے نیل الأوطار (۳/۱۳۴)۔
(۵) الذخیرہ للقرافی ۲/۴۷۰، وحاشیۃ الدسوقی (۱/۴۲۷)۔
(۶) الانصاف ۲/۵۰۵، المغنی (۳/۴۵۸) (۷) المحلی (۳/۳۸۵)۔
(۸) احمد (۴/۲۴۷، و۲۴۹) ابوداود (۳۱۸۰)، ترمذی (۱۰۳۱)، نسائی (۱۹۴۲)، ابن ماجہ (۱۵۰۷)۔

نہیں چھیڑا گیا۔اور جن کے نزدیک نماز پڑھنا ضروری نہیں، وہ دوسری حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جس میں ہے کہ بچے کی نماز نہیں پڑھی جائے گی، جب تک کہ آواز نہ آئے (۱)۔یعنی اس کا زندہ پیدا ہونا معلوم نہ ہو۔

اس میں نماز کے حکم کو زندہ پیدا ہونے کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، پس اگر زندگی کا اثر ظاہر نہ ہو تو نماز نہیں پڑھی جائے گی۔

تیسری حالت میں یعنی بچہ پیدا ہوتے وقت زندہ ہو، پیدائش کے بعد اس کی موت واقع ہوئی ہو، اس حالت میں اجماع ہے کہ اس پر نماز پڑھی جائے گی۔

اسی طرح اس کو غسل دینا اور کفن پہنانا بھی سب کے نزدیک ضروری ہے (۲)۔

اور اس کا کفن بھی بالغ کے کفن کی طرح تین کپڑوں میں ہوگا۔(۳)۔

(مسئلہ) چھوٹے بچے کو عورت غسل دے سکتی ہے، اس مسئلے پر اجماع ہے (۴)۔

---

(۱) ترمذی (۱۰۳۲) وابن ماجہ (۱۵۰۸)، دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض ہے، کسی نے پہلی حدیث کو لیا اور کسی نے دوسری کو راجح قرار دیا ہے، دونوں کے وجوہِ ترجیح کیا ہیں؟ اس کے لیے دیکھیے (احکام الاجہاض، (ص:۶۳۱ وبعد)۔ نیز غسل وکفن کے وجوب کے دلائل اور نماز کے سلسلے میں تمام اختلافات اور سب کے دلائل اور وجوہِ ترجیح کے لیے بھی دیکھیے أحکام الاجہاض (ص:۶۲۷۔۶۵۸)۔

(۲) الاجماع لابن المنذر (ص:۱۱، رقم:۸۲)، بدائع الصنائع للکاسانی (۲/۲۸) المجموع للنووی (۵/۱۵۴) المغنی لابن قدامۃ (۳/۴۵۸)۔

(۳) المجموع (۵/۱۵۳) لیکن اس میں کوئی سختی نہیں ہے، چاہے تو ایک کپڑے میں کفنائے، متعدد تابعین سے یہ بات ثابت ہے۔(دیکھیے مصنف ابن أبی شیبہ (۷/۱۷۶۔۱۷۷)۔

(۴) الاجماع لابن المنذر ص:۱۱، (رقم:۷۹)۔

فصل دوم
بچے کی وراثت کے احکام

اس میں دو طرح کی بحثیں ہیں:

پہلی بچے کی وراثت سے متعلق یعنی اس کا مال ہے تو اس کی وراثت کے کیا احکام ہیں،

دوسری بحث، بچے کو ملنے والی میراث سے متعلق ہے۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زندہ بچے کے احکام میراث اور بڑوں کے احکام میراث میں کوئی فرق نہیں۔ یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتے وقت زندگی کا اثر معلوم ہو تو وہ وراثت کا پوری طرح مستحق ہوگا۔ اور دوسرے بھی اس کے وارث ہوں گے۔

اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب پیدا ہونے والے بچے کی آواز نکلے تو وارث ہوگا(۱)۔

اس پر بھی اجماع ہے کہ کسی آدمی کا انتقال ہو جائے اور اس وقت اس کی بیوی حمل سے تھی، اور بچہ زندہ پیدا ہو جائے (خواہ اس کے فوراً بعد مر کیوں نہ جائے) وہ اپنے باپ کا وارث ہوگا، اور دوسرے اس کے وارث ہوں گے(۲)۔

اسی طرح حضرت جابر کی اس حدیث میں جس کا اوپر حوالہ گزر چکا ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچے کی نہ نماز پڑھی جائے گی نہ وہ وارث ہوگا، نہ کوئی اس کا وارث ہوگا، جب تک اس کی آواز نہ نکلے، یعنی زندہ پیدا ہو تو وارث ہوگا۔(۳) اس کے علاوہ صحابہ وتابعین کے

(۱) ابوداود (۲۹۲۰)، السنن الکبری للبیہقی (۶/ ۲۵۷)۔

(۲) الاجماع لابن المنذر، ص: ۳۶، نمبر ۳۲۳، المغنی ۹/ ۱۸۰۔

(۳) ترمذی (۱۰۳۲)، ابن ماجہ (۱۵۰۸)۔

دسیوں آثار ہیں جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بچے میں پیدائش کے وقت زندگی کے آثار ہوں تو وہ وارث ہوں گے اور دوسرے بھی اس کے وارث ہوگا۔(۱)۔

لیکن ایک صورت مستثنیٰ ہے، وہ یہ کہ اگر ماں پر زیادتی کی وجہ سے پیٹ میں بچہ مرگیا ہو تو اس صورت میں جو دیت واجب ہوتی ہے وہ اس کا مالک ہوگا۔ یعنی اس کے مال کے طور پر اس کے تمام وارثوں میں بقدر حصہ تقسیم ہوگی، امام شافعی (۲) امام احمد (۳) اور امام مالک (۴) کا یہی قول ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ اسی طرح وارث ہوگا اور دوسرے اس کے وارث ہوں گے جس طرح زندہ پیدا ہونے کی صورت میں ہوتا ہے (۵)۔

اہل ظاہر کے نزدیک اگر حمل ایک سوبیس دن یعنی چار مہینے سے آگے بڑھ چکا ہو، بالفاظ دیگر اس میں جان پڑ چکی ہو، پھر زیادتی کی وجہ سے وہ مردہ نکلے تو یہ دیت وارثوں میں تقسیم ہوگی، اگر اس سے کم مدت میں اس طرح کا واقعہ پیش آئے تو یہ دیت خاص ماں کا حق ہوگا۔(۶) امام لیث بن سعد اور ربیعۃ الرای کے نزدیک مدت حمل کی قید کے بغیر اس طرح واقعہ پیش آنے کی صورت میں دیت کی مستحق ماں ہی ہوگی (۷)۔

لیکن سب کے نزدیک قاتل وارث ہونے والوں میں سے کوئی ہے تو اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا، وہ اس جرم کی وجہ سے محجوب یعنی وارثت سے محروم ہوگا۔

---

(۱) دیکھیے مصنف عبدالرزاق (۳/۳۴۶-۳۴۸، ۳/۵۲۸-۵۳۲)۔

(۲) روضۃ الطالبین (۷/۲۲۶) الحاوی للماوردی (۱۲/۳۹۱)، نہایۃ المحتاج (۷/)

(۳) المغنی لابن قدامہ (۱۲/۶۷)، الانصاف (۱۰/۷۰) (۳/۲۷۷) کشاف القناع (۶/۲۴)

(۴) حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر (۴/۲۶۹-۲۷۰)۔

(۵) المبسوط للسرخسی (۳۰/۶۰ وبعد)، البنایۃ علی الہدایۃ (۱۲/۲۷۳) حاشیۃ ابن عابدین (۱۰/۵۸۸)۔

(۶) المحلی (۵/۲۳)

(۷) بدایۃ المجتہد، مصری قانون نے اسی کو اختیار کیا ہے (فقہ السنۃ ۲/۳۵۳)

(مسئلہ) بچے کے وارث ہونے کے لیے پورا زندہ نکلنا ضروری ہے اگر کچھ حصہ نکلے اور بچے میں اس وقت زندگی معلوم ہو (مثلاً آواز آئے یا چھینکے یا کسی طرح اس کا اظہار ہو) اور پورا نکلنے سے پہلے مرجائے، تو وراثت میں اور دوسرے احکام میں مردہ نکلے ہوئے بچے کی طرح ہوگا(۱)۔

احناف کے نزدیک اگر اکثر حصہ زندہ نکلے مگر پورا نکلنے سے پہلے مرجائے تو اس کی وراثت کے احکام جاری ہوں گے۔(۲)

ظاہریہ کے نزدیک تھوڑا سا حصہ بھی نکلتے وقت جان ہو تو وہ وارث ہوگا اور اس کے وارث ہوں گے(۳)۔

حمل کی وراثت سے متعلق چند مسائل:

۱- اس پر اجماع ہے کہ باپ کے انتقال کے وقت بچہ ماں کے پیٹ میں ہے تو وہ اپنے باپ کا وارث ہوگا۔ پیچھے یہ بات گزر چکی ہے۔

۲- کسی شخص کا انتقال ہو جائے، اس کے پیچھے بیوی، باپ اور ماں ہو، اور ماں حاملہ ہو، لیکن وہ حمل اس کے باپ کا نہ ہو، تو اس صورت میں پیٹ کے بچے کے لیے اس شخص کی میراث میں سے کچھ نہیں ملے گا، اس لیے کہ وہ بچہ اس کا ماں شریک بھائی (یا بہن) ہوگا، اور ماں شریک بھائی اصل وارث کی موجودگی میں (جو یہاں باپ ہے) وارث نہیں ہوتے۔

۳- اگر پیٹ کا بچہ ہی وارث ہو رہا ہو اور اس کے ساتھ دوسرا وارث نہ ہو یا اِس کی وجہ سے وہ محجوب ہو رہا ہو، تو یہ ترکہ اس کے پیدا ہونے تک روک دیا جائے گا، تقسیم نہیں ہوگا۔

۴- ہر وہ وارث جس کے حصے میں حمل کے لڑکا یا لڑکی ہونے کی وجہ سے فرق نہ پڑے، اس کو اس کا پورا حصہ دے دیا جائے گا، اور بقیہ حصہ بچے کی پیدائش تک روک دیا جائے گا۔ جیسے کوئی شخص

---

(۱) روضۃ الطالبین (۶/ ۳۷)۔

(۲) المبسوط (۳۰/ ۶۰) حاشیۃ ابن عابدین (۱۰/ ۵۵۸)۔

(۳) المحلی لابن حزم (۸/ ۳۴۳)۔

حاملہ بیوی اور دادی یا نانی کو چھوڑ کر مر جائے، تو دادی یا نانی کو اسی وقت اس کی میراث کا چھٹا حصہ دے دیا جائے گا، اس لیے کہ اس کا حصہ اتنا ہی رہے گا، خواہ پیٹ کا بچہ لڑکا پیدا ہو یا لڑکی، تو دادی یا نانی کے حصے کو روکنے کا حق حاصل نہیں۔

۵- وہ وارث جس کے حصے میں پیٹ کے بچے کے لڑکا یا لڑکی ہونے کی وجہ سے فرق پڑتا ہو تو اس وقت اس کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا استحقاق ابھی صحیح معلوم نہیں، مثلاً کسی کا انتقال ہو جائے اور اس کے پیچھے اس کی حاملہ بیوی اور بھائی ہو۔ تو بھائی کو کچھ نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ جو بچہ پیدا ہو وہ لڑکا ہو، اس لیے کہ اگر لڑکا ہو تو اس کو کچھ نہیں ملتا، جمہور کا یہی مسلک ہے۔

۶- ذوی الفروض (۱) میں سے جن کا حصہ پیٹ کے بچے کے لڑکا یا لڑکی ہونے کی وجہ سے بدل جاتا ہو، تو اس کو دو حصوں میں سے کم حصہ دیا جائے گا، اور حمل کے لیے زیادہ حصہ روک دیا جائے گا، تو اگر یہ بچہ زندہ پیدا ہو جائے جب کہ وہ زیادہ حصے کا مستحق ہو تو وہ زیادہ حصہ جو روک دیا گیا تھا وہ اس کو ملے گا، اور اگر وہ زیادہ حصہ کا مستحق نہیں بلکہ دو میں سے کم تر حصے کا مستحق ہو تو استحقاق کے بقدر کم تر حصے کا وہ حق دار ہوگا، اور بقیہ وارث کو لوٹا دیا جائے گا، اگر اس صورت مین بچہ مردہ حالت میں پیدا ہو جائے تو اس کو کچھ نہیں ملے گا اور پورا ترکہ دوسرے تمام وارثوں پر تقسیم کیا جائے گا۔ (۲)

(نوٹ) پیٹ کے بچے کی وراثت کے مسائل بہت نازک ہیں، بہت احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں، اس لیے اس کے بارے میں بہت محتاط ہونا چاہیے، خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ کوتاہی کی وجہ سے میراث ہڑپ کرنے کے مجرم قرار پائیں، جس کی سزا بہت سخت ہے۔

---

(۱) ذوی الفروض یا اصحاب الفروض وہ وارث کہلاتے ہیں جن کا حصہ خاص مقدار کے ساتھ متعین ہو، نصف، چوتھائی، آٹھواں حصہ، دو تہائی، ایک تہائی، چھٹا حصہ، ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں، فرائض کی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

(۲) یہ تمام مسائل اصل فقہ السنۃ (۳۵۴/۴) سے مأخوذ ہیں، کچھ توضیحات ہماری طرف سے ہیں۔

اکیسواں باب

بلوغ اور اس کے احکام

بچہ جیسے جیسے عمر میں آگے بڑھتا ہے اس کی جسمانی طاقت بھی بڑھتی ہے دماغی قوت اور فکری صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور جوانی کے جذبات آہستہ آہستہ اس کے اندر پیدا ہونے لگتے ہیں، اسلام نے اسی لحاظ سے اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے۔

دس سال کی عمر میں ایمان کا وجوب:

دس سال کی عمر میں شعور میں کچھ پختگی پیدا ہوتی ہے اور فکری صلاحیت میں پہلے سے خاصا اضافہ ہوتا ہے، اس لیے اکثر فقہاء کے نزدیک اس عمر میں ایمان اس کے لیے ضروری ہے، اگرچہ شریعت کے احکام اس کے لیے ضروری نہیں ہوتے۔ لیکن اللہ کو پہچاننے کی صلاحیت اس میں ہوتی ہے، اس لیے ایمان وعقیدے کے خلاف کسی بات یا کسی کام پر اس کو سزا دینا ضروری ہے۔(۱)۔

دس سال کی عمر میں احکام کی تاکید:

بلوغ سے پہلے کسی حکم کی پابندی ایسی ضروری نہیں ہے کہ اس کو نہ کرنے سے اس کو عذاب ہو، یا کسی غلطی پر اس کا گناہ لکھا جائے، لیکن اس کے ماں باپ پر اور اس کے ولی پر ضروری ہے کہ اس کو ضروری باتیں سکھا دیں، یہاں تک کہ نماز نہ پڑھنے پر اس کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ مفصل گزر چکا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے شرعی احکام سے بھی اس کو واقف کرایا جائے اور جھوٹ، غیبت، زنا، لواطت وغیرہ کی حرمت اس کو سمجھا دی جائے، (۲)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر والدین نے نہیں بتایا اور اس کی وجہ سے وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوا تو اس کا گناہ والدین کو ہوگا۔

(۱) دیکھیے تحفۃ المودود (ص:۲۳۴)۔
(۲) دیکھیے المجموع (۱۱/۳)۔

دس سال کی عمر میں بستر الگ کرنے کا حکم:

اور خاص طور پر رسول اللہ ﷺ نے اس کی تاکید کی ہے کہ بچے جب دس سال کے ہو جائیں تو ان کو الگ الگ بستر پر سلایا جائے۔ (نماز کا حکم دینے کے سلسلے میں یہ حدیث گزر چکی ہے) اس لیے کہ دس سال کی عمر بلوغ اور عدمِ بلوغ کے درمیان حد فاصل ہے، بلوغ سے پہلے کے اس زمانے کو مراہقت کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس کی خاص حیثیت ہوتی ہے، اس لیے اس کو خاص درجہ دیا گیا ہے۔ اس عمر میں شہوت اپنے بال و پر نکالنے لگتی ہے، اور آہستہ آہستہ خفیہ طور پر آگے بڑھتی ہے، تو خطرہ ہوتا ہے کہ ساتھ لیٹنا کسی ایسی برائی کا سبب نہ بن جائے، پس بگاڑ آنے سے پہلے ہی بند باندھنے کی ضرورت تھی۔ اسی حکمت کی بنیاد پر دس سال کی عمر میں بستر الگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ (۱)۔

اگر چہ خاص بھائیوں کے درمیان اس طرح کا خطرہ کم سے کم ہوتا ہے، پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے اس کی تاکید کی کہ کوئی ایسا موقع ہی فراہم نہ کیا جائے جہاں نفس کو آزاد ہونے یا شیطان کو بیچ میں داخل ہونے کا موقع ملے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح کی باتوں سے کس حد تک بچوں کو دور رکھنا چاہتے تھے۔ جب گھر کے اپنے بچوں کے ساتھ یہ معاملہ ہونا چاہیے تو اس عمر کے بچوں کو کہیں رات گزارنے کا موقع دینا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے! اور پھر مخلوط تعلیم کے مضر اثرات کا کون عقلمند انکار کر سکتا ہے!!

بلوغ کی علامتیں:

بلوغ کی بہت سی علامتیں ہو سکتی ہیں، دو علامتیں شرعی طور پر ثابت ہیں، پہلی علامت احتلام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ یا أیها الذین آمنوا لیستأذنکم الذین

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ (۱/۵۲۹)۔

ملکت أیمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات﴾ (النور:۵۸)۔اے ایمان والو تمھارے غلاموں کو اور تمھارے ان بچوں کو جو ابھی احتلام کی عمر کو نہیں پہنچے، تین موقعوں پر اجازت لینی چاہیے: فجر کی نماز سے پہلے، اور دوپہر کو جب تم کپڑے اتار کر رکھتے ہو (یعنی قیلولہ کرنے کے لیے) اور عشاء کی نماز کے بعد، یہ تین تمھارے پردے کے اوقات ہیں، ان کے علاوہ دوسرے اوقات میں ان کے تمھارے پاس آنے جانے میں کسی پر کوئی گناہ نہیں۔ایک دوسرے کے پاس بار بار آنے جانے کی ضرورت پڑتی ہی ہے، اس طرح اللہ اپنے احکام کو تم سے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہوش سے کام ہو۔

اگلی آیت میں ہے:﴿وإذا بلغ الأطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلهم﴾ (النور:۵۹)اور جب تم میں سے بچے احتلام کو پہنچ جائیں، تو ان کو اسی طرح اجازت لینی چاہیے، جس طرح دوسرے لوگ اجازت لیتے ہیں، یعنی تمام اوقات میں۔

ان دونوں آیتوں میں گھر میں داخل ہونے کے احکام بتائے جا رہے ہیں اور اس میں بچوں اور بڑوں میں فرق رکھا گیا ہے، اور احتلام پر بچوں اور بڑوں کے حکم کو یکساں بتایا گیا ہے جس سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ احتلام کا ہونا بالغ ہونے کی علامت ہے۔اور یہ قریب ہی حدیث گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: تین طرح کے لوگ مرفوع القلم ہیں (یعنی جن کا مؤاخذہ نہیں کیا جا سکتا) ان میں سے ایک بچہ ہے، جب تک کہ احتلام نہ ہو۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو حکم دیا کہ احتلام کی عمر کو پہنچنے پر ہر شخص سے ایک دینار جزیہ لیں (۱)۔ان

(۱) ابوداؤد (۱۵۷۶) ترمذی (۶۲۳) نسائی (۲۴۵۰-۲۴۵۱) احمد (۵/۲۳۰) صحیح ابن خزیمہ (۲۲۶۸) اور متعدد محدثین نے اس کو روایت کیا ہے

حدیثوں سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احتلام کو بلوغ کی علامت قرار دیا۔ احتلام کی کوئی عمر متعین نہیں، موسم اور بچوں کے مزاج پر اس کا انحصار ہے، کسی بچے کو بارہ سال کی عمر میں بھی ہوسکتا ہے اور ایسے بھی بچے ہوتے ہیں کہ پندرہ سولہ سال کی عمر ہوجاتی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑے ہوچکے ہوتے ہیں اور احتلام نہیں ہوتا، اسی وجہ سے فقہاء کا اس میں اختلاف ہوا ہے، کہ احتلام نہ ہونے کی صورت میں کس عمر کو بلوغ کی عمر مانا جائے گا، فقیہِ اہل شام امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد اور ائمہٗ احناف میں امام ابو یوسف اور امام محمد کا کہنا ہے کہ پندرہ سال جب مکمل ہوجائیں تو اس کو بالغ قرار دیا جائے گا۔(۱)

امام مالک کا اصل قول بھی یہی ہے، مگر مالکیہ کے نزدیک اس کے علاوہ دو اقوال اور ہیں، ایک سترہ سال کا اور دوسرا قول اٹھارہ سال کا ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے بھی یہی دونوں قول نقل کیے گئے ہیں۔ اور لڑکی کے سلسلے مین ان کا قول سترہ سال کا ہے۔ امام داؤد ظاہری اور ان کے اصحاب کا کہنا ہے کہ عمر کی کوئی قید نہیں احتلام کا اعتبار ہوگا۔(۲)

(۱) ان حضرات کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد کے دن مجھے جنگ میں شرکت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا، جب کہ میری عمر چودہ برس کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، پھر خندق کے موقع پر پیش کیا گیا جب کہ میری عمر پندرہ برس کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دے دی، (بخاری، رقم: ۲۶۶۴۔ مسلم (۱۸۶۸) راوی نے آگے بیان کیا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت عمر بن عبدالعزیز کو سنائی تو انھوں نے کہا کہ یہ بڑے اور چھوٹے کے درمیان کی حد ہے، اور اپنے گورنروں کو لکھ بھیجا کہ جن کی عمر پندرہ سال کی ہے ان کا روزینہ مقرر کرو، اور جو پندرہ سال سے کم کے ہیں ان کو بچوں کے حساب میں رکھو۔

(۲) تحفۃ المودود لابن القیم (ص: ۲۳۵) امام ابن قیم نے اس قول کو قوی قرار دیا ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر کی کوئی قید نہیں لگائی ہے، بلکہ احتلام کو علامت قرار دیا ہے۔ بہ ظاہر تو یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن غور کرنے سے یہ قول بہت کمزور معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو احتلام ہی نہیں ہوتا تو کیا ایسے لوگ احکامِ شریعت کے کبھی مکلف نہیں ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔

دوسری علامت جس کی حدیث میں صراحت ہے، وہ زیرِ ناف بالوں کا اگنا ہے۔ عطیہ قرظی کی حدیث ہے کہ غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر (یہودیوں کی تجویز پر) حضرت کے سعد بن معاذ کے فیصلے کے مطابق جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنگجوؤں کو قتل کرنے کا حکم دیا، تو جس کے زیرِ ناف بال تھے اس کو قتل کیا گیا اور جس کے بال نہیں اگے تھے اس کو بچوں کے شامل کیا گیا، اور جان بخشی کی گئی، اسی وجہ سے میری جان بھی بچی کہ میرے ابھی بال نہیں اگے تھے۔ (۳)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کا عمل اسی کے مطابق رہا، وہ اس کو بلوغ کی علامت سمجھتے رہے، چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی لوگوں سے جزیہ لینے کا حکم دیا (۱)۔ اور انھوں نے (۲) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے (۳) اسی بنیاد پر فیصلہ کیا، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسی کے مطابق فتوی دیا (۴)۔

حنبلی اور مالکی مذہب یہی ہے اور امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے (اور یہی شافعی مذہب ہے) مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں (۵)۔

یہ تین چیزیں یعنی احتلام، عمر اور زیر ناف بالوں کا اگنا، لڑکا اور لڑکی دونوں میں اس کا اعتبار ہوگا۔ لڑکی میں دو باتیں اور ہیں: حیض کا آنا (۶) اور حمل کا پایا جانا، اس لیے کہ

---

(۱) ابو داؤد (۴۴۰۴، ۴۴۰۵) ترمذی (۱۵۸۴)، نسائی (۳۴۲۹، ۳۴۳) وابن ماجہ (۲۵۴۱) احمد (۴/۳۱۰، و۳۸۳، ۵/۳۱۱۔ ۳۱۲ و ۳۱۲۔

(۲) مصنف عبدالرزاق ۶/۸۵ (۶/۶۹) و (۱۰/۳۲۸، ۳۳۰) و (۹/۵۵۵، ۵۵۷)، السنن الکبریٰ للبیہقی (۹/۱۹۵) و (۹/۳۲۹)۔

(۳) مصنف عبدالرزاق (۷/۳۳۸) وسنن کبریٰ للبیہقی (۶/۵۸،) و (۶/۹۷)۔

(۳) أیضاً۔ (۴) سنن کبریٰ بیہقی (۶/۵۸) و (۶/۹۷)۔

(۵) تحفۃ المودود، (ص: ۲۳۶)۔ (۶) دیکھیے ابوداؤد (۴۱۰۴)۔

حمل بغیر بلوغ کے ہو نہیں سکتا۔

اگر مخنث ہے یعنی اس میں مرد اور عورت دونوں کی علامتیں موجود ہیں، اگر اس کو حیض آتا ہے یا مردانہ عضو سے منی نکلتی ہے تو اس کے بلوغ کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ جس سے بلوغ کا پتا چل رہا ہے وہ اس کا اصل عضو نہ ہو زائد عضو ہو، ہاں اگر دونوں اعضا سے اس کا ثبوت مل رہا ہے یعنی حیض اور مردانہ عضو سے منی بھی نکلے، تب اس کے بلوغ کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اگر مرد تھا تو منی سے اس کی علامت ظاہر ہوئی اور عورت ہے تو حیض سے اس کا ثبوت ملا (۱)۔

احکام کا مکلف ہونا:

بلوغ کے بعد بچہ تمام احکام کا مکلّف ہوگا۔ یعنی ہر حکم کی پابندی اس کے لیے لازمی ہوگی، کوتاہی پر گناہ ہوگا، اور دنیاوی سزاؤں کا مستحق ہوگا؛ اس لیے بلوغ سے پہلے ہی تمام احکام کا پابند بنانا چاہیے، تاکہ بلوغ کے بعد کوتاہی کا خیال بھی نہ آئے، اور بلوغ کو پہنچتے پہنچتے احکام پر عمل کرنے میں پختہ ہو جائے۔ خاص طور پر کسی کے یہاں آنے جانے اور پردے کے معاملے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ جیسا کہ سورہ نور کی آیتِ بالا میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ اس عمر میں تاکید نہیں کی گئی تو بڑا ہونے کے بعد بھی بے احتیاطی باقی رہتی ہے، بلکہ اس کے گناہ ہونے کا تصور بھی دل میں نہیں ہوتا۔

بالغ ہونے پر شادی کرانے کی تاکید:

اب اخیر میں اس بچے کی شادی کا تذکرہ، جس کے لیے اس کے والدین اس کی پیدائش سے لے کر بڑا ہونے تک فکر مند رہے، اور اس کی وجہ سے بہت سے احکام کے خود

(۱) دیکھیے المہذب للشیرازی (۳۳۸/۱)

پابند رہے، اور بہت سی ذمے داریاں ان پر رہیں، اب ذمے داریوں کا بوجھ وہ اپنے بچے کے کاندھوں پر رکھ کر سبک دوش ہوا چاہتے ہیں۔ پھر ایک باپ یا ماں ہونے کی وجہ سے خود اس پر وہ ذمے داریاں عائد ہوں گی جو اس کی وجہ سے اس کے ماں باپ پر تھیں؛ مگر ہاں بالغ ہونے کے بعد والدین پر بچے کے سلسلے میں ایک اہم ذمے داری باقی رہتی ہے، جس کو ہم بچے کے سلسلے میں والدین کی آخری ذمے داری کہہ سکتے ہیں۔ بس اب آخری حکم یہ ہے کہ بچے کے بالغ ہونے کے ساتھ وہ اس کی شادی کی فکر کریں۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ اس بچے کی وجہ سے ان کو گناہ کا بوجھ لادنا پڑے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے یہاں کوئی اولاد پیدا ہو تو اس کو چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اچھا ادب سکھائے (اچھی تعلیم دے) اور جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کی شادی کرادے۔ تو اگر وہ بالغ ہوجائے اور وہ اس کی شادی نہ کرے، پھر اس سے کوئی گناہ ہوجائے تو اس کے گناہ کا وبال اس کے باپ پر ہوگا (۱)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تورات میں لکھا ہے کہ جس کی لڑکی بارہ سال کی عمر کو پہنچ جائے اور وہ اس کی شادی نہ کرے، پھر اس سے کوئی گناہ ہوجائے تو اس کے گناہ کا وبال اس کے باپ پر ہوگا (۲)۔

نیز قتادہ فرماتے ہیں: بزرگ لوگ کہتے تھے کہ بچہ جب بالغ ہوجائے، اور اس کا باپ اس کی شادی نہ کرائے، پھر لڑکا بدکاری کا ارتکاب کرے، تو باپ کو گناہ ہوگا (۳)۔

---

(۱) شعب الإیمان للبیہقی (۱۱/۱۳۷)۔ (۲) شعب الإیمان ۱۱/۱۳۹۔

(۳) العیال لابن أبي الدنیا، رقم: ۱۷۲۔

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنے بچوں کو قرآن پڑھالیا اور حج کرادیا، اوران کی شادی کرادی تو میں نے ان کا حق ادا کردیا، اب میرا حق ان پر باقی ہے۔(۱)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ جس کو اولاد دے تو اس کو چاہیے کہ اس کا نام اچھا رکھے، اس کو اچھی تعلیم دے، اچھے اخلاق سکھائے، اور بالغ ہونے پر اس کی شادی کرادے۔(۲)۔

ایک بڑے ثقہ راوی حدیث عبداللہ بن اُبی حسین مکی جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، فرماتے ہیں: سلف کا یہ حال تھا کہ جب ان کا کوئی لڑکا بلوغ کو پہنچتا تو اس سے وہ نکاح کی پیش کش کرتے، قبول کرتا تو اس کا نکاح کرادیتے، ورنہ اس کو اتنا مال دیتے جس سے وہ نکاح کرسکے، اور کہتے کہ تم اپنی ضرورت کو زیادہ سمجھتے ہو۔(۳)۔ یعنی ہم کیا اصرار کریں، تم کو شادی کی ضرورت ہے یا نہیں تم اس کو زیادہ جانتے ہو۔

ان حدیثوں اور صحابہ وتابعین کے آثار سے بلوغ کے بعد شادی کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔ اگر لڑکے یا لڑکی کا چال چلن ٹھیک تھا، اس لیے باپ نے اس کی شادی کی جلدی نہیں کی، پھر اس لڑکے یا لڑکی سے گناہ (بدکاری) ہوجائے تو انشاء اللہ اس کے باپ پر اس کا وبال نہیں ہوگا۔ یا شادی کی فکر تو اس نے کی، مگر مناسب رشتہ نہ ملا اور وہ اسی فکر میں تھا، اس دوران میں لڑکے یا لڑکی سے گناہ ہوجائے، اس صورت میں بھی باپ بے قصور ہوگا، اور اس کو گناہ نہیں ہوگا۔ سارا گناہ غلط کام کرنے والے لڑکے یا لڑکی پر ہوگا۔ باپ پر وبال

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ (۱۳/۴۱۶) والعیال، رقم: ۱۷۰ و ۳۱۲)۔

(۲) العیال (رقم: ۱۷۳)۔

(۳) ایضاً (رقم: ۱۷۴)

صرف اسی صورت میں معلوم ہوتا ہے جب لڑکا یا لڑکی شادی کا تقاضا کریں، زبان سے کریں یا اپنے عمل وسلوک سے کریں، پھر بھی باپ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، اور معاملہ ٹالتا رہا، تو اگر اس حالت میں اس لڑکے یا لڑکی سے گناہ ہوتا ہے تو کرنے والے کو تو جو گناہ ہوگا وہ تو ہوگا، مگر باپ پر بھی اس گناہ کا وبال ہوگا۔ اس پوری تفصیل کی دلیل قرآن مجید کی آیت ﴿لا یکلف الله نفسا إلا وسعها﴾ (بقرة:۲۸۶) یعنی اللہ کسی جان پر اس سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، جو اس کے بس میں نہ ہو۔

شادی کی تاخیر کی وجہ سے آج معاشرے میں جو برائیاں پنپ رہی ہیں اس کا واحد علاج یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے شادی میں جلدی کی جائے۔

والله اعلم بالصواب، وبه تم الكتاب

وصلى الله على نبيه الكريم وأله وصحبه أجمعين

والحمد لله أولا وأخرا

فہرست مصادر ومراجع

قرآن و تفسیر

۱	قرآن مجید
۲	احکام القرآن للجصاص ۔ ابو بکر احمد بن علی الرازی۔ دار الفکر،بیروت
۳	تفسیر الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (م۳۱۰)۔ تحقیق: أحمد محمد شاکر، ومحمود شاکر۔ مؤسسة الرسالة، بیروت۔ الطبعة الأولی: ۱٤۲۰-۲۰۰۰ء۔
۴	تفسیر القرطبی (الجامع لأحکام القرآن) لمحمد بن احمد القرطبی(م۶۷۱)، تحقیق: عبدالرزاق المهدی، دار الکتاب العربی، بیروت۔ ۱٤۲۹-۲۰۰۸ء۔
۵	التفسیر الکبیر للرازی، فخر الدین محمد بن عمر الرازی (م۶۰۶)، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعةالأولی ۱٤۲۱- ۲۰۰۰ء۔

حدیث

۶	الأدب المفرد۔ للإمام محمد بن اسماعیل البخاری(م۲۵۶) تخریج:محمود شاکر ۔مؤسسة التاریخ العربی ۔بیروت۔الطبعة الأولیٰ۱٤۲۵-۲۰۰۵ء
۷	الأذکار للنووی۔ تحقیق:عامر بن علی یاسین۔ دار ابن خزیمة، الریاض۔ ۱٤۲۲-۲۰۰۱م

۸	الاستذكار۔ ابن عبدالبر (م٤٦٣)۔ تحقيق:حسان عبدالمنان۔ د۔محمود احمد القيسية۔ مؤسسة النداء، ابو ظبی۔ الطبعة الرابعة ١٤٢٣ -٢٠٠٣ء
۹	البحر الزخار المعروف بمسند البزار۔ أبو بكر احمد بن عمرو بن الخالق البزار۔ تحقيق:د۔محفوظ الرحمن زين الله۔ مكتبة العلوم والحكم بالمدينة المنورة۔ الطبعة الأولى:١٤٠٩-١٩٨٨ء
۱۰	البر والصلة (عن ابن المبارك وغيره) للحسين بن الحسن بن حرب المروزی۔ تحقيق:د۔محمد سعيد نجاری۔ دار الوطن الرياض۔ ١٤١٩
۱۱	تحفة الاحوذی۔عبد الرحمن مباركپوری ، تحقيق: علی محمد معوذ۔ عادل احمد عبدالموجود۔ دار إحياء التراث العربی ، بيروت۔
۱۲	تلخيص الحبيرفی تخريج أحاديث الرافعی الكبير، ابن حجر العسقلانی۔ تحقيق: السيد عبدالله هاشم اليمانی المدنی، المدينة المنورة ۔ ١٣٨٤ - ١٩٦٤ء۔
۱۳	التمهيد لا بن عبدالبر۔ تحقيق: الأستاذ مصطفی بن احمد العلوي، و الاستاذ محمد عبدالكبير البكری۔ ١٣٨٧ - ١٩٦٧ء۔
۱۴	الجامع الصغير فی أحاديث البشير النذير، للسيوطی۔دار الكتب العلمية، بيروت۔ الطبعة الثانية :١٤٢٥ - ٢٠٠٤ء۔
۱۵	جامع العلوم والحكم، لابن رجب (زين الدين أبی الفرج عبدالرحمن بن شهاب الدين البغدادی) (م٧٩٥)۔ تحقيق: شعيب الأرنؤوط، ابراهيم باجس۔ دارة الملك عبدالعزيز، الرياض۔ الطبعة التاسعة: ١٤٢٣ - ٢٠٠٢ء۔
۱۶	ذم الملاهی (فی مجموعة رسائل ابن أبی الدنيا) ابو بكر عبدالله بن محمد البغدادی (م٢٨١) ۔ المنتدی الإسلامی الشارقة۔

۱۷	سبل السلام الموصلة إلى بلوغ المرام، محمد بن إسماعيل الأمير الصنعاني۔ تحقيق:محمد صبحي حسن حلاق۔ دار ابن الجوزي۔ الطبعة السابعة ١٤٢٧۔
۱۸	سلسلة الأحاديث الصحيحة۔ محمد ناصر الدين الألبانی۔ مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض۔ ١٤١٥- ١٩٩٥ء۔
۱۹	سنن ابن ماجه ،لابن ماجه (محمد بن يزيد بن ماجه القزوينی، م۲۷۳)مكتبة الرشد الرياض۔ الطبعة الأولى ١٤٢٦- ٢٠٠٥ء۔
۲۰	سنن ابی داؤد،لأبی داؤد(سليمان بن اشعث السجستانی، م۲۷۵)مكتبة الرشد، الرياض۔ الطبعة الأولى ١٤٢٦- ٢٠٠٥ء۔
۲۱	سنن الترمذی، محمد بن عيسى الترمذی (م۲۷۹)۔ مكتبة الرشد، الرياض۔ الطبعة الأولى ١٤٢٦- ٢٠٠٥ء۔
۲۲	سنن الدارمی۔ عبدالله بن بهرام الدارمی (م ٢٥٥)۔ تحقيق: عبدالغنی مستو۔ المكتبة العصرية، صيدا، بيروت۔
۲۳	سنن الدار قطنی۔ علی بن عمر الدار قطنی (م٣٨٥)تحقيق: عبدالغنی مستو۔ المكتبة العصرية، صيدا، بيروت۔
۲۴	سنن سعيد بن منصور۔ للإمام سعيد بن منصور الخراسانی المكی، (م٢٢٧) تحقيق:حبيب الرحمن الأعظمي۔دار الكتب العلمية، بيروت۔
۲۵	سنن سعيد بن منصور (قسم فضائل القرآن)، تحقيق:د۔سعد بن عبدالله بن عبدالعزيز الحميد۔الطبعة الأولى: دار الصميعی۔ الرياض۔

۲۶	السنن الكبرى للبيهقي۔ احمد بن الحسين البيهقی۔ تحقيق: عبدالقا ر عطا۔ دار الكتب العلمية، بيروت۔الطبعة الثالثة: ١٤٢٤۔ ٢٠٠٣ء۔
۲۷	السنن الكبرى للنسائی، احمد بن شعيب النسائی (م٣٠٣)۔ تحقيق:عبدالغفار سليمان البغدادی، وسيد كسروی حسن، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان۔ الطبعة الأولى ١٤١١ھ- ١٩٩١ء۔
۲۸	سنن النسائی۔ احمد بن شعيب النسائی۔ مكتبة الرشد، الرياض۔ الطبعة الأولى ١٤٢٦ھ- ٢٠٠٥ء۔
۲۹	شرح السنة للبغوی، أبی محمد الحسين بن مسعود الفراء البغوی، (م٥١٦) تحقيق:شعيب الأرنؤوط، المكتب الإسلامی، بيروت۔ الطبعة الأولى: ١٤٠٣
۳۰	شرح الطيبي على مشكاة المصابيح۔ شرف الدين حسين بن محمد بن عبدالله الطيبی (م٧٤٣)۔ تحقيق: ابو عبدالله محمد على سمك۔ دار الكتب العلمية۔ الطبعة الأولى:١٤٢٢-٢٠٠١ء
۳۱	شرح مسلم للنووی۔ محی الدين يحيی بن شرف النووی (م٦٧٦)۔ تحقيق: خليل مأمون شيحا۔ دار المعرفة۔ بيروت۔ ١٤٢٨-٢٠٠٧ء
۳۲	شعب الإيمان للبيهقی، تحقيق: د۔عبدالعلی عبدالحميد حامد، الطبعة الثانية: ١٤٢٤- ٢٠٠٤ء۔ مكتبة الرشد، الرياض۔
۳۳	صحيح ابن حبان (الإحسان فی تقريب صحيح ابن حبان) ۔ للإمام محمد بن حبان التميمی البستی (م٣٥٤)، تحقيق: شعيب الأرنووط، الطبعة الأولى: ١٤٨٠-١٩٨٨ء۔ مؤسسة الرسالة، بيروت۔

۳۴	صحیح ابن خزیمه، لأبی بکر محمد بن إسحاق بن خزیمة النیسابوری (م ۳۱۱)۔ تحقیق: د محمد مصطفی الأعظمی۔ المکتب الإسلامی ، الطبعة الثالثة، ۱٤۲٤ - ۲۰۰۳ء۔
۳۵	صحیح البخاری۔ للإمام محمد بن اسماعیل البخاری (م۲۵٦)۔مکتبة الرشد، الریاض۔ الطبعة الأولی ۱٤۲٦- ۲۰۰۵ء۔
۳٦	صحیح مسلم ۔ للإمام مسلم بن الحجاج القشیری (م۲٦۱)۔ مکتبة الرشد، الریاض۔ الطبعة الأولی ۱٤۲٦- ۲۰۰۵ء۔
۳۷	عمل الیوم واللیة، لابن السنی(ابی بکر احمد بن محمد بن اسحاق الدینوری) م ۳٦٤ ۔ تحقیق:حامد احمد الطاهر۔ المکتب الثقافی۔ القاهرة۔ ۱٤۲۵-۲۰۰٤ء۔
۳۸	الـ یال لابن أبی الدنیا۔(فی مجموعة رسائل ابن أبی الدنیا) ابی بکر عبدالله بن محمد (م۲۸۱) ۔ المنتدی الإسلامی الشارقة۔
۳۹	فتح الباری بشرح صحیح البخاری، لابن حجر (م۸۵۲)۔ تحقیق: نضر محمد الفاریابی۔ دار طیبة، الریاض۔ الطبعة الأولی:۱٤۲۷-۲۰۰٦ء
۴۰	فضائل القرآن لأبی عبیدالقاسم بن سلام الهروی(م۲۲٤)، تحقیق:مروان العطیة، محسن خرابة، وفاء تقی الدین، دار ابن کثیر، دمشق بیروت۔
۴۱	فیض القدیر شرح الجامع الصغیر من أحادیث البشیر النذیر، للمناوی (محمد عبدالرؤف المناوی (م۱۰۳۱)۔ دار الفکر للطباعة والنشر والتوزیع۔ الطبعة الأولی ۱٤۱٦ - ۱۹۹٦ء۔

۴۲	قیام رمضان (المختصر) لمحمد بن نصر المروزی (م۲۹٤)، اختصار: تقی الدین احمد بن عبدالقادر المقریزی (م٨٤٥)، تعلیق: محمد حسن محمد حسن إسماعیل۔ دار الكتب العلمية، بيروت۔ الطبعة الأولى: ١٤٢٥-٢٠٠٤ء۔
۴۳	كشف الأستار عن زوائد البزار،نور الدين على بن ابى بكرالهيثمى ۔ تحقيق: حبيب الرحمن الاعظمى۔ الطبعة الأولى: ١٤٠٥ھ – ١٩٨٥ء۔ مؤسسة الرسالة، بيروت
۴۴	مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، نورالدين على بن ابى بكر الهيثمى، (م٨٠٧) دار الكتب العلمية، بيروت۔١٤٠٨-١٩٨٨ء
۴۵	كتاب المراسيل لابى داؤد۔ تحقيق: احمد حسن جابر رجب۔ رمضان١٤٠٩۔
۴۶	مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح۔ لعلى بن سلطان القارى (م١٠١٤) تحقيق:جمال عيتانى۔ دار الكتب العلمية بيروت لبنان ١٤٢٢-٢٠٠١م
۴۷	المستدرك على الصحيحين للحاكم أبى عبدالله النيسابورى (م٤٠٥)، ترقيم الصفحات مطابق لنسخة دار المعارف، حيدر آباد، دكن، الهند۔
۴۸	مسند أحمد۔ لاحمد بن حنبل الشيبانى (م٢٤١)۔النسخة الميمنية۔
۴۹	مسند أبى يعلى، ابى يعلى احمد بن على الموصلى (م٣٠٧)، تحقيق:مصطفى عبدالقادر عطا۔ مكتب عباس احمد الباز۔ مكة المكرمة۔ الطبعة الأولى: ١٤١٨-١٩٩٨ء

۵۰	مصنف ابن أبي شيبة۔ عبدالله بن محمد بن أبی شيبة۔ تحقيق:محمد عوامة۔ شركة دار القبلة۔ مؤسسة علوم القرآن۔ الطبعة الأولى:١٤٢٧ - ٢٠٠٦ء
۵۱	مصنف عبدالرزاق۔أبو بكر عبدالرزاق بن الهمام الصنعانی۔ تحقيق:أيمن نصر الدين الأزهري۔ دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة الأولى:١٤٢١-٢٠٠٠
۵۲	معالم السنن-شرح سنن أبی داؤد۔ للإمام أبی سليمان حمد بن محمد الخطابی (م٣٨٨)۔ دار الكتب العلمية، بيروت۔ ١٤١١-١٩٩١ء
۵۳	المعجم الأوسط۔للطبرانی، أبی القاسم سليمان بن احمد الطبرانی (م٣٦٠)۔ تحقيق: محمد حسن محمد حسن إسماعيل الشافعی، دار الكتب العلمية ، بيروت۔الطبعة الأولى:١٤٢٠-١٩٩٩ء
۵۴	المعجم الكبير للطبرانی، أبی القاسم سليمان بن احمد الطبرانی ۔ تحقيق: حمدی بن عبدالمجيد السلفی، دار إحياء التراث العربی، بيروت
۵۵	موطأ للإمام مالك بن أنس (م١٧٩)۔ تحقيق:محمد فؤاد عبدالباقی۔ دار الحديث القاهرة۔ ١٤٢٥-٢٠٠٤ء
۵۶	نيل الأوطارشرح منتقى الأخبار للشوكانی (محمد بن علی الشوكانی م١٢٥٥) تحقيق: انور الباز، دار الوفاء، المنصورة، القاهرة۔ الطبعة الأولى ١٤٢١- ٢٠٠١ء

فقه

۵۷	أحكام الإجهاض في الفقه الإسلامي۔ د۔إبراهيم بن محمد قاسم بن محمد رحيم۔ سلسلة إصدارات الحكمة۔ الطبعة الأولى:١٤٢٣-٢٠٠٢
۵۸	أحكام أهل الذمة لابن القيم۔ تحقيق:سيد عمران۔ دار الحديث القاهرة۔١٤٢٦-٢٠٠٦ء
۵۹	الاجماع لابن المنذر۔ أبي بكر محمد بن إبراهيم النيسابوري(م٣١٨) دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٦-٢٠٠٥ء
۶۰	الإشراف على مذاهب العلماء لابن المنذر، تحقيق:أبو حماد صغير أحمد الأنصاري۔ مكتبة مكة للثقافة، رأس الخيمة۔
۶۱	إعانة الطالبين على حل ألفاظ فتح المعين۔ للسيد أبي بكر بن محمد شطا الدمياطي۔ دار إحياء التراث العربي۔ بيروت۔
۶۲	الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف، على مذهب الإمام أحمد للمرداوي، علاء الدين ابي الحسن علي بن سليمان۔ تحقيق:محمد حامد الفقي۔ الطبعة الثانية۔ دار إحياء التراث العربي، بيروت
۶۳	اہم فقہی فیصلے۔اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔۲۰۰۱م
۶۴	البحر الرائق شرح كنز الدقائق۔ للشيخ زين الدين ابراهيم المعروف بابن نجيم المصري الحنفي (م٩٧٠) تحقيق:الشيخ زكريا عميرات۔ دار الكتب العلمية۔ ١٤١٨-١٩٩٧ء۔

۶۵	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع لعلاء الدین أبی بکر ابن سعود الکاسانی (م۵۸۲) تحقیق: محمد عدنان بن یاسین درویش۔ (عکسی ایڈیشن) مکتبة زکریا، دیوبند۔ ۱۴۱۹ - ۱۹۹۸ء
۶۶	بدایة المجتهد ونهایة المقتصد۔ لابن رشد محمد بن احمد القرطبی (م۵۹۵) تحقیق: ماجد الحموی۔ دار ابن حزم۔ بیروت۔ ۱۴۱۶ - ۱۹۹۵ء
۶۷	تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، للإمام فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی (م۷۴۳) تحقیق:احمد عزو عنایة۔ دار الکتب العلمیة۔ بیروت۔ ۱۴۲۰ - ۲۰۰۰م
۶۸	تحفة الفقهاء لعلاء الدین السمرقندی۔ دار الکتب العلمیة، بیروت۔ ۱۴۱۴ - ۱۹۹۳ء
۶۹	تحفة المودود لأحکام المولود لابن القیم۔ تحقیق: بسام عبدالوهاب الجابی۔ دار البشائر الإسلامیة۔ بیروت۔ ۱۴۱۹ - ۱۹۹۸ء
۷۰	تکملة البحر الرائق (مع البحر الرائق) للشیخ محمد بن حسین الطوری (م۱۱۳۸)
۷۱	حاشیة الدسوقی علی شرح الکبیر، للشیخ شمس الدین محمد عرفة الدسوقی (علی الشرح الکبیر للدردیر)
۷۲	حاشیة الروض المربع۔ عبدالرحمن بن محمد بن قاسم العاصمی۔ المملکة العربیة السعودیة ، وزارة المعارف۔
۷۳	الحاوی الکبیر للماوردی، علی بن محمد الماوردی البصری، علی محمد معوض، وعادل أحمد عبدالموجود۔ دار الکتب العلمیة ۱۴۱۹ - ۱۹۹۹ء

۷۴	دراسات فقهية في قضايا طبية معاصرة۔ عمر سليمان الأشقر وآخرون۔ دار النفائس الأردن۔ الطبعة الأولى ١٤٢١-٢٠٠١ء
۷۵	الدر المختار محمد بن علاؤ الدين الحصكفي۔ (مع رد المحتار) تحقيق:عادل احمد عبدالموجود، على محمد معوض۔ دار الكتب العلمية، بيروت۔ الطبعة الثانية: ١٤٢٤-٢٠٠٣ء
۷۶	الذخيرة للقرافي ، شهاب الدين أحمد بن إدريس القرافي (م٩٨٤) تحقيق:الأستاذ محمد بوخبزة۔ دار الغرب الإسلامي۔ بيروت ١٩٩٤ء
۷۷	رد المحتار على الدر المختار لابن عابدين (م١٢٥٢)
۷۸	الرقية الشرعية من الكتاب والسنة النبوية۔ تأليف:ابى العالية محمد بن يوسف الجوراني۔ تعليق:د۔عمر سليمان الأشقر۔ دار النفائس۔ الأردن ١٤٢٧-٢٠٠٧م
۷۹	روضة الطالبين وعمدة المفتين، للنووى، المكتب الإسلامى، بيروت۔ الطبعة الثانية:١٤٠٥ھ-١٩٨٥ء۔
۸۰	الشرح الصغير على أقرب المسالك إلى مذهب الإمام مالك للدردير، أبى البركات أحمد بن محمد بن أحمد۔مصطفى البابى الحلوى، وشركاءه
۸۱	شرح فتح القدير، لابن الهمام (كمال الدين محمد بن عبدالواحد، م٦٨١) دار إحياء التراث العربى۔
۸۲	شرح منتهى الإرادات للبهوتى۔ رئاسة إدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد بالمملكة العربية السعودية۔

۸۳	العناية في شرح الهداية (بهامش فتح القدير) لمحمد بن محمود أكمل الدين البابرتي (م٧٨٦) دار إحياء التراث العربي، بيروت ، لبنان
۸۴	فتاوي اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء۔ جمع وترتيب: أحمد بن عبدالرزاق الدرويش۔ دار المؤيد۔ الطبعة الخامسة:١٤٢٤-٢٠٠٣ء
۸۵	الفتاوى الهندية۔ للشيخ نظام وجماعة من علماء الهند، دار الصادر بيروت
۸۶	الفقه الإسلامي وأدلته۔ د۔ وهبة الزحيلي۔ دار الفكر ۔ الطبعة الرابعة:١٤٢٥-٢٠٠٤م
۸۷	فقه السنة۔ السيد سابق۔ دار الفتح، للإعلام العربي القاهرة۔ الطبعة الثانية: ١٤١٩-١٩٩٦ء
۸۸	الفقه المنهجي على مذهب الإمام الشافعي۔ مصطفى الخن، مصطفى البغا، علي الشربجي۔ دارالقلم، دمشق۔ الطبعة الأولى:١٤٠٩-١٩٨٩ء
۸۹	القوانين الفقهية ، لابن جزى أبي عبدالله محمد بن أحمد بن محمد بن جزى الكلبي، دار الكتاب العربي۔ بيروت۔ ١٤٠٩-١٩٨٩ء
۹۰	كشاف القناع عن متن الإقناع، للشيخ منصور بن يونس ابن ادريس البهوتي۔ تعليق: الشيخ هلال مصيلحي۔ دار الفكر بيروت۔ ١٤٠٢-١٩٨٢ء
۹۱	المجموع شرح المهذب للشيرازي ،محيي الدين النووي۔تحقيق محمد نجيب المطيعي ۔ دار إحياء التراث العربي۔ ١٤٢٢-٢٠٠١م

۹۲	المبسوط، للإمام أبي بكر محمد بن أحمد بن أبي سهل السرخسي (م٤٩٠) تحقيق: محمد حسن محمد حسن إسماعيل الشافعي، دار الكتب العلمية۔ بيروت۔ ١٤٢١- ٢٠٠١ء
۹۳	المجمع الفقه الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے۔ تصحیح وترتیب: قاضی مجاہد الاسلام قاسمی۔اردو ترجمہ: محمد فہیم اختر ندوی۔اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔۲۰۰۱م
۹۴	مجموعة الفتاوى لابن تيمية (م٧٢٨) تحقيق:عامر الجزار، عامر الباز۔ مكتبة العبيكان۔ الرياض۔الطبعة الأولىٰ ١٤١٩-١٩٩٨م
۹۵	مراتب الاجماع لابن حزم۔ دار الكتب العلمية۔بيروت
۹۶	المحلىٰ لابن حزم الظاهري۔ تحقيق:د۔عبدالغفار سليمان البغدادي۔ دار الكتب العلمية، بيروت۔ ١٤٠٨-١٩٨٨ء
۹۷	المسائل الطبية المستجدة في ضوء الشريعة الإسلامية۔ د۔محمد بن عبدالجواد حجازي النتشة۔ سلسلة إصدارات دار الحكمة۔ ١٤٢٢- ٢٠٠١م
۹۸	المغني: لابن قدامه۔ تحقيق: عبدالله بن عبدالمحسن التركي۔ عبدالفتاح محمد الحلو۔ ١٤١٩ھ۔ ١٩٩٩ء
۹۹	مغني المحتاج۔محمد الشربيني۔ ١٣٧٧ھ - ١٩٨٥۔ مكتبة مصطفى البابي الحلبي
۱۰۰	المهذب في فقه الإمام الشافعي لأبي إسحاق إبراهيم بن علي الشيرازي، (م٤٧٦) دار المعرفة بيروت۔ ١٣٧٩-١٩٥٩م

۱۰۱	مواهب الجليل من أدلة الخليل۔ الشيخ أحمد المختار الشنقيطي۔ مراجعة:عبدالله إبراهيم الأنصاري۔ ادارة إحياء التراث الإسلامي، بدولة قطر۔ ۱۴۰۳- ۱۹۸۳ء
۱۰۲	الموسوعة الفقهية الكويتية۔ وزارة الاوقاف والشؤون الإسلامية۔ ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۳ء۔
۱۰۳	نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج۔ لشمس الدين محمد بن أبى العباس أحمد بن حمزة بن شهاب الدين الرملى (م۱۰۰۴) دار إحياء التراث العربى ۱۴۲۵- ۲۰۰۵ء
۱۰۴	الهداية لبرهان الدين أبى الحسن على بن ابى بكر المرغينانى (م۵۹۳) دار الفكر، بيروت
۱۰۵	الواضح فى فقه الإمام أحمد۔ د۔على أبو الخير۔ دار الخير۔ دمشق۔ ۱۴۱۶-۱۹۹۶م

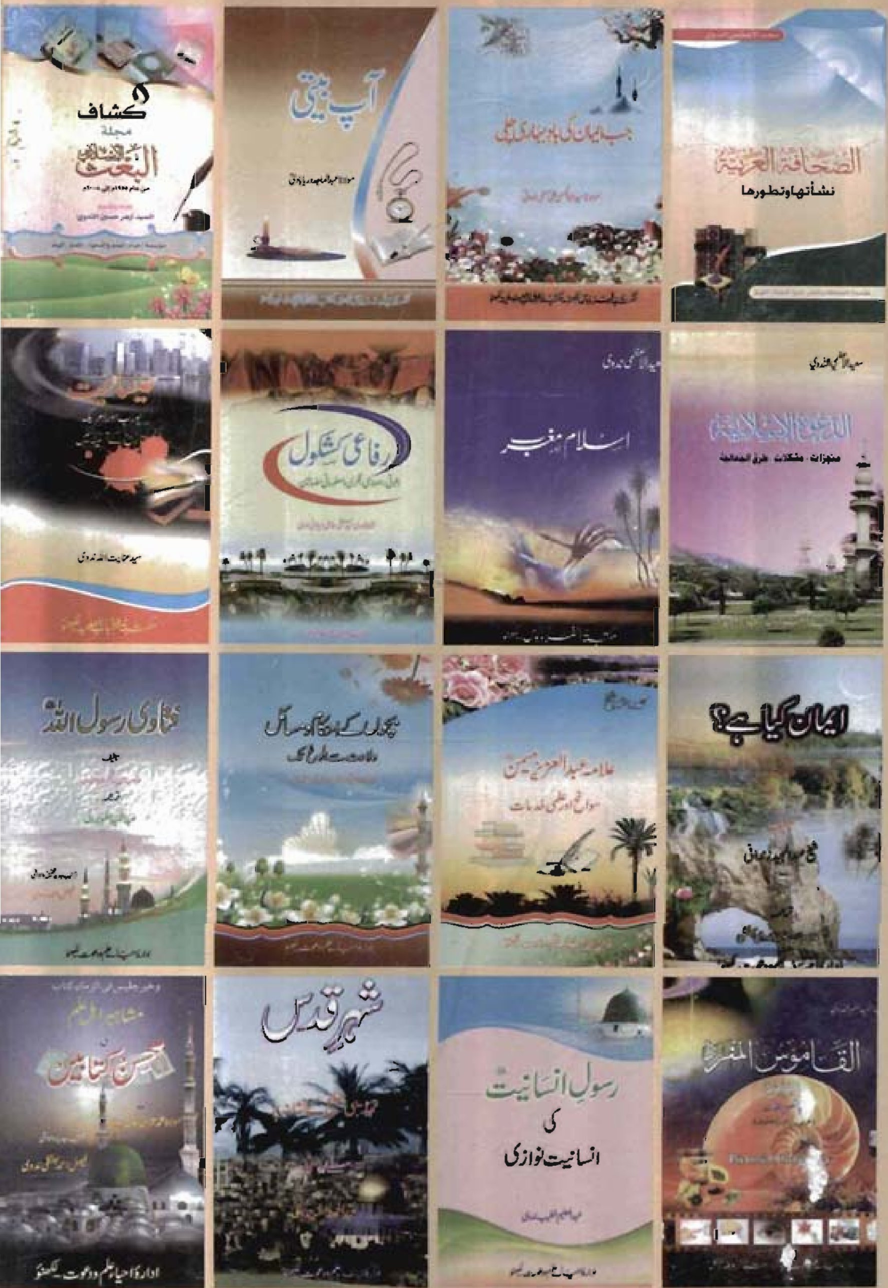
متفرقات

۱۰۶	الاستيعاب فى معرفة الأصحاب، لابن عبدالبر (م۴۶۳) تحقيق:الشيخ على محمد المعوض، والشيخ عادل احمد عبدالموجود، دار الكتب العلمية۔ الطبعة الثانية:۱۴۲۲-۲۰۰۲ء
۱۰۷	اسلام اور ضبطِ ولادت، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی، اپریل۲۰۰۲ء

۱۰۸	الأعـلام للزركلی،خیر الدین الزرکلی، دار العلم الملایین، بیروت۔ الطبعة السادسة عشر ۲۰۰۵ء۔
۱۰۹	الإصـابة فـی تـمییـز الصحابة، لابن حجر العسقلانی (م۸۵۲) دار الفکر بیروت۔ الطبعة الأولی:۱٤۲۱-۲۰۰۱م
۱۱۰	اصلاح الرسوم، حکیم الأمت مولانا اشرف علی تھانوی۔تاج پبلشرز، دہلی۔۱۹۹۰ء
۱۱۱	بچے کی صحت۔ازڈاکٹرمس سیتہ گیتا۔دہلی
۱۱۲	تـاج الـعـروس من جواهر القاموس، لمرتضی الزبیدی۔ محمد بن محمد الحسینی (م۱۲۰۵)۔ تحقیق:علی شیری۔ دار الفکر، بیروت۔
۱۱۳	تاریخ بغداد لاحمد بن علی الخطیب البغدادی۔ دار الکتب العلمیة۔ بیروت
۱۱۴	تـاریـخ دمشـق الـکبیـر۔ ابـو الـقـاسـم عـلی بن الحمـش، ابن عساکر۔ تحقیق:ابو عبدالله علی عاشور الجنوبی، دار احیاء التراث العربی۔ الطبعة الاولی: ۱٤۲۱ھ-۲۰۰۱ء۔
۱۱۵	التاریخ الکبیر للبخاری۔ دار الکتب العلمیة، بیروت۔ ۱۹۸٦ء۔
۱۱۶	التـاریـخ الـکبیر(تاریخ ابن أبی خیثمة) لابن أبی خیثمة أحمد بن زهیر بن حـرب۔ (م۲۷۹) تـحـقـیـق: أبـی عبـدالرحمن عادل بن سعد، وأبی أنس أیـمـن بـن شـعـبـان۔ غـراس لـلـنشـر والـتـوزیـع، الکویت۔ الطبعة الأولی ۱٤۲٥-۲۰۰٤م
۱۱۷	التبیـان فـی أقسـام الـقـرآن، لابـن الـقیم۔ تعلیق محمد حامد الفقی۔ دار المعرفة، بیروت۔
۱۱۸	تسمیة المولود، لبکر بن عبدالله ابو زید، (الیکٹرانک ایڈیشن)

۱۱۹	الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع، للخطيب البغدادی۔ أبو عبدالرحمن صلاخ بن محمد بن عويضة۔'دار الكتب العلمية۔ ١٤٢٤-٢٠٠٣م
۱۲۰	حجة الله البالغة، الشاه ولی الله الدهلوی، تحقيق:محمد شريف سكر۔ دار إحياء العلوم، بيروت۔ الطبعة الأولى ١٤١٠-١٩٩٠م
۱۲۱	حلية الأولياء وطبقات الأصفياء۔ أبو نعيم احمد بن عبدالله الاصبهانی۔ دار الكتاب العربی۔ بيروت۔ الطبعة الثالثة۔ ١٤٠٠ه-١٩٨٠م۔
۱۲۲	ختان الذكور والإناث، د۔سامی عوض الذيب، اليكٹرانک ايڈيشن
۱۲۳	الرسالة المفصلة لأحوال المتعلمين وأحكام المعلمين والمتعلمين، لأبی الحسن علی القابسی (م٤٠٣)، تحقيق:أحمد خالد۔ الشركة التونسية للتوزيع، تونس۔ الطبعة الأولى:١٩٨٦م
۱۲۴	الروض الأنف۔ للسهيلی، أبو القاسم عبدالرحمن بن عبدالله (م٥٨١) تحقيق:مجدی بن منصور۔ الطبعة الأولى ۔دار الكتب العلمية، بيروت
۱۲۵	زاد المعاد۔ لابن القيم۔ تحقيق: شعيب الأرنؤوط، وعبدالقادر الأرنؤوط۔مؤسسة الرسالة بيروت۔ الطبعة الثالثة ١٤٠٢-١٩٨٢م
۱۲۶	ماہنامہ ساحل کراچی، جون ۲۰۰۵ء
۱۲۷	سنتِ نبوی اور جدید سائنس، تحقیق وتصنیف:حکیم محمد طارق محمود چغتائی، اعجاز پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔۱۹۹۸ء
۱۲۸	سير أعلام النبلاء۔ للإمام شمس الدين الذهبی (م٧٤٨) مؤسسة الرسالة، بيروت۔ ١٤١٠-١٩٩٠م

۱۲۹	سيرة ابن هشام۔ عبدالملك بن هشام (م٢١٨) تحقيق:جمال ثابت وآخرون۔دار الحديث القاهرة۔ ١٤٢٤-٢٠٠٤م
۱۳۰	صدق جدید لکھنؤ، مورخہ ۱۸/نومبر ۱۹۶۰ء۔
۱۳۱	طبقات ابن سعد، محمد بن سعد (م٢٣٠) تحقيق:د۔ على محمد عمر۔ مكتبة الخانجي۔ القاهرة۔ الطبعة الأولى:١٤٢١۔
۱۳۲	علم الأجنة فى ضوء الكتاب والسنة۔ الشيخ عبدالمجيد الزندانى وآخرون۔
۱۳۳	الكامل، ابو عبدالله بن عدى الجرجانى۔ دار الفكر۔ الطبعة الثالثه۔ ١٤٠٩ھ - ١٩٨٨ء۔
۱۳۴	مجلة الأمة (القطرية) جلد:٥۔ شماره:٥٠۔ صفر ١٤٠٥۔
۱۳۵	معجم البلدان، ياقوت الحموى(م٦٢٦)، دار إحياء التراث العربى، بيروت
۱۳۶	معجم المناهى اللفظية، بكر بن عبدالله ابوزيد۔ دار العاصمة۔ الطبعة الثالثة ١٤١٧-١٩٩٦۔ الرياض
۱۳۷	المحدث الفاصل بين الراوى والواعى، الحسن بن عبدالرحمن الرامهرمزى۔ د۔محمد عجاج الخطيب۔ دار الفكر بيروت۔ الطبعة الثالثة: ١٤٠٤
۱۳۸	مدارج السالكين لابن القيم۔ دار الكتب العلمية۔ الطبعة الأولى:١٤٠٣-١٩٨٣م
۱۳۹	طب نبوی اور جدید سائنس۔ ڈاکٹر خالد غزنوی، الفیصل ناشران و تاجران کتب۔لاہور۔انیسواں ایڈیشن ۲۰۰۳ء


كشاف
مجلة البعث الإسلامي
آپ بیتی
جب ایمان کی باد بہاری چلی
الصحافة العربية
نشأتها وتطورها
رفاعی کشکول
اسلام اور مغرب
الدعوة الإسلامية
منجزات، مشكلات، طرق المعالجة
فتاوی رسول اللہ
علامہ عبدالعزیز میمن
ایمان کیا ہے؟
محسن کتابیں
ادارۂ احیاء علم و دعوت، لکھنؤ
شہر قدس
رسولِ انسانیت
کی
انسانیت نوازی